''چہارسُو''

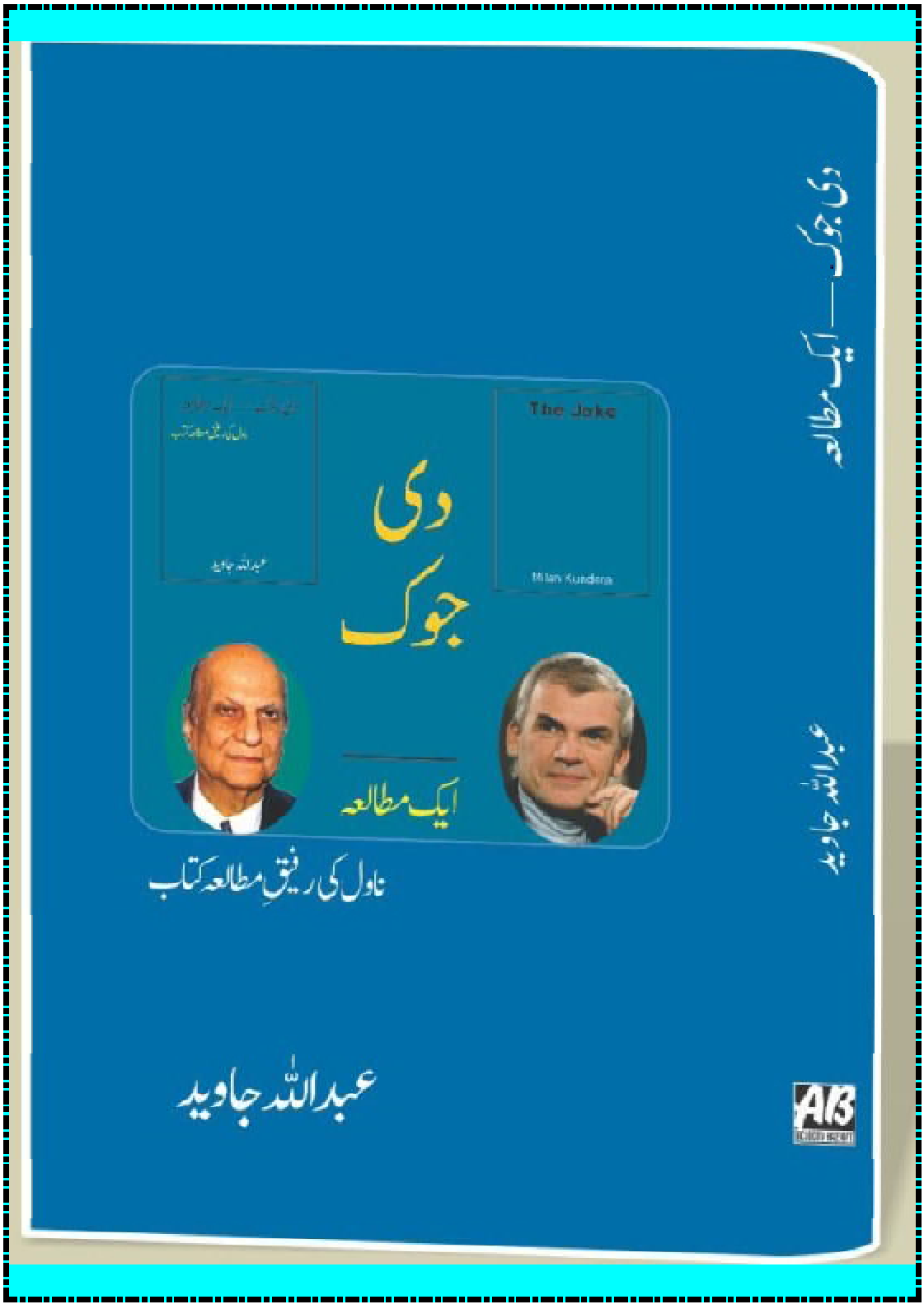
دی جوک — ایک مطالعہ
The Joke
Milan Kundera
دی جوک
ایک مطالعہ
ناول کی رفیقِ مطالعہ کتاب
عبداللہ جاوید
عبداللہ جاوید
AB

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۹،شمارہ:نومبر،دسمبر ۲۰۲۰ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1' گلی نمبر18،ویسٹریج-III' راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ــــــــ شعیب حیدر زیدی
تزئین ــــــــــــــــ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ــــــــــــــــ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

مرے ہمزاد ــــــــ محمد انعام الحق ۶
حشر ساماں ــــــــ جمیل عثمان ۸
براہِ راست ــــــــ گلزار جاوید ۱۱
بشر کی اساس ــــــــ عطیہ سکندر علی ۲۱
افسانوں میں مقیّد ایک دن ــــــــ ابوالخیر کشفی ۲۳
طلوع ہوتی ہوئی مسکراہٹ ــــــــ انور سدید ۲۶
معجزاتِ مسلسل ــــــــ ابوالحسن نغمی ۲۷
پری خانے کا مسافر ــــــــ حسرت کاس گنجوی ۲۹
جمیل عثمان اور ان کی کہانیاں ــــــــ رفیع الدین راز ۳۱
روشنی کا درخت ــــــــ پروفیسر خالدہ ظہور ۳۳
اُجلی اُجلی کہانیاں ــــــــ نصرت انور ۳۴
جمیل عثمان کا تخلیقی بہاؤ ــــــــ کامران ندیم ۳۵
خوشی کے گیت ــــــــ فاری شا ۳۶
خالی ہاتھ ــــــــ جمیل عثمان ۳۹
چیئرمین ــــــــ جمیل عثمان ۴۱
زبان کی کھچڑی ــــــــ جمیل عثمان ۴۳

صدائے مرحبا

نسیم سحر، ڈاکٹر انیس الرحمان۔ ۴۵

افسانے

بَرشَور ــــــــ حمید شاہد ۴۶
جہانِ نَو کی نوید ــــــــ رینو بہل ۵۰
شوم کا مال ــــــــ آغا گل ۵۵
کیا زندہ رہو گے ــــــــ وحشی سعید ۵۸

دستِ کرم

طالب جوہری، احمد مشتاق، یونس شرر، منظر بھوپالی، حمیرا رحمٰن، پریمی رومانی، مشیر طالب، افق فریدی، ڈاکٹر قطب سرشار، اشرف جاوید، احمد سوز، ڈاکٹر ریاض احمد۔ ۶۰

افسانے

چت۔ چھت کے اوپر چھت ــــــــ غزالہ اعجاز قمر ۶۶
ناک پہ بیٹھی مکھی ــــــــ اشتیاق سعید ۶۸
قربانی آن لائن ــــــــ رومانہ رومی ۷۰
قربِ قیامت ــــــــ گلزار جاوید ۷۲

روحِ نشاط

واصف حسین واصف، شازیہ اکبر، تصور اقبال، شگفتہ نازلی، خلیق الزماں، جنید آزر، نوید سروش، سیفی سرونجی، رفیع الدین ذکی، رابعہ گیلانی، نیاز جیراجپوری، سبھاش گپتا، نزہت شاہ، آفتاب خان، وشال کھُلر۔ ۷۸

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب ــــــــ تابش خانزادہ ۸۳

ابرِ نوبہار

رہائی اپنے وقت پر شروع ہوگی ــــــــ ظفر قریشی ۸۸

سفرنامہ

برطانیہ سے جاپان ــــــــ یعقوب نظامی ۹۲

شرف کا تاج

عبداللہ جاوید، افتخار عارف، امجد اسلام امجد، پروین شیر، یوگیندر بہل تشنہ، ناصر علی سید، فیصل عظیم، جواز جعفری، العدروس، انجم جاوید، شیبا کوثر۔ ۹۸

نشانِ راہ

حسرت موہانی ــــــــ عبداللہ جاوید ۱۰۵

عہدِ آشوب

رہیے اب ایسی جگہ ــــــــ فرح کامران ۱۰۸

ایک صدی کا قصہ

ماسٹر غلام حیدر ــــــــ دیپک کنول ۱۱۱

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ــــــــ وجیہہ الوقار ۱۱۵

☆

دعائیں جتنی بھی مجھ کو ہیں ازبر، بھول جاتا ہوں
سلیقہ مانگنے کا اس سے اکثر بھول جاتا ہوں

قرطاسِ اعزاز

جمیل عثمان

کے نام

مرے ہمزاد
محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

جمیل عثمان

تعلیم:

ایم اے (انگریزی ادب)–کراچی یونیورسٹی۔۱۹۸۱ء
ایل ایل بی–سندھ مسلم لاء کالج، کراچی۔۱۹۷۸ء
بی اے–سینٹ پیٹرکس گوورمنٹ کالج، کراچی۔۱۹۷۶ء

پیشہ ورانہ تجربہ:

ستمبر ۲۰۱۹ء تا حال–ٹیکنیکل رائٹر–ایم اینڈ جے انجینئرنگ–نیویارک
جون ۲۰۱۴ء سے جولائی ۲۰۱۹ء–ٹیکنیکل رائٹر–اٹین انجینئرنگ–نیویارک
دسمبر ۲۰۰۹ء سے جون ۲۰۱۲ء–پروگرام ایڈمنسٹریٹر–کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک
اپریل ۲۰۰۸ء سے اپریل ۲۰۰۹ء–ڈیپارٹمنٹ ایڈمنسٹریٹر–رٹگرز یونیورسٹی، نیوجرسی
اکتوبر ۲۰۰۰ء سے اپریل ۲۰۰۸ء پروگرام کوآرڈینیٹر–کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک

شائع شدہ کتاب:

۱۔ جلاوطن کہانیاں (سقوط ڈھاکہ پر مبنی کہانیاں) –سخن دوست، کراچی – ۱۹۹۷ء
۲۔ پری خانے کا مسافر (مشرق وسطیٰ میں پاکستانی تارکین وطن کے دلچسپ تذکرے)–سخن دوست، کراچی–۲۰۰۶ء
۳۔ بساط (ایک طویل سماجی اور معاشرتی ڈرامہ)–قلمکار پبلی کیشنز، کراچی–۲۰۱۰ء
۴۔ روشنی کے درخت (امریکی پس منظر میں افسانے) – میڈیا گرافکس، کراچی – ۲۰۱۷ء
۵۔ مرے لفظ میرے نشید ہیں (شاعری کا مجموعہ)–میڈیا گرافکس، کراچی–۲۰۱۹ء
۶۔ بوجھو تو جانیں (بچوں کی تصویری کتاب جس میں کارٹونوں اور اشعار کی مدد سے محاورے سکھائے گئے ہیں)–فیروز سنز، لاہور–۲۰۲۰ء

اشاعت کی منتظر کتابیں:

۱۔ وہ لوگ اب کہاں ہیں؟ (بچوں کی تصویری کتاب جس میں پرانے پیشہ ور محنت کشوں کے بارے میں بتایا گیا ہے)–زیر اشاعت–ناشر: فیروز سنز، لاہور
۲۔ سائنس دان کا اغوا (بچوں کے لئے سائنس فکشن اردو ناول)
۳۔ دی کلاؤڈ (The Cloud) – سائنس دان کا اغوا پر مبنی بچوں کے لئے انگریزی ناول – زیر اشاعت – ناشر: ڈورینس پبلشنگ کمپنی، پٹس برگ، پنسلوینیا–امریکہ
۴۔ اردو افسانوں کا مجموعہ
۵۔ کیفے گھٹال (امریکہ میں ہندو پاکستانی تارکین وطن کے بارے میں مزاحیہ خاکے) –زیر اشاعت–ناشر: میڈیا گرافکس، کراچی
۶۔ نیویارک اور نیوجرسی کے پاکستانی اخباروں میں شائع شدہ کالموں کا مجموعہ

جرائد جن میں مضامین، افسانے اور کہانیاں شائع ہوئیں:

آئندہ–کراچی، اخبار جہاں–کراچی، ادب ساز–نئی دہلی، اردو ڈائجسٹ–لاہور، اردو میگزین–جدہ–سعودی عرب، جنگ میگزین–کراچی، چلمن–لاہور، درون–نئی دہلی، رابطہ–کراچی، سب رس–حیدرآباد، دکن، سیارہ ڈائجسٹ–لاہور، سیپ–کراچی، شگفتہ–حیدرآباد، دکن، شمع–نئی دہلی، قومی ڈائجسٹ–لاہور، ماہ نو–لاہور، ہمدرد نونہال–کراچی، ہونہار (بچوں کا رسالہ)–کراچی

اخبارات جن میں کالم، مضامین اور دوسری تخلیقات شائع ہوئیں:

اردو نیوز–جدہ، اردو نیوز–نیویارک، اردو ٹائمز–نیویارک، ایشیا ٹریبیون–نیو جرسی، جسارت–کراچی، ڈیلی نیوز–کراچی (شام کا اخبار)، عرب نیوز–جدہ، لیڈر–کراچی (شام کا اخبار)، مارننگ نیوز–کراچی، نوائے وقت–کراچی

اعزازات:

۱۔ اسلام کا سفیر اور امن کا پیغامبر ایوارڈ: اسلامک لیڈرشپ، جسٹس اینڈ پیس کانفرنس–ڈبلن، آئرلینڈ–۲۹ ستمبر ۲۰۱۰
۲۔ ادبی خدمات پر سپاس نامہ – بزم فانوس، مس سس ساگا – کینیڈا – ۱۱ جنوری ۲۰۱۴ء
۳۔ ممتاز کالم نگار ایوارڈ – ایشیا ٹریبیون اخبار – پسکیٹ اوے، نیو جرسی – ۲۳ مارچ ۲۰۱۴ء
۴۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامہ – کامران ندیم فاؤنڈیشن – ایڈیسن، نیوجرسی–۱۷ ستمبر ۲۰۱۶ء
۵۔ اعزازی میڈل–انجمن ادب اردو (سوسائٹی آف اردو لٹریچر–SOUL) –سپرنگ فیلڈ، ورجینیا–۲۹ جولائی ۲۰۱۸ء
۶۔ ادبی خدمات کے صلے میں سرٹیفکیٹ–گہوارۂ ادب، پرنسٹن، نیوجرسی–۲۶ اکتوبر ۲۰۱۹ء
۷۔ اردو کی خدمت کے اعتراف میں سپاس نامہ–کاروان فکروفن–نیویارک–۸ فروری ۲۰۲۰ء

مقامی اور بین الاقوامی کانفرنسز، میٹنگز اجلاس اور مشاعرے میں پڑھے گئے مضامین اور شاعری:

۱۔ مقالے کا عنوان: Neutrality of the Media: Current Perspective and Status
زیر انتظام: فرانسیسی ادارہ اسلام اینڈ دی ویسٹ–مقام: برسلز، بلجیم–تاریخ: ۱۲ نومبر ۲۰۰۹ء

۲۔ مقالے کا عنوان: in Dialogue and Civilization of Bridges NewsChannelVillageGlobalofCreation:Mediathe
زیرانتظام: انٹرنیشنل اسلامک لیڈرشپ، جسٹس اینڈ پیس کانفرنس- مقام: ڈبلن، آئرلینڈ-تاریخ:۲۹۔ستمبر۲۰۱۰ء

۳۔ کہانی کا عنوان: "کلیئرنس" (میری کتاب "جلاوطن کہانیاں کی ایک کہانی)،تقریب: میرے اعزاز میں پروگرام بہ عنوان "ساعت جمیل"
زیرانتظام: انجمن ادب اردو، واشنگٹن ڈی سی-، مقام: برک (Burke)، ورجینیا-تاریخ:۲۲۔جون۲۰۱۱ء

۴۔ گفتگو کا عنوان: "اردو کی نئی بستیاں" زیرانتظام: انجمن ادب اردو، واشنگٹن ڈی سی-مقام: برک (Burke)، ورجینیا-تاریخ:۲۵، مارچ ۲۰۱۲ء

۵۔ مضمون کا عنوان: "سنسنی سے بھرپور سفرنامہ"
زیرانتظام: انجمن ادب اردو، واشنگٹن ڈی سی- مقام: برک (Burke)، ورجینیا-تاریخ:۲۲۔دسمبر۲۰۱۲ء

۶۔ مہمان خصوصی بہ تقریب رونماء "عجب نصیبی"-سید ثروت ضحیٰ کا اردو ناول
مقام: شکاگو، الینائے-تاریخ:۲۶۔جنوری۲۰۱۳ء

۷۔ میری کتاب "جلاوطن کہانیاں" کی تقریب پذیرائی اور مشاعرہ
زیرانتظام: انڈیانا بزم ادب- مقام: فشرز، انڈیانا-تاریخ:۲۔نومبر۲۰۱۳ء

۸۔ ڈاکٹر کلیم عاجز کے ساتھ ایک شام اور مشاعرہ میں بہ طور مہمان شاعر-
زیرانتظام: بزم سخن، واشنگٹن، ڈی سی-مقام: آرلنگٹن، ورجینیا-تاریخ: ۲۸۔دسمبر۲۰۱۴ء

۹۔ مقالے کا عنوان: "رفیع الدین راز، اردو میں اولیت کا نقیب"-تقریب: رفیع الدین راز کے ساتھ ایک شام
زیرانتظام: بزم علم وادب، مقام: مس سس ساگا، کینیڈا-تاریخ:۱۲۔مارچ۲۰۱۶ء

۱۰۔ مشاعرہ (مہمان شاعر) زیرانتظام: علمی وادبی تنظیم "اظہار"-مقام: مس سس ساگا، کینیڈا-تاریخ:۱۳۔مارچ۲۰۱۶ء

۱۱۔ مقالے کا عنوان: "کراچی کا مقدمہ"-ایک سماجی فورم پر بات چیت
زیر اہتمام: پاک امریکن ڈائلاگ فورم - مقام: نیو یارک - تاریخ: ۲۷۔مارچ۲۰۱۶ء

۱۲۔ صدر جلسہ، انجمن ادب اردو، واشنگٹن ڈی سی
مقام: سپرنگ فیلڈ، ورجینیا-تاریخ:۲۴۔ستمبر۲۰۱۷ء

۱۳۔ بچوں کے لیے میری کتاب "بوجھو تو جانیں" کی تقریب رونماء
زیر اہتمام: کاروان فکر وفن، مقام: نیو یارک-تاریخ:۸۔فروری ۲۰۲۰

۱۴۔ مہمان اعزازی، فرینڈز آف ہیومینیٹی، (FOH) چیریٹی مشاعرہ
زیر اہتمام: فرینڈز آف ہیومینیٹی، مقام: اینا ہائم، کیلی فورنیا - تاریخ: ۱۴۔فروری ۲۰۲۰ء

۱۵۔ میری شاعری کی کتاب "مرے لفظ میرے نشید ہیں" کی تقریب رونماء
زیر اہتمام: حلقۂ ارباب ذوق (رجسٹرڈ) نیو یارک، مقام: نیو یارک - تاریخ:۲۹۔فروری ۲۰۲۰ء

- بقیہ -

"روشنی کا درخت"

ایک سچے ادیب کو لکھنے کے لیے موضوعات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ داغستان کے مشہور شاعر امیر حمزہ طوف کو کسی نے لکھا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں مگر مجھے کوئی موضوع نہیں سوجھ رہا انہوں نے جواب دیا اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں آنکھیں عطا کردے دعا نہ کرو کہ وہ تمہیں موضوع بخش دے۔

اردوئے معلّٰی جسے عموماً کوثر وتسنیم میں دھلوایا جاتا تھا اب ڈرائی کلینگ پر گزارہ کررہی ہے خالص علمی وادبی اردو پس منظر میں جاتی نظر آرہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبانیں نئے جذبوں، نئی روایات اور نئے ماحول کے مطابق الفاظ ایجاد کرتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح زبانوں سے غیر ضروری الفاظ خارج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جمیل عثمان کے افسانوں کی زبان دورِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ آپ قاری کو کسی مشکل یا ابہام میں مبتلا نہیں کرتے اور نہ ہی تہہ داری وپیچیدگی سے کہانی کو گنجلک بناتے ہیں۔ قاری ان کے افسانے بڑی آسانی سے ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر سمجھ لیتا ہے۔ جمیل عثمان کے اسلوب میں جو سادگی، سچائی اور خلوص ہے وہی ان کی پہچان ہے۔

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں

- غیرمطبوعہ افسانہ -

حشر ساماں

جمیل عثمان

نیویارک کی کونٹز بولیوارڈ پر میں آہستہ آہستہ گاڑی چلا رہا تھا اور گردن گھما گھما کر دونوں طرف دیکھتا جا رہا تھا- میرے آگے پیچھے دور دور تک کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی- جولائی کا مہینہ تھا اور رات کے نو بج رہے تھے- مگر ہو کا عالم تھا- روشنیوں کے شہر میں روشنی تو تھی مگر پروانے نہیں تھے- کشادہ سڑکیں تو تھیں مگر دیوانے نہیں تھے- میکشوں سے بھرے ہوئے میخانے نہیں تھے- جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا وہ بازار نہیں تھے- دکانیں بند تھیں خریدار نہیں تھے- کچھ حسینائیں تھیں مگر طالب دیدار نہیں تھے-

شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہے- اور ایسی وبا جو نظر نہ آئے، جو ذرا سی بد احتیاطی سے لگ جائے- ایسا مرض جس میں مبتلا شخص اگر آپ کے آگے کھانسے یا چھینکے تو آپ پکڑے گئے- اگر اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہو جائے تو سمجھیے آپ گئے- اس لئے سارے شہر نے دستانے پہن لئے ہیں اور چہروں پر نقاب ڈال لئے ہیں- لوگوں نے ایک دوسرے سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے- نہ مصافحہ، نہ معانقہ، نہ مکالمہ نہ معاشقہ! سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقید ہیں- اب تو سودا سلف لینے بھی کوئی دکان نہیں جاتا- آن لائن آرڈر کر دیے جاتے ہیں اور چیزیں دروازے پر ڈیلیور ہو جاتی ہیں- بڑے بڑے مالز بند ہو رہے ہیں اور دکاندار اپنی قسمت کو رو رہے ہیں- سینما ہالز اور تھیٹرز اجڑ گئے ہیں اور ریستورانوں کے دروازوں پر تالے پڑ گئے ہیں-

میری گاڑی ایک compound gated میں داخل ہوئی - بڑا سا کمپاؤنڈ تھا جس میں کوئی چالیس پچاس کے قریب اک منزلہ عمارتیں تھیں- عمارتوں کے گرد کوئی دس فٹ اونچی فصیل تھی اور احاطے کے چاروں کونوں پر چار گیٹ تھے جہاں چیک پوائنٹس بنے ہوئے تھے- ہر چیک پوائنٹ پر ایک سیکورٹی گارڈ بیٹھا ہوتا تھا - میں نے گاڑی ایک چیک پوائنٹ پر روکی اور شیشہ گرایا- سیکورٹی گارڈ نے اپنی کھڑکی کھولی اور مجھ سے میرا نام پوچھا- میں نے نام بتایا-

" کس سے ملنا ہے؟"

"مسٹر شفیع نوری، ہاؤس نمبر 21- میں نے جواب دیا-

اس نے انٹرکام سے صاحب خانہ سے رابطہ کیا اور ان کی اجازت پا کر مجھے اندر جانے کے لئے کہا اور ساتھ ہی شاید کوئی سوئچ دبایا جس سے گیٹ پر لگا ہوا سرخ و سفید دھاریوں والا ڈنڈا اٹھ گیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی- کمپاؤنڈ بہت خوبصورت تھا- صاف و شفاف سڑکیں، ہر طرف گھنے درخت، سڑک کے دونوں طرف کیاریوں میں رنگ برنگے پھول موسم بہار کی صحیح تصویر پیش کر رہے تھے- یہاں کے گھر خوبصورت آرکیٹیکچر کا نمونہ اور رنگ و روغن سے آراستہ تھے- ہر عمارت بہت نفیس اور جاذب نظر تھی- کھڑکیاں اور دروازے تازہ کیے گیے رنگوں سے چمک رہے تھے- سڑکوں پر بجلی کے کھمبوں میں خوبصورت شیڈز کے نیچے فلوریسنٹ بلب اپنی دودھیا روشنی سے راستوں اور اردگرد کے ماحول کو منور کر رہے تھے- بجلی کے تار زیر زمین تھے اس لئے آسمان گنجلک تاروں کے جالوں سے آزاد تھا-

میں نے بلڈنگ 21 کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور اتر کر پچھلی سیٹ سے اپنا بریف کیس نکالنے لگا تو سڑک کی دوسری جانب سائیڈ واک پر چہل قدمی کرتا ہوا عمر رسیدہ جوڑا چلتے چلتے رک گیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا- میں اس وقت کوئی خلاباز لگ رہا تھا- سر سے پیر تک سفید رنگ کا اوورآل، چہرے پر ماسک اور اس پر فیس شیلڈ، ہاتھوں میں دستانے، یہاں تک کہ جوتوں کے اوپر بھی سفید پلاسٹک کے کوورز چڑھائے ہوئے تھے- میں نے ہاتھ ہلایا تو اس جوڑے نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا- میں اپنا بریف کیس اٹھائے دروازے تک آیا اور گھنٹی بجائی - اندر سے کچھ آوازیں آئیں- کوئی کھانس رہا تھا- پھر قدموں کی چاپ سنائی دی، جیسے کوئی پیر گھسیٹ کر چل رہا ہو- دروازہ کھلا تو سامنے ایک ضعیف و نحیف بزرگ کھڑے تھے- لمبا قد، دبلے پتلے، مدقوق چہرے پر لمبی نوکیلی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ، کنپٹیوں اور سر کے پچھلے حصے پر سفید بال جو بڑھ کر گردن تک آ رہے تھے- میلی سی سفید شلوار قمیص اور ربر کی چپل پہنے ہوئے تھے- وہ مجھے دیکھ کر جیسے چونک گئے اور شاید غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئے-

" گھبرائیے نہیں انکل،" میں نے نرمی سے کہا "میں ڈاکٹر سجاد احمد ہوں، ضیا کا دوست-"

"اوہ، اچھا، اچھا،" ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور پھنس پھنس کر نکل رہی تھی، " آیئے، آیئے- ضیاء نے فون کیا تھا کہ آپ آ رہے ہیں" - وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولے- میں اندر داخل ہو گیا تو انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور کچھ کہنے والے تھے کہ کھانسی آ گئی- شدید کھانسی! ایسا لگ رہا تھا ان کا کلیجہ کھنچ کر باہر آ جائے گا- انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے منہ پر رومال رکھا اور ایک جانب اشارہ کیا جہاں ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا-

" آپ بیٹھیے میں آتا ہوں" انہوں نے کھانسی کے درمیان کہا اور قریب ہی ایک دروازے میں داخل ہو گئے جو شاید واش روم تھا- اندر سے کھانسنے اور کھنکارنے کے آوازیں آ رہی تھیں- میں سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا- ابھی میں باہر سے آیا تھا جہاں ہر طرف رنگ اور خوشبو کی فراوانی تھی، جبکہ اندر ایک عجیب سی اداسی تھی- باہر کا ماحول خوشگوار تھا جب کہ اندر کا دلآزار- گھر میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی- کھڑکیوں کے پردے برابر تھے- پورے گھر میں مدھم سی روشنی تھی- بڑے صوفے پر ایک تکیہ اور میلا سا کمبل پڑا ہوا

تھا-ساتھ ہی ڈائننگ ٹیبل تھا جس پر شیشیوں اور بوتلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے - میز کے ایک سرے پر جھوٹے برتن پڑے تھے- ایک جگ میں پانی اور ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا-اس سرے پر جو کرسی تھی اس کی پشت پر ایک تولیہ لٹک رہا تھا -اندر کے کمرے سے کسی کے کراہنے کی آواز آرہی تھی-

وہ باہر آئے اور دور والی ایک کرسی پر بیٹھ گئے-

"مجھے ضیا نے بھیجا ہے کہ آپ کا اور بیگم صاحبہ کا ٹیسٹ کرلوں"-

"ضیا خود نہیں آئیں گے؟"

"انکل، مجھے معلوم نہیں-شاید مصروف ہوں"-

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ ماں باپ سے ملنے کا وقت نہیں ان کے پاس؟" وہ بھرائی آواز میں بولے-

"میں ان سے کہوں گا کہ آپ سے آ کر مل لیں"-

"ہاں بیٹا، ضرور کہنا- پوتے کو بھی دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے"-

"جی، ضرور"... میں نے کہا اور تھوڑے توقف کے بعد بولا "میں دراصل نیو یارک کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں اور کورونا کے مریضوں کو دیکھتا ہوں"-

"اچھا!" انہوں نے کہا اور پھر کھانسنے لگے- جب کھانسی رکی تو بولے" کیا ہمیں بھی کورونا ہوگیا ہے؟"

"یہ تو ٹیسٹ کے بعد ہی معلوم ہوگا"- میں نے کہا، حالانکہ ان کی حالت دیکھ کر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں-

میں نے تیلی جس کے سرے پر روئی کا پھاہا لگا ہوا تھا، ان کے نتھنے میں ڈالی، ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگے- میں نے تیلی نکالی اور میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر ان کو دیا- انہوں نے پانی پیا اور تیز تیز سانس لینے لگے- ہم تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے- جب ان کی سانسیں درست ہوئیں تو میں نے کہا کہ "آنٹی کا بھی ٹیسٹ کرنا ہے"-

"ہاں، آیئے"، وہ اٹھتے ہوئے بولے-

ہم بیڈروم میں گئے جہاں ضیا کی والدہ بستر پر پڑی تھیں-

"بیگم؟" شفیع صاحب نے آواز دی-

آہٹ سن کر انہوں نے گردن ہماری طرف گھمائی -پلکیں جھپکائیں اور دیکھنے کی کوشش کی، مگر معلوم ہو رہا تھا وہ صاف نہیں دیکھ سکتی تھیں- ہاں اتنا دیکھ سکتی تھیں کہ دو آدمی ہیں-

"ضیا آیا ہے؟" ان کا کپکپاتا ہاتھ اوپر اٹھا-

"نہیں، ڈاکٹر صاحب ہیں- ہمارا ٹیسٹ کرنے آئے ہیں"-

"ضیا کیوں نہیں آیا؟" خاتون نے نحیف آواز میں پوچھا-

"مجھے نہیں معلوم"-

"کب آئے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم"- اس بار شفیع صاحب کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی-

میں نے ضیا کی والدہ کا بھی سیمپل لیا- ان کا گلا بھی بری طرح خراب تھا اور رہ رہ کر کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے- وہ اتنی دبلی تھیں کہ لگتا تھا بستر پر کوئی ہے ہی نہیں-

میں کمرے سے باہر آیا- شفیع صاحب میرے پیچھے پیچھے آئے- جتنی دیر میں بریف کیس میں چیزیں رکھتا رہا وہ بس یہی کہتے رہے کہ "ضیا سے کہنا ہم سے ملنے آئے، یا ہمیں بلالے"-

میں نے ان سے وعدہ کیا- اپنا بریف کیس سنبھالا اور باہر آ گیا- تازہ ہوا ملی تو میں نے ذرا دیر کے لئے چہرے سے شیلڈ اور ماسک ہٹایا اور گہری گہری سانسیں لیں- آس پاس کوئی نہیں تھا اس لئے کوئی خطرہ نہیں تھا- اندر کی گھٹن سے باہر آنے کے بعد ایک خوش گوار احساس ہو رہا تھا، مگر ضیاء کے والدین کی حالت سے تکلیف بھی ہو رہی تھی-

ٹیسٹ کے نتائج آئے تو میرا اندازہ درست نکلا- شفیع صاحب اور ان کی بیگم کو وائرس نے پکڑ لیا تھا اور بہت خطرناک حد تک پھیل چکا تھا- میں نے فوراً ضیاء کو فون کیا-

"تمہارے والدین وائرس میں مبتلا ہیں"-

"اوہ، یا اللہ خیر"-

"فوری طور پر انہیں ہسپتال میں داخل کراؤ"-

"بہت بہتر"-

"کل میری ER میں ڈیوٹی ہے- تم کل ہی انہیں داخل کرا دو تاکہ میں اپنے سامنے تمام کارروائیاں مکمل کروادوں-

دوسرے دن ضیاء اپنے والدین کو لے آیا- انہیں فوری طور پر ایمرجنسی میں داخل کر دیا گیا- میں نے ڈیوٹی پر موجود اسٹاف سے کہا کہ وہ ان دونوں کے داخلے کے لئے ضروری کاغذی کارروائیاں مکمل کریں اور پھر دوسرے مریضوں کو دیکھنے چلا گیا- گھنٹے بھر بعد واپس آیا تو تمام کام مکمل ہو چکے تھے- میں اس کی والدہ کے بیڈ کے پاس گیا اور انہیں چیک کیا- ضیاء بھی وہیں تھا- ان کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا- وہ بول نہیں سکتی تھیں لیکن ان کی ساری ممتا ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی- وہ ایک ٹک ضیاء کو دیکھے جا رہی تھیں- ان کے لب خاموش تھے مگر آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں- آنکھیں، جن میں حسرت تھی، محبت تھی، کرب تھا، التجا تھی- آنکھیں، جو چھلکی پڑ رہی تھیں اور ان کے کناروں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے-

"امّاں، اب آپ آرام سے رہیے، سجاد آپ کا بہت خیال رکھے گا" ضیاء نے میری طرف اشارہ کیا-"میں جلد ہی آؤں گا"-مگر وہ تو بس اسے دیکھے

جارہی تھیں اوران کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ضیاء پھر اپنے باپ کے بیڈ کے پاس آیا اوران سے بھی وہی باتیں کہیں، " آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں جلد ہی آؤں گا" وغیرہ وغیرہ۔ ان کے منہہ پر ابھی ہسپتال والا ماسک نہیں لگایا گیا تھا اور نارمل ماسک جو سب پہنتے ہیں لگا ہوا تھا۔ انہوں نے ملتجیانہ نظروں سے ضیاء کو دیکھا اور بولے:

" بیٹا، جب ہم ٹھیک ہو جائیں گے تو کیا تمھارے گھر آ کر رہ سکیں گے؟" میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔ یا اللہ یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے پوچھ رہا ہے کہ وہ اس کے گھر رہ سکتا ہے کہ نہیں۔

ضیاء کہہ رہا تھا " آپ ٹھیک تو ہو جایئے پہلے " ۔ اور وہ ہانپتے ہوئے، کھانسیوں کے درمیان کہہ رہے تھے:

" ہم ... بیسمنٹ میں رہ لیں گے بیٹا ... اوپر نہیں آئیں گے ... بیسمنٹ کا دروازہ بیک یارڈ میں کھلتا ہے نا ... منا جب کھیلنے آئے گا ... تو ہم ... دروازے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھ لیا کریں گے ... اس کے قریب نہیں جائیں گے، اسے پیار نہیں کریں گے " ۔

ضیاء صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ بس اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا اس کے والدین اگر ٹھیک ہوتے تب بھی اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ابھی تو وہ ایک خطرناک وبائی مرض میں مبتلا تھے۔

ضیاء پھر نہیں لوٹا۔ اس کے والدین کی حالت دن بہ دن بگڑتی گئی۔ دو دن کے بعد امّاں کو اور ایک ہفتے کے بعد ابا کو بھی وینٹیلیٹر پر ڈال دیا گیا۔ ان دونوں کو ہسپتال میں داخل ہوئے جب دو ہفتے ہو گئے تو میں نے ضیاء کو فون کیا اور کہا کہ وہ آ کر ان سے مل لے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔

دو دنوں کے لئے میری ڈیوٹی کسی دوسرے ہسپتال میں لگا دی گئی۔ وہاں سے واپس آ کر جب میں اپنے ہسپتال کام پر جا رہا تھا تو گاڑی سے ہی ضیاء کو فون کیا کہ وہ ہسپتال آ کر اپنے والدین سے مل لے۔

ہسپتال پہنچ کر میں دوسرے وارڈز میں مریضوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا اور اس وارڈ کی طرف جانے کا موقع ہی نہیں ملا جس میں شفیع صاحب اور ان کی بیگم تھے۔ سہ پہر تین بجے کے قریب میرے فون کی گھنٹی بجی۔ ضیاء نے کہا کہ وہ لابی میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ دس منٹ بعد میں اس کے پاس گیا اور اسے لے کر اس وارڈ کی طرف چلا جہاں اس کے والدین تھے۔ پہنچے تو دیکھا کہ دونوں بستروں پر دوسرے مریض ہیں۔ میں نے انچارج نرس سے پوچھا تو اس نے تحقیق کرنے کے بعد کہا:

"Theydiedyesterdaysixhoursapartfrom oneanother."

پھر اس نے سوال کیا، " کون تھے وہ لوگ؟"

" میرے دوست کے والدین " میں نے ضیاء کی طرف اشارہ کیا۔

" آئی ایم سوری، " اس نے ضیاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر ورثا فوری طور پر لاش نہ لے جائیں تو انہیں اجتماعی قبروں میں تدفین یا پھر نذر آتش کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے " ۔

ضیاء کانپنے لگا۔ اگر چہ اس سے پہلے میں کورونا وائرس سے بے شمار اموات دیکھ چکا تھا اور میرا دل سخت ہو چکا تھا، لیکن اس وقت میری حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ضیاء کا ہاتھ پکڑ کر مردہ خانے کی طرف بھاگا۔ وہاں کے انچارج کو دونوں کی تفصیلات بتائیں۔ وہ کمپیوٹر پر کچھ دیکھتا رہا اور پھر ہمیں اطلاع دی کہ گزشتہ کل آنے والی لاشوں کو آج صبح کنٹینرز میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب وہ روانہ ہونے والے ہوں گے۔

" آؤ، " میں نے ضیاء سے کہا اور ہسپتال کے پچھلے حصے کی طرف دوڑ لگائی۔ وہاں دور ریفریجریٹڈ کنٹینرز کھڑے تھے۔ میں نے وہاں کے انچارج سے کہا کہ میرے دوست کے والدین کی لاشیں یہاں لائی گئی ہیں، کیا ہمیں تدفین کے لئے مل سکتی ہیں۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔

" میرے ساتھ آؤ، " وہ ہمیں لے کر کنٹینرز کی طرف گیا۔ ان کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

" کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟ " اس نے دونوں کنٹینرز کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سفید بوریوں میں بند لاشیں اس طرح ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تھیں جیسے اناج کی بوریاں۔

ضیاء سر پکڑ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

’’نیورالنک‘‘

بغیر ایندھن کے چلنے والی گاڑی تیار کرنے والی کمپنی ٹیسلا کے مالک ایلون مسک نے لائیو پروگرام میں ایک چِپ دکھائی جس کو براہِ راست ایک سؤر کے دماغ میں پیوست کیا گیا تھا۔ مسک کا کہنا ہے کہ اس چِپ کو آسانی سے دماغ اور ریڑھ کی ہڈی میں پلانٹ کرنے سے بہت سے اہم مسائل حل ہو جائیں گے مثلاً اندھے پن، فالج، بہرے پن اور یادوں کو محفوظ کرنے کے مسائل پر قابو پایا جا سکے گا۔ مسک کے بقول نیورالنک ڈیوائس کو قابل عمل بنانے کے لیے نئی بھرتیاں کی جا رہی ہیں۔ اس وقت کمپنی کی ویب سائٹ پر ایک درجن سے زیادہ آسامیاں مشتہر کی گئی ہیں۔ تاہم یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ مذکورہ ڈیوائس کب تک صارفین کو دستیاب ہوگی البتہ یہ کہ اس ڈیوائس کی قیمت مارکیٹ میں دستیاب اچھے کوالٹی کے سمارٹ فون کی قیمت کے لگ بھگ ہونے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

براہِ راست

مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر تخلیق کار دس بیس برس کی ریاضت کے بعد پختہ شناخت بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر جن لوگوں کو بے گھری اور بے دری کا سامنا ہوتا ہے وہ تمام عمر ریاضت کے باوجود نام ونمود سے محروم رہا کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال جناب جمیل عثمان کے ساتھ رہی۔ پٹنہ، کلکتہ، کھلنا، کراچی، جدہ اور نیویارک کے درمیان جہدِ مسلسل میں گزارنے کے باوجود قرطاس وقلم سے ایک پل کے لیے بھی ناطہ نہیں ٹوٹا۔ یہی سبب ہے کہ غزل، نظم، افسانہ، فکاہیہ اور طفلی ادب میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے باوجود ثقہ اہلِ قلم میں اُس طرح جگہ نہ پا سکے جس طرح اُن کا استحقاق بنتا ہے۔ آج کی محفل سجانے کی یہی غرض وغایت ہے کہ جناب جمیل عثمان صاحب کی قلمی ریاضت کی روشنی میں اُن کے مقام و مرتبے کا صحیح صحیح تعین کیا جائے۔

.....گلزار جاوید

☆ خاندانی شجرہ نسب تحریری ہو یا سینہ گزٹ ہمارے اور قاری کے لیے ہر دو صورتوں میں اہمیت کا حامل ہے؟

☆☆ میرے جد امجد ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع چھپرہ میں رہتے تھے- وہ اپنے عالم شباب میں حصول روزگار کے سلسلے میں رنگون (برما) گئے تھے- ان دنوں رنگون جانا ایسا ہی تھا جیسے ستر اسی کی دھائی میں دوبئی یا سعودی عرب جانا۔ پیسے کما کر واپس آئے تو عطر اور خوشبو جات کی دکان کھول لی- کاروبار خوب چلا۔ ان کے کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ اولاد میں صرف ایک بیٹا تھا یعنی میرے دادا۔ وہ بھی عین عالم شباب میں چل بسے۔ لیکن جاتے جاتے اپنی نشانی چھوڑ گئے۔ میرے دادا کی وفات کے چھ مہینے بعد میرے ابا پیدا ہوئے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح میرے ابا کی پرورش بھی ان کے دادا نے کی۔ اکلوتے بیٹے کی اکلوتی نشانی۔ بہت لاڈ و پیار سے میرے ابا کی پرورش ہوئی۔ میری دادی ان دنوں بہت کم عمر تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کے گھر سے اب ان کا کوئی قانونی رشتہ نہیں رہ گیا تھا۔ مگر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنے سسرال میں ہی رہیں۔ میرے پردادا بہو کے اس فیصلے سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کے پورے خاندان کو اپنے گھر بلا لیا تا کہ ان کے پوتے کے ماموں، خالہ اور نانی وغیرہ اس کے پاس رہیں۔ ان کا اپنا تو کوئی تھا نہیں۔ وہ بھی اپنے ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ دولت کافی تھی اس لئے بہو کے پورے خاندان کی کفالت گراں نہیں گزری۔

☆ دادا کی دو منزلہ حویلی چھوڑ کر ہجرت کی روداد بھی بہت سے المیوں سے پردہ اُٹھا سکتی ہے؟

☆☆ میرے والد اس وقت ۱۸ سال کے تھے جب ۱۹۳۶ء میں بہار میں مسلم کش فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ حویلی کو بلوائیوں نے نذر آتش کر دیا۔ سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ اس زمانے میں بینکوں میں پیسے رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ گھر میں ہی تجوریوں میں پیسے رکھے جاتے تھے۔ آگ جب لگی اور گھنٹوں جلتی رہی تو تجوریاں دہک اٹھیں۔ اندر رکھے ہوئے نوٹ راکھ ہو گئے۔ گھر والوں نے شہر کے ضلع اسکول میں پناہ لی۔ وہاں شہر کے اور بھی مسلمان خاندان پناہ گزیں تھے۔ جلے ہوئے گھر سے جو کچھ ہاتھ آ سکتا تھا اکٹھا کیا۔ ان چیزوں میں چند ہزار روپے بھی تھے جو جلنے سے بچ گئے تھے۔ بچا کھچا سامان لے کر یہ خاندان عازم کلکتہ ہوا اور میرے نانا کے گھر قیام کیا۔ دونوں خاندانوں میں دور کی رشتہ داری یوں تھی کہ میرے ابا کی خالہ میری امی کے ماموں سے بیاہی ہوئی تھیں۔ اس وقت میری امی کی عمر ۱۳/۱۴ سال ہو گی۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں اور اپنے والد یعنی میرے نانا کی بہت لاڈلی۔ ابا اور پردادا میری پردادی اور دادی کو کلکتہ چھوڑ کر واپس چھپرہ گئے اور کاروبار کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی۔ ادھر کلکتے میں میری پردادی کو اپنے پوتے یعنی میرے ابا کے لئے اس گھر کی دبلی پتلی گوری چٹی لڑکی پسند آ گئی۔ انہوں نے اپنے میاں کو لکھا کہ پوتے کو لے کر آ جاؤ اور منگنی کے لئے جوڑا اور انگوٹھی لیتے آؤ۔ ادھر وہ دونوں کلکتے کے لئے روانہ ہوئے ادھر پردادی پر دل کا دورہ پڑا اور وہ آناً فاناً ختم ہو گئیں۔ جب دادا پوتا کلکتے پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک دن پہلے بڑی بی کو دفنایا بھی جا چکا ہے۔ اسی مغموم فضا میں منگنی کی رسم ادا ہوئی۔ پردادا، دادی اور ابا چھپرہ واپس آ گئے۔ ایک سال بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی مگر اس سال برصغیر کی تقسیم کے ہنگاموں کی وجہ سے شادی نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۷ میں ہزاروں مسلمان خاندان پاکستان ہجرت کر گئے لیکن ہمارا خاندان پاکستان نہیں گیا۔ ۱۹۳۹ء میں میرے والدین رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے اور امی اپنے سسرال چھپرہ آ گئیں۔

☆ مغربی پاکستان کے بجائے مشرقی پاکستان بالخصوص کھلنا کا انتخاب کس خاص وجہ سے ہوا؟

☆☆ مغربی پاکستان کے بجائے مشرقی پاکستان اور خاص کر کھلنا کا انتخاب اس وجہ سے کیا گیا کہ بہار کی سرحدیں مشرقی پاکستان سے ملتی تھیں۔ کھلنا کلکتے سے ۷۵ میل دور اور ریل سے صرف چار گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ میرے چاروں ماموں ایک ایک کر کے کھلنا چلے گئے اور برسر روزگار بھی ہو گئے۔ امی کھلنا اپنے میکے گئیں جہاں ۱۹۵۳ء میں میں پیدا ہوا۔ وہ ایک سال وہاں رہیں پھر چھپرہ آ گئیں۔ چھپرہ میں حالات ٹھیک نہیں تھے۔ کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ میرے پردادا

ضعیف ہوگئے تھے اور کاروبار سنبھالنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ابا کو کاروبار سے دلچسپی نہیں تھی۔ ۱۹۵۵ء میں میرا بھائی پیدا ہوا تو امی اور فکر مند ہوگئیں۔ ان کے سامنے ہم دونوں بھائیوں کا مستقبل تھا اور چھپرہ میں امی کو کوئی مستقبل نظر نہیں آرہا تھا۔ کھلنا میں انہوں نے اپنے بھائیوں کو دیکھا تھا جو اچھی نوکریوں سے لگ گئے تھے۔ نئے ملک کی تعمیر ہورہی تھی اور روزگار کے بے شمار مواقع تھے۔ انہوں نے ابا سے کہا "میرے چاروں بھائیوں میں سے کوئی بھی بی اے پاس نہیں ہے۔ سب میٹرک یا انٹرمیڈیٹ تک پڑھے ہوئے ہیں پھر بھی انہیں اچھی نوکریاں مل گئی ہیں۔ آپ تو بی اے پاس ہیں۔ آپ کو بہت اچھی نوکری مل جائے گی"۔ لیکن ابا اپنے حلقۂ یاراں کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جب نوبت فاقوں تک پہنچ گئی اور کھلنا سے میری نانی اور ماموؤں کا اصرار بڑھ گیا تو ابا راضی ہوگئے۔ یوں ہم ۱۹۵۸ء میں کھلنا آگئے۔

☆ کھلنا کے شب و روز، وہاں کی بود و باش اور اہلِ کھلنا کے سبھاؤ کی بابت آپ کے احساسات میں شرکت فطری بات ہے؟

☆☆ کھلنا، ڈھاکہ اور چاٹگام کے بعد مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ چاٹگام کے بعد دوسری بندرگاہ۔ کھلنا ایک دریائی بندرگاہ ہے، سمندری نہیں۔ سمندری بندرگاہ اس کی جڑواں بہن چالنا ہے جو کھلنا سے تقریباً ۲۵ میل کی دوری پر خلیج بنگال کے کنارے واقع ہے۔ ملک سے باہر جانے والا مال کھلنا میں بارجز (barges) پر لوڈ کا جاتا ہے جہاں سے ایک boat tug اسے کھینچتا ہوا چالنا لے جاتا ہے اور پھر وہاں کھڑے ہوئے سمندری جہاز میں مال لوڈ کیا جاتا ہے۔ کھلنا سے چالنا کے درمیان دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس لئے سڑکوں اور ریلوے کا فقدان ہے۔ لیکن سنا ہے کہ اب کھلنا سے چالنا تک ریلوے لائن بچھائی جارہی ہے اور دریاؤں پر پل بھی بنائے جارہے ہیں۔ کھلنا کے جنوب میں دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا (Delta) ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دریائے گنگا سمندر میں گرتا ہے اور گرنے سے پہلے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہیں سندر بن جنگل ہے جسے دنیا کا سب سے بڑا مینگرو و جنگل (mangrove Jungle) کہا جاتا ہے۔ اور اسی جنگل میں مشہور زمانہ رائیل بنگال ٹائیگر رہتا ہے۔ کھلنا کو سندر بن کا گیٹ وے کہا جاتا ہے۔ سندر بن جنگل جانے کے لئے کھلنا جانا پڑتا ہے اور وہاں سے بہ ذریعہ اسٹیمر جنوب کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کھلنا نے بہت ترقی کی۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں نے چالنا کی بندرگاہ اور ریلوے سسٹم کو ترقی دی۔ کھلنا ایک business hub بن گیا۔ دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں نے اپنے دفاتر یہاں کھولے۔ خاص طور سے شپنگ کمپنیاں بہت تھیں۔ ایوب خان کے دور میں صنعتی ترقی بھی کافی ہوئی۔ کھلنا سے جیسور تک کئی میل کے علاقے میں دریا کے کنارے کنارے جوٹ ملوں (Jute Mills) کی قطار لگ گئی (مثلاً پیپلز جوٹ ملز، کریسنٹ جوٹ ملز، پلاٹینم جوٹ ملز، کارپیٹنگ جوٹ ملز وغیرہ)۔ کھلنا نیوز پرنٹ ملز کا قیام بھی عمل میں آیا جو بنگلہ دیش بننے سے پہلے پورے پاکستان کو اخباری اور دوسرے استعمال کے لئے کاغذ سپلائی کرتا تھا۔ اس زمانے میں پورے پاکستان میں صرف دو شپ یارڈ تھے۔ ایک کراچی میں اور دوسرا کھلنا میں جہاں شپ بلڈنگ انڈسٹری تیزی سے ترقی کررہی تھی۔ ویسے تو پورا مشرقی پاکستان ہی سرسبز و شاداب تھا، مگر کھلنا کی بات ہی اور تھی۔ ہر طرف ہریالی، لہلہاتے کھیت، بہتے دریا، جھیل اور تالاب نظر آتے تھے۔ ناریل، تاڑ اور چھالیہ کے پام (palm) آسمانوں پر لکیریں بنائے رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ آم، جامن، پپیتا، املی، امرود، بیر اور نیم کے درخت ہر طرف نظر آتے تھے۔ لوگ بہت پیارے اور ملنسار۔ ہم اپنے بنگالی پڑوسی کو چچا کہتے تھے اور ان کے گھر ایسے جاتے تھے جیسے اپنے سگے رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں۔ کوئی تکلف نہیں تھا۔ میری عمر اس وقت دس سال تھی۔ پڑوسی کی جوان بیٹیاں ہمارے گھر آیا جایا کرتی تھیں۔ کوئی پردہ نہیں تھا۔ امی کو وہ آپا کہتی تھیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں، ہم دونوں بھائی ان کے ہاں جاتے تو جو کچھ پکا ہوتا پیار سے کھلاتی تھیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد جب ہماری زندگیوں کو خطرہ لاحق ہوا تو ہمارے پڑوسی ہمارے آگے سینہ سپر ہوگئے اور اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ہماری حفاظت کی۔ بہت سے ایسے باکردار لوگوں کا ذکر میں نے اپنی کتاب "جلاوطن کہانیاں" میں کیا ہے۔

☆ والد محترم محمد عثمان صاحب کو غریب سے زیادہ عجیب کس بنا پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ والد صاحب عجیب اس لئے تھے کہ وہ بہت کچھ کرسکتے تھے لیکن انہوں نے نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابوالحسن نغمی صاحب نے اپنی کتاب "داستان جاری ہے" میں لکھا ہے کہ وہ جب ہجرت کرکے پاکستان آئے تو انہیں اچھی نوکری نہ ملنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا بی اے پاس نہ ہونا تھی۔ ۱۹۴۸ء۔۱۹۵۰ء میں بی اے پاس ہونا بڑی بات تھی۔ والد صاحب بی اے پاس تھے لیکن انہوں نے اچھی نوکری کے حصول کی طرف کبھی توجہ نہ دی۔ اگر کوئی نوکری مل بھی گئی تو اسے بہت جلدی گنوا دیا کیوں کہ وہ کسی کی "غلامی" کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بی اے کی ڈگری کے علاوہ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، چاہے وہ اردو ادب ہو، فلسفہ ہو، مذہب ہو یا سیاست۔ وہ شاعری بھی بہت اچھی کرتے تھے۔ اگر کہیں اپنا کلام سنا دیں تو لوگ گرویدہ ہوجاتے تھے۔ انہیں مشاعروں میں بلاتے تھے مگر وہ نہیں جاتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بہ حیثیت شاعر اپنا ایک بلند مقام بنا سکتے تھے۔

☆ ماموں نورالحق کی آمد اور دن پھرنے کی کہانی تفصیل سے بتلایئے؟

☆☆ نورالحق میرے سگے ماموں نہیں تھے۔ میری امی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ہمارے کھلنا آنے کے چند مہینوں بعد وہ بھی کلکتے سے ہجرت کرکے آگئے۔ وہ بھی ہمارے دیگر ماموؤں کی طرح انٹر تک پڑھے ہوئے تھے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے نیشنل اینڈ گرینڈلیز بینک میں نوکری حاصل کرلی۔ کنوارے تھے اس لئے رہنے اور کھانے پینے کا مسئلہ تھا۔ نانی اماں نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ وہ ہمارے ہاں paying guest کے طور پر رہیں۔ اس طرح ہماری مدد بھی ہو جائے گی۔ وہ بہ خوشی راضی ہوگئے۔ ہماری جھونپڑی سے متصل ایک جھونپڑی

خالی تھی جو انہیں کرائے پر مل گئی۔ اس طرح وہ ہمارے قریب رہنے لگے اور ان کا کھانا پینا ہمارے ساتھ ہونے لگا۔ انہیں ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کی بڑی فکر تھی۔ ہمیشہ ابا سے کہا کرتے تھے کہ ہم دونوں کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرائیں۔ میں دس سال کا ہو گیا تھا اور سکول نہیں جاتا تھا۔ اکثر وہ امی سے کہا کرتے تھے کہ دونوں بچوں کا اسکول جانا بہت ضروری ہے۔ انہی دنوں ابا کو کھلنا کے ایک بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے کا کام مل گیا۔ جب ابا نے گھر آ کر خبر سنائی تو حق ماموں ہمارے گھر ہی موجود تھے۔ لپک کر انہوں نے ابا سے ہاتھ ملا کر مبارکباد دی اور کہا کہ "پہلا کام یہ کیجئے کہ بچوں کو اسکول میں داخل کرائیے"۔ انہوں نے شہر کا بہترین مونٹیسوری سکول ڈھونڈ نکالا اور ابا کے ساتھ ہمیں لے کر خود ہمارا داخلہ کرانے گئے۔ میرا داخلہ تیسری جماعت میں ہوا۔ جب میں پانچویں میں پہنچا تو حالات پھر خراب ہو گئے۔ ابا کا ٹیوشن چھوٹ گیا۔ سکول کی فیس نہ دی جا سکی اور سکول سے نام کٹنے کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔ اس وقت حق ماموں پھر کام آئے۔ خوش قسمت سے انہی دنوں اس مونٹیسوری سکول کو لائنز کلب آف کھلنا نے لے لیا۔ اس کا نام لائنز انگلش سکول رکھ دیا گیا اور اسے ہائی سکول بنا دیا گیا۔ حق ماموں نے ابا کو مشورہ دیا کہ وہ میرے فیس کی معافی کی درخواست دے دیں۔ درخواست دی گئی اور جب ابا کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو حق ماموں ابا کے ساتھ گئے۔ میری کارکردگی کا جائزہ لیا گیا۔ تیسری جماعت سے پانچویں تک مسلسل تین سالوں تک اپنی جماعت میں اول آنے کا ریکارڈ۔ اساتذہ سے برتاؤ اور بہ حیثیت مجموعی بہترین کردار کا مالک پایا گیا۔ ہر استاد میری تعریف میں رطب اللسان تھا۔ چنانچہ فیس معاف ہو گئی اور اس طرح میں نے شہر کے بہترین سکول میں مفت تعلیم حاصل کی۔

☆ ہر مضمون میں اوّل آنے کی وجہ آپ کا ذہین ہونا تھا یا کوئی غیبی مدد و تعاون بھی شامل حال رہی؟

☆☆ اگر کوئی غیبی تعاون حاصل ہوتا تو میرا اوّل آنے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ مگر چھٹی جماعت میں ایک بہت ذہین لڑکا ڈھاکے سے آ گیا اور میرا تین سال کا ریکارڈ توڑ دیا۔ پھر ساتویں میں میں نے اسے چت کر دیا۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی وہ اور کبھی میں۔ دراصل غیبی طاقتیں میرے خلاف کام کر رہی تھیں میرے حق میں نہیں۔ نویں جماعت میں ایک لڑکا داخل ہوا۔ وہ لائنز کلب آف کھلنا کے صدر کا بیٹا تھا اور لائنز کلب سکول چلاتا تھا۔ بے شک لڑکا ذہین تھا مگر غیبی تعاون اسے حاصل رہا۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ اول آیا۔ مجھ سے صرف ایک نمبر زیادہ لے کر۔ دوسرے معاملات میں بھی اسے مجھ پر فوقیت حاصل رہی۔ صرف ایک مثال۔ ہم دسویں جماعت میں تھے جب حکومت کی طرف سے انٹر کالج/سکول انگریزی تقریری مقابلے کا اعلان ہوا۔ صدر صاحب کا بیٹا اور میں مقابلے میں حصہ لے رہے تھے۔ سکول کے پرنسپل نے اس کی تربیت کی ساری ذمہ داری خود لی۔ اسے تقریر لکھ کر دی، اپنے کمرے میں بلاتے، ریہرسل کرواتے اور ہر طرح سے اس کی مدد کرتے۔ جبکہ مجھ غریب کو ہمارے جغرافیہ کے استاد ٹریننگ دیتے۔ مقابلہ ہوا اور نتیجہ نکلا تو مجھے اول انعام ملا۔ میں نے نہ صرف اپنے سکول کے بلکہ دوسرے سکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کو مات دے دی تھی۔

☆ آپ کے اندر صوفی صاحب کب، کہاں اور کس طور گھر کر گئے بات اگر سنجیدہ ہے تو تفصیل اور جواز لازم ہے؟

☆☆ مجھے خود نہیں معلوم۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا تھا۔ ابا بتاتے تھے کہ اقبال کی ''ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن'' دو مرتبہ میرے سامنے پڑھی گئی۔ تیسری بار میں نے پوری نظم زبانی سنا دی۔ سات آٹھ سال کی عمر سے ہی پانچوں وقت کی نماز مسجد میں با جماعت ادا کرتا تھا۔ روزے اس وقت سے رکھنا شروع کر دیا تھا جب مجھ پر فرض نہیں ہوئے تھے۔ تراویح کا بہت اہتمام کرتا تھا۔ بچپن سے ہی طبیعت میں اتنی متانت تھی کی مجھے خود تعجب ہوتا تھا۔ کھیل کود سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ بس کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ بات بہت سنجیدہ نہیں ہے۔ جواز شاید یہ ہو کہ بچپن سے ہی ڈرے سہمے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ والد صاحب بہت غصہ ور تھے۔ میں نے اپنی والدہ کو ہمیشہ مظلوم دیکھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ان کی تکلیف کو دور کر دوں مگر میرے بس میں نہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے صوفیانہ سنجیدگی آ گئی تھی۔

☆ نوٹس بورڈ سے نتیجہ نوچنا اور اُس کے بعد کی کہانی کے پیچھے کیا راز ہے؟

☆☆ ۱۹۷۱ء میں گولیوں اور بموں کی گونج میں ہمارے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات ہوئے۔ عوامی لیگ کے باغیوں نے امتحانات کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ لیکن امتحانات ہوئے اور نہ صرف غیر بنگالی بلکہ بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اس میں حصہ لیا۔ رزلٹ کا اعلان ہوا۔ ہم کالج گئے تو نوٹس بورڈ پر کامیاب طلباء کے رول نمبرز کی لسٹ آویزاں تھی۔ اس میں میرا رول نمبر بھی شامل تھا۔ باغیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس امتحان اور اس کے نتائج کو نہیں مانتے۔ میرے سارے اردو بولنے والے ہم جماعت مغربی پاکستان جا چکے تھے اور جانے سے پہلے بورڈ آف ایجوکیشن جیسور جا کر اپنے نتائج حاصل کر چکے تھے۔ میرے لئے جیسور جانا ممکن نہیں تھا کیوں کہ insurgency بہت بڑھ چکی تھی اور جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں انٹر پاس ہوں۔ لہذا ادھر ادھر دیکھ کر وہ نوٹس اتار لیا۔ ویسے بھی وہ نوٹس کسی کے کام کا نہیں تھا کیوں کہ بنگالی اس امتحان کو منسوخ کر چکے تھے۔ جب میں ۱۹۷۴ء میں کراچی پہنچا اور سینٹ پیٹرکس کالج میں بی اے میں داخلہ لینے گیا تو پرنسپل نے پہلا سوال کیا کہ "کیا تم انٹر پاس ہو؟" میں نے وہ نوٹس ان کے سامنے رکھ دیا اور ساتھ ہی امتحان میں شامل ہونے کا ایڈمٹ کارڈ بھی۔ پرنسپل نے ایڈمٹ کارڈ پر لکھا ہوا رول نمبر لسٹ میں تلاش کیا اور مجھے داخلہ دے دیا۔

☆ سنیل نام سے ہماری بھی کئی یادیں جڑی ہیں جس کے ذکر کا یہ محل نہیں۔ آپ کے ذہن میں فوری طور پر اس نام کا ابھرنا کس حوالے کی طرف اشارہ ہے؟

☆☆ بنگلہ دیش سے فرار ہو کر جون ۱۹۷۲ء میں کلکتہ پہنچا تو اپنے نانا کے ہاں قیام کیا۔ پڑوس میں ایک ہندو خاندان رہتا تھا۔ ان کا بیٹا سنیل میرا ہم عمر تھا۔ ہم دونوں میں جلد ہی دوستی ہو گئی۔ ہم اکثر ساتھ ہی کلکتہ گھومنے جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں اس کے گھر بھی جاتا تھا۔ اس کے گھر کے آنگن میں ایک گائے

بندھی رہتی تھی۔اس کا بچہ اس کے پاس ہی اچھلتا کودتا رہتا تھا۔سنیل مجھ سے ہنستے ہوئے کہتا "جب یہ بچھڑا بڑا ہو جائے گا تو ہم اس کو ذبح کر کے کھا جائیں گے"۔ اس کی ماں اس کی اس بات پر ناراض ہونے کی بجائے ہنستی تھی ۔سنیل ایک progressive ہندو فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔یہ لوگ گائے کی تقدیس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔سنیل میرے ساتھ جب بھی کلکتہ جاتا تو ہم رحمانیہ ریسٹورنٹ جایا کرتے تھے جہاں کے کباب رول مشہور تھے۔ویٹر جب ہم سے آ کر پوچھتا کہ کون سا رول چاہیے، بیف یا مٹن تو سنیل بیف کے رول منگواتا۔نیپال کی سرحد پر جب پولیس نے تفتیش کرتے ہوئے میرا نام پوچھا تو مجھے اپنا دوست یاد آ گیا اور میں نے وہ نام بتا دیا۔

☆ مندر میں دیوی کے آگے سر جھکاتے ہوئے آپ کے جذبات واحساس کس نوعیت کے تھے اور اُن پر آپ نے کس طور قابو پایا؟

☆☆ دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتا رہا کہ "یارب! جو کچھ کر رہا ہوں سخت مجبوری کے عالم میں کر رہا ہوں۔تو معاف کر دے۔تو تو دلوں کا حال جانتا ہے"۔

☆ آپ کی زندگی کے حوالے سے نغمی صاحب نے کراچی کا ذکر اختصار سے کیا ہے۔کراچی کے قیام اور جدوجہد کے بارے تفصیل سے بتلایئے۔

☆☆ میں اکتوبر ۱۹۷۴ء میں کاٹھمنڈو سے براستہ بنکاک کراچی پہنچا۔میں گھر سے پہلے نکلا تھا کہ سب سے پہلے کراچی پہنچ جاؤں گا۔لیکن ریڈ کراس کا چارٹرڈ جہاز جو کاٹھمنڈو سے نیپال میں پھنسے لوگوں کو کراچی پہنچا رہا تھا، اچانک بند ہو گیا۔ہم انتظار میں بیٹھے رہے لیکن فلائٹیں نہ چلنا تھیں نہ چلیں۔انتظار میں سات مہینے گزر گئے ۔اس دوران پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے معاہدے کے تحت ڈھاکے سے ری پیٹری ایشن شروع ہو چکا تھا اور میرے خاندان کے بہت سے لوگ آ چکے تھے۔میرا چھوٹا بھائی اور ایک بہن بھی کراچی پہنچ چکے تھے۔میں نے سوچا کہ فلائیٹ کے انتظار میں تو میں کاٹھمنڈو میں پڑا سسکتا رہوں گا۔پاکستان جانے کا اجازت نامہ میرے بھائی نے اسلام آباد سے مجھے بھجوا دیا تھا۔اس لحاظ سے مجھے کاٹھمنڈو کے پاکستانی سفارخانے سے بیس روپے ہفتہ گزارہ الاؤنس ملتا تھا۔لیکن وہ ناکافی تھا۔میں نے کچھ قرض لے کر پی آئی اے کا ٹکٹ خریدا اور کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔النور سوسائٹی، بلاک ۱۹، فیڈرل بی ایریا کے ۱۲۰ مربع گز پر تین کمروں کے مکان میں ہم ۲۲ آدمی رہتے تھے۔یہ سب میرے ماموؤں کے بیوی بچے تھے۔ان لوگوں کے ساتھ ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے۔میرے والدین، ایک بھائی اور ایک بہن ابھی بنگلہ دیش میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔گھر میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ بھگ دس انچ چوڑے تختے اینٹوں پر رکھے ہوئے تھے اور ان تختوں پر صرف کتابیں تھیں۔بچوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ انہیں صرف پڑھنا ہے اور کچھ نہیں۔گھر میں اکثر کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔کسی طرح آٹا، چاول اور دال مہیا ہو جاتے تھے۔صبح ناشتے میں ہم بغیر دودھ کی چائے کے ساتھ سادہ چپاتی کھاتے تھے۔دوپہر کو چاول، دال اور رات کو دال روٹی۔دال کبھی پتلی بنتی تھی اور کبھی چنے کی دال کو تھوڑا مصالحہ ڈال کر سالن کی طرح پکا دیا جاتا تھا۔یہی ہم نے برسوں کھایا۔گوشت، مرغی یا مچھلی کی شکل دیکھے ہوئے مہینوں ہو جاتے تھے۔کراچی میں کچھ رشتہ دار تھے جو ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان آ گئے تھے اور اچھی حیثیت رکھتے تھے۔وہ لوگ کبھی کبھی راشن وغیرہ پہنچا دیتے تھے۔میں نے آتے ہی کام کی تلاش شروع کر دی اور دوسرے ہی مہینے مجھے ایک اچھا ٹیوشن مل گیا۔میں یہاں اپنا اور اپنے بھائی اور بہن کا خرچہ اٹھاتا تھا اور بنگلہ دیش میں اپنے والدین اور ایک بھائی اور ایک بہن کا خرچ بھیجتا تھا۔چھوٹے بھائی نے پاکستان ایئر فورس میں درخواست دی تو اسے کامیابی ہوئی اور وہ ٹریننگ کے لئے رسالپور چلا گیا۔ماموں نے مجھ سے کہا کہ ''دوبارہ انٹر کا امتحان دے کر میڈیکل میں داخلہ لے لو۔پڑھائی کا خرچہ میں دوں گا''۔مگر میں نے سوچا پھر گھر کیسے چلے گا؟ لہٰذا میں نے شام کے کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔چند مہینوں بعد ایک شپنگ کمپنی میں اچھی نوکری مل گئی۔اب معمول یہ تھا کہ صبح ۹ سے شام ۵ بجے تک نوکری کرتا تھا اور اور شام ساڑھے پانچ بجے سے رات کے ۹ بجے تک کالج میں پڑھتا تھا۔امی کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ان سے بچھڑے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے تھے۔آخر جب بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تب ۱۹۷۷ء میں امی، ابا اور دونوں بھائی بہن آئے۔اس دن ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔اب گھر کی تلاش شروع ہوئی۔میری تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ اچھا گھر کرائے پر لے سکتا۔ہمارے پڑوسی نے اپنا گھر دو منزلہ بنا لیا تھا۔صرف دروازے کھڑکیاں نہیں لگی تھیں۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ہمیں گھر کرائے پر دینے کو تیار ہیں مگر کھڑکیاں اور دروازے ہمیں خود لگوانے ہوں گے۔ہم وہ پیسے کرائے میں کاٹ لیں گے۔چونکہ ہمیں فوری طور پر گھر کی ضرورت تھی اور اس کرائے میں دوسرا گھر مل نہیں سکتا تھا، اس لئے ہم اسی گھر میں شفٹ ہو گئے۔دروازوں اور کھڑکیوں پر چق ڈال لئے۔چوری کا کھٹکا نہ تھا اس لئے کہ گھر میں تھا ہی کیا جو چور لے جاتا۔آفس سے ایڈوانس لے کر دروازے اور کھڑکیاں لگوائیں۔۱۹۷۶ء میں بی اے پاس کیا۔نوکری کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے سکتا تھا، اس لئے ایم اے انگریزی میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر رجسٹر کروایا۔دو سال میں ایم اے مکمل ہو گیا۔جب اخبار میں نتیجہ دیکھا تو میں واحد پرائیویٹ طالب علم تھا جس نے سیکنڈ کلاس حاصل کیا تھا۔باقی جتنے کامیاب ہوئے تھے سب کے سب تھرڈ کلاس میں پاس ہوئے تھے۔ سندھ مسلم لاء کالج میرے آفس سے دس منٹ پیدل کا راستہ تھا۔وہاں شام کی کلاسیں ہوتی تھیں۔میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا اور دو سال میں سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہو گیا۔۱۹۸۱ء میں ہمارے منجھلے ماموں کی بڑی بیٹی ہماری دلہن بن گئیں اور ۱۹۸۳ء میں ہم سعودی عرب سدھار گئے۔

☆ ناسٹلجیا قیمتی سرمایہ تصور ہوتا ہے پھر عمر رفتہ سے گریز کا سبب؟

☆☆ میں تو بہت ناسٹلجیک ہوں۔پرانی یادیں، باتیں، تاریخی واقعات اور تصاویر مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔اسی لئے تو میں جہاں گیا وہاں سے یادیں لے کے آیا اور انہیں کہانیوں میں پرویا۔کیا میں نے کہیں عمر رفتہ سے گریز کی بات کی ہے؟

☆ تخلیقی سیلاب آپ کے ہاں کب اور کیوں کر آیا اور اپنے پیچھے کیا

کچھ چھوڑ کر گیا؟

☆☆ تخلیقی سیلاب مشرقی پاکستان کے ختم ہوتے ہی شروع ہوا۔ خون بہتا رہا، انسانیت سسکتی رہی، بڑے بڑے ادارے جن پر ہمیں بڑا اعتماد تھا، اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کو توڑتے رہے، بڑی طاقتیں گھناؤنے کھیل کھیلتی رہیں، دوستی، شرافت اور سچائی پامال ہوتے رہے تب دل میں طوفان برپا ہوا۔ یہ سیلاب اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا۔ جس طرح زمین پر سیلاب ختم ہونے کے بعد مٹی زرخیز ہو جاتی ہے اور اگلے سال فصل اچھی ہوتی ہے اسی طرح یہ سیلاب بھی ذہن کو زرخیز کر گیا اور میری جو تخلیقات وجود میں آئیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں۔

☆ نصرت انور کی رائے کے بعد کہ آپ کہانیاں شغل کے طور پر لکھتے ہیں آپ کے ادبی سفر کی بابت سوالیہ نشان نہیں لگ جاتا؟

☆☆ باجی نصرت کی رائے اپنی جگہ۔ لیکن کہانی لکھنا میرا مشغلہ نہیں میرا passion ہے۔ جبھی تو ہر طرح کی مشغولیات سے وقت نکال کر میں کہانی لکھ لیتا ہوں۔ مجھ سے کئی انٹرویوز میں سوال کا گیا کہ " فل ٹائم کام کر کے آپ نے چھ چھ کتابیں کیسے لکھ ڈالیں؟" میں کہتا ہوں کہ وقت نکال لیتا ہوں۔ آفس میں لنچ کا ایک گھنٹہ، شام کو کام سے واپس آنے کے بعد دو تین گھنٹے اور ویک اینڈ پر دو دن۔ جب لکھنے کی تحریک ہوتی ہے تو وقت نکال ہی لیتا ہوں۔

☆ آپ جب مٹی کی خوشبو کا ذکر کرتے ہیں تو ایک سے زائد علاقے قاری کے حافظے میں نمایاں ہونا فطری امر ہے؟

☆☆ جی ہاں، برصغیر کے تینوں ممالک میری زندگی میں اہم ہیں۔ عہد طفلی ہندوستان میں، لڑکپن اور عنفوان شباب کا دور مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں، جوانی پاکستان میں۔ اس میں آپ دو اور ممالک کا اضافہ کر سکتے ہیں، یعنی سعودی عرب، جہاں ملازمت کے سلسلے میں ۱۴ سال کا بن باس گزارا اور اب امریکہ جو میرا موجودہ وطن ہے۔ ان تمام جگہوں سے بہت ساری یادیں وابستہ ہیں اور ان علاقوں سے محبت فطری امر ہے۔

☆ اُن لوگوں کی بابت آج کی محفل میں تفصیل سے بتلایئے جو سانحہ مشرقی پاکستان کے بارے آپ کے افسانوں اور کہانیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے؟

☆☆ سب سے پہلے تو یہ کہا گیا کہ یہ افسانے نہیں ہیں۔ جس طرح لکھے گئے ہیں اس سے افسانے کا فن متاثر ہوتا ہے۔ یہ اعتراض درست ہو سکتا ہے۔ میں نے وہ کہانیاں انگریزی کہانیوں کے ڈھب پر لکھی ہیں۔ جو بات ہے آپ ڈائرکٹ کہہ دیجئے۔ تجرید یا علامات کے چکر میں مت پڑیے۔ میرا مقصد تھا بات پہنچانا اور میرا خیال ہے کہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔ لوگ ان کہانیوں کو پڑھ کر آنسوؤں سے روئے ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ بنگالیوں پر بھی بہت ظلم ہوا مگر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جی ہاں، میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ بنگالیوں پر ظلم ہوا۔ لیکن اس پیمانے پر نہیں جس پیمانے پر بہاریوں، دوسرے اردو بولنے والوں اور مغربی پاکستانیوں پر ہوا۔ پاکستان کی intelligentsia یہ بات کہنے میں بڑا فخر محسوس کرتی ہے کہ "اجی بنگالیوں پر بڑا ظلم ہوا"۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ بنگالیوں نے کیا ظلم کیے۔ جیسا کہ نسیم سحر صاحب نے لکھا ہے، میں بھنور کی آنکھ میں تھا۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جبکہ یہ سب باتیں کرنے والے وہاں نہیں تھے۔ سنی سنائی باتوں پر اپنی دلیل قایم کر رہے ہیں۔ ایسی دلیلیں دینے والے سرمیلا بوس کی کتاب "The Dead Reckoning" پڑھیں۔ یہ کتاب بنگلہ دیش بننے کے چالیس سال بعد ۲۰۱۱ء میں چھپی۔ اس وقت تک بہت سے لوگ زندہ تھے جو ۱۹۷۱ء سن شعور کو پہنچے ہوئے تھے اور انہیں اس وقت کی باتیں یاد تھیں۔ سرمیلا بنگلہ دیش کے ان تمام مقامات پر گئی جہاں بقول شخصے Genocide ہوا تھا۔ اس نے وہاں کے لوگوں سے سوالات کئے، پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے فوجیوں سے ملی جو اس ڈرامے کے کردار رہ چکے تھے اور اس نتیجے پر پہنچی کہ ۱۹۷۱ء کے فوجی آپریشن کو Genocide نہیں کہا جا سکتا ہے۔ سرمیلا بوس ایک عورت ہے، ہندو ہے، ہندوستانی ہے اور بنگالن ہے۔ اسے بھلا پاکستانیوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟ اس نے وہ کچھ لکھا جو تحقیق کے بعد نتیجہ نکلا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن اجتماعی قبروں میں غیر بنگالیوں کو قتل کر کے دفن کیا گیا تھا، بنگلہ دیش بننے کے بعد غیر ملکی صحافیوں کو وہ قبریں کھول کے دکھائی گئیں اور بتایا یہ گیا کہ یہ بنگالیوں کی اجتماعی قبر ہے جنہیں پاکستانی فوج نے مارا۔ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد کے دنوں میں میر پور ڈھاکہ سے تمام بہاری مردوں کو گرفتار کر کے لے جایا گیا اور ان کی عورتوں کو بہ ذریعہ اسٹیمر نارائن گنج کے مورا پاڑہ کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ غیر ملکی صحافیوں کو بتایا گیا کہ یہ بنگالی عورتیں ہیں جن کی پاکستانی فوجیوں نے آبروریزی کی۔ میں دیوار کے جس طرف تھا اسی کی تصویر کشی کی۔ دیوار کی دوسری جانب یقیناً بہت کچھ ہوا لیکن ہولناکی میں غیر بنگالیوں اور پاکستانیوں پر ہونے والے مظالم کا عشر عشیر بھی نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہالی ووڈ میں جنگ پر کتنی فلمیں بنیں لیکن کیا کوئی ایسی فلم بنی جس میں ڈریسڈن (Dresden) پر کارپٹ بمباری کو موضوع بنایا گیا؟ کیا ہالی ووڈ یا مغربی فلمسازوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹم بم سے تباہی پر مبنی فلم بنائی؟ میں نے پھر بھی اپنی کہانیوں میں بنگالیوں کے اعلیٰ کردار کی تعریف کی ہے۔ پرچم ستارہ و ہلال کے فضل الرحمان، تمنائے اجل کا موبو (محبوب)، وہ ایک سجدہ کے منور علی، سہارا کا بزرگ اور باشار چاچا کے ابوالبشر بے مثال کردار کے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کی جان بچائی۔ مجھے پاکستانی قوم پر افسوس ہوتا ہے جس نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید میں کچھ نہیں کیا۔ جب اندرا گاندھی کے ہرکارے دنیا بھر کے حکومتی ایوانوں میں جا کر مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ظلم و ستم کی جھوٹی داستانیں سنا رہے تھے اس وقت ہمارے سفراء خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے وہی کچھ لکھا ہے جو سچ ہے۔

☆ آپ کی کہانی کے ڈانڈے قدامت پسندی سے جوڑنے والے الف لیلا، فسانۂ آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند کے علاوہ کن ادوار اور احباب سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

☆☆ ابھی تک تفصیل سے میرے یا میری کہانیوں کے بارے میں لکھا

"چہارسُو"

نہیں گیا۔ جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں کہانیوں کو روایت سے جوڑا گیا ہے۔ ایک نقاد نے کہا کہ میں غلام عباس کی طرح لکھتا ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بات نوٹ کی کہ میری مزاحیہ کہانیاں امتیاز علی تاج کی یاد دلاتی ہیں۔ بچوں کے لئے میری کتاب "بوجھو تو جانیں" پڑھ کر امریکہ کے معروف شاعر اور ادیب مامون ایمن کو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم یاد آ گئے۔

☆ آپ کے کرافٹ کو دوسرے فکشن نگاروں سے بہتر کس سبب گردانا جاتا ہے؟

☆☆ سادگی اور پرکاری۔ بہت سیدھی سادی زبان! کوئی علمیت کا رعب نہیں، کوئی لفاظی نہیں۔ بس جو کچھ کہنا ہے کم سے کم الفاظ میں کہہ دیا۔

☆ تجرید و علامت اتنی بری چیزیں تو نہیں کہ انہیں مطعون ٹھہرایا جائے؟

☆☆ میں نہیں کہتا کہ تجرید و علامت بری چیزیں ہیں، نہ ہی میں نے انہیں مطعون ٹھیرایا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ میں علامتی افسانے نہیں لکھ سکتا۔ مجھ میں شاید یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کئی سال پہلے شکیل عادل زادہ سے ملاقات کے دوران میں نے کہا کہ "مجھے تجریدی یا علامتی افسانہ لکھنا نہیں آتا" تو انہوں نے کہا تھا" اور نہ ہمیں پڑھنا آتا ہے"۔

☆ ابوالخیر کشفی صاحب آپ کی کہانیوں کو پاکستان کا میورل ٹھہراتے ہیں اس کے باوجود اردو کے تنقیدی ادب میں آپ یا آپ کی کہانیوں کا ذکر تلاش کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے؟

☆☆ درست فرمایا۔ دراصل میری کتابوں کی پبلیسٹی نہیں ہوئی اور نہ ہی میں پاکستان کے علمی ادبی حلقوں میں بہت اٹھا بیٹھا۔ ۱۹۸۱ء/۸۲ میں سلیم احمد کے گھر ہونے والی ادبی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نجی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس وقت تک میری کوئی کتاب شایع نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے ادارے کامران پبلی کیشنز کے تحت "جلاوطن کہانیاں" چھپوانے کا انتظام کیا اور مسودہ محترم جاذب قریشی کے حوالے کر دیا جو شاید ان دنوں انتظامات سنبھالتے تھے۔ پھر ہوا یہ کہ میں مارچ ۱۹۸۳ء میں بہ سلسلہ ملازمت سعودی عرب چلا گیا اور ۱۹۸۴ء میں سلیم احمد انتقال کر گئے۔ پھر سب کچھ جوں کا توں رہ گیا۔ سعودی عرب جانا میرے ادبی سفر کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ ۱۹۹۷ء میں پاکستان واپس آیا اور "جلاوطن کہانیاں" چھپوائی۔ کتاب کو اچھی پذیرائی ملی۔ جمیل الدین عالی صاحب نے روزنامہ "جنگ" کے دفتر میں اس کتاب پر مذاکرہ کروایا تھا جس کا اہتمام اختر سعیدی نے کیا تھا۔ مذاکرے میں عالی صاحب کے علاوہ امراؤ طارق اور حمید کاشمیری شریک ہوئے تھے۔ "جنگ" کے ادبی صفحے پر آدھے صفحے کی رپورٹ شایع ہوئی تھی لیکن مزے کی بات یہ کہ رپورٹ میں عالی صاحب، امراؤ طارق صاحب اور حمید کاشمیری صاحب کی تصویریں تو چھپیں لیکن میری یا میری کتاب کی تصویر شایع نہیں ہوئی، حالانکہ مذاکرہ میری کتاب پر ہوا تھا۔ ۱۹۹۷ء/۱۹۹۸ء میں پروفیسر حیدر ملک مرحوم کی ادبی نشستوں میں گاہے بہ گاہے جایا کرتا تھا۔ مگر پھر ۱۹۹۹ء میں امریکہ آنا ہو گیا اور وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پاکستان کے ادبی منظر نامے سے غائب ہو گیا۔

☆ اردو زبان و ادب میں مبالغہ آرائی کثرت سے کی جاتی ہے جیسے انور سدید صاحب نے آپ کے فکاہی ادب کو پطرس بخاری، کنہیالال کپور اور مشتاق احمد یوسفی کے ہم پلہ قرار دے ڈالا؟

☆☆ یہ بڑے نام ہیں۔ میں اپنے آپ کو ان کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ اور میرا نہیں خیال کہ ڈاکٹر انور سدید نے مجھے ان جید مزاح نگاروں کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ ہاں انہوں نے مجھے اس فہرست میں شامل کیا ہے جس میں ان لوگوں کے نام ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کے نام فہرست میں بہت اوپر ہوں گے اور میرا نام کہیں نچلے سطور میں ملے گا۔ صورت واقعہ سے کام لینے کے سلسلے میں انہوں نے مجھے پطرس بخاری، کنہیالال کپور اور مشتاق احمد یوسفی "کی طرح" مسکراہٹوں کی فصل اگانے والا لکھا ہے۔ اس سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے ان کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ ہاں میں ان بلند پایہ مزاح نگاروں کا ایک معمولی سا مقتدی ضرور رہوں۔

☆ کشفی صاحب سے آپ کا تعلق خاص یا کوئی نسبت یقیناً ضرور رہی ہو گی تبھی انہوں نے حضرت بلالؓ کی نسبت ایچ۔ایل گریک کی کتاب سے "جلا وطن کہانیاں" کو بریکٹ کرنا ضروری جانا؟

☆☆ آپ کو یہ جان کر تعجب ہو گا کہ کشفی صاحب سے میں جلاوطن کہانیاں کی اشاعت سے پہلے ملا بھی نہیں تھا۔ میرے پبلشر کلیم چغتائی ان سے رابطے میں رہے تھے اور مضمون لکھنے کے لئے مسودہ بھیج دیا تھا۔ کشفی صاحب کراچی یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے ڈین تھے لیکن میں کبھی بھی کراچی یونیورسٹی کا طالب علم نہیں رہا۔ ایم اے میں نے بہ حیثیت پرائیویٹ امیدوار پاس کیا۔ ۱۹۹۷ء میں جب میں سعودی عرب سے مستقل طور پر پاکستان واپس آیا تب پہلی بار کشفی صاحب سے ملا۔ کلیم چغتائی مجھے اپنے ساتھ لے کر ان کے گھر گئے تھے اور تعارف کرایا تھا۔ اس سے پہلے تعلق خاص تو دور کی بات ہے، تعلق بھی نہیں تھا۔

☆ "پری خانے کا مسافر" میں علاقائی بولیوں کا جس انداز میں مضحکہ اُڑایا گیا ہے اُس سے آپ کی نسبت قاری کا چونکنا کسی حد تک درست محسوس ہوتا ہے؟

☆☆ خدا اس سے مجھے محفوظ رکھے کہ میں کسی کا مضحکہ اڑاؤں۔ میرا مقصد صرف بات سے بات پیدا کرنا تھا۔ علاقائی بولیوں کے بولنے والوں اور عربوں کے درمیان بات چیت کے دوران جو مضحکہ خیزیاں پیدا ہوتی ہیں اس سے قاری کو محظوظ کرنا میرا مقصد تھا۔ اسے مضحکہ اڑانا مت کہیے یہ تو صورت واقعہ سے لطف اٹھانا ہے۔ آپ نے ۱۹۷۰ء کے دہائی کی برٹش کامیڈی Mind Your Language دیکھی ہو گی۔ اس میں مختلف زبانوں کے بولنے والے تعلیم بالغاں کے ایک سنٹر میں انگریزی سیکھنے آتے ہیں اور زبان کی لغزشوں سے پر لطف واقعات جنم لیتے ہیں جو قاری کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں۔ میری کتاب میں بھی ایسا ہی مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ میں ایک اور کتاب لکھ رہا ہوں جس میں امریکہ میں رہنے والے لوگوں کی آپس میں گفتگو سے جو حماقتیں ہوتی ہیں وہ میں بتاؤں گا۔ اس میں بنگالی، بہاری، پنجابی، پٹھان، سندھی، میمن، حیدرآبادی (دکنی)، لکھنوی اور امریکی کردار شامل

ہیں جو بولتے تو سب اردو ہیں مگر اپنے اپنے لہجے میں۔

☆ مشرقِ وسطیٰ میں ایک عشرے سے اوپر گزرے وقت کے تجربات و احساسات سے آگہی کے علاوہ ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ اچانک امریکہ جانے کی خواہش شدت کیوں پکڑ گئی؟

☆☆ مشرقِ وسطیٰ جانا معاشی لحاظ سے میرے لئے تھوڑا فائدہ مند ہوا۔ زیادہ نہیں۔ مگر دوسرے نقصانات بہت ہوئے۔ ادبی صلاحیتیں پروان نہ چڑھ سکیں۔ کتابوں کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ پاکستانی کمیونیٹی وہاں احساس کمتری کا شکار رہتی ہے۔ مسلم بھائی چارگی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایک گورا امریکی ان کی نظروں میں آپ سے بہتر ہے۔ عربوں میں یہ احساس شدید ہے کہ ''یہ پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی ہمارے نوکر ہیں'' معاشرہ طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ سب سے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے سعودی، ان کے بعد یورپی اور امریکی، ان کے بعد دیگر عرب ممالک کے لوگ اور سب سے نچلا درجہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ہے۔ وہاں پیسہ ہے مگر علم نہیں ہے۔ تعلیمی ادارے اور دوسرے انسٹی ٹیوشنز موجود نہیں ہیں۔ بادشاہت اور آمریت کے چنگل سے نکلنا لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔ مغرب بھی نہیں چاہتا کہ ان ممالک میں آگہی آئے۔ ابھی جو حکمران ہیں انہیں مغرب اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔ اگر جمہوریت آئی اور پڑھا لکھا باشعور طبقہ اقتدار میں آیا تو وہ مغرب کے کہے میں نہیں رہے گا۔ اس لئے مغربی طاقتیں ان پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتیں۔ عرب اسپرنگ کا جو حال ہوا وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح کا انقلاب لاطینی امریکہ میں آیا تھا تو نہایت کامیاب رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے برازیل، ارجنٹینا، پیرو، میکسیکو اور دوسرے ممالک آمریت کے چنگل سے نکل گئے اور آج وہاں جمہوری حکومتیں قائم ہیں۔ عالم عرب میں جب جمہوری تحریکیں شروع ہوئیں تو انہیں بری طرح سبوتاژ کیا گیا۔ مصر میں اخوان کی حکومت جس طرح ختم کی گئی وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ دوسرے ممالک میں تو حکومتیں بننے ہی نہیں دی گئیں۔ ایک کے بعد ایک مسلم ممالک ختم کر دیے گئے۔ عراق، لیبیا، تیونس، سوڈان، لبنان، شام کس کس کا ماتم کیجئے۔ اس پر لکھنے بیٹھوں تو آپ کے صفحات کم پڑ جائیں گے۔ اس لئے بس اتنا ہی۔ جہاں تک امریکہ جانے کی خواہش ہے تو اس میں کبھی بھی شدت نہیں رہی۔ میرے بہت سارے دوست احباب امریکہ اور کنیڈا جا رہے تھے مگر میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک روز اپنے ایک دوست کی دکان پر فوٹو کاپی کرانے گیا تو انہوں نے مجھے ایک فارم دیا اور کہا کہ ''اس کو بھر دیجئے۔ آج کل بہت لوگ امریکی لاٹری ویزا پروگرام میں درخواستیں دے رہے ہیں۔ اگر آپ کا نام نکل آیا تو آپ کو فیملی کے ساتھ امریکہ کا امیگریشن ویزا مل جائے گا''۔ میں نے فارم بھر کر پوسٹ کر دیا اور بھول گیا۔ چھ مہینے بعد امریکی امیگریشن سروس سے خط آ گیا کہ ''آپ کا نام ویزا لاٹری میں نکل آیا ہے۔ منسلک فارم پر کر کے ہمیں روانہ کر دیں''۔ فارم بھر کر بھیج دیا پھر انٹرویو کی تاریخ آئی۔ انٹرویو ہوا اور ویزا مل گیا۔ اس طرح امریکہ آنا ہو گیا۔

☆ شمالی امریکہ میں بطور کہانی کار آپ کو نمایاں مقام کا حامل بتلایا جاتا ہے۔ اس اختصاص میں چھپے احساسات جاننا بھی آپ کے قاری کا حق ہے؟

☆☆ شمالی امریکہ میں نثر نگار ہیں ہی کتنے؟ گنے چنے چند ہیں۔ ہاں ان میں ایک باعزت مقام حاصل ہے۔ ادبی محفلوں میں جو افسانے سنائے وہ بہت پسند کئے گئے۔ اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہ ہو تو یہی کہوں گا کہ بیشتر لوگوں نے کہا ہے کہ میرے افسانے قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اختتام چونکا دیتا ہے۔ اگر آپ نے "روشنی کے درخت" پڑھی ہے تو آپ کو اندازہ ہوا ہوگا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ میری آواز ریڈیو والی ہے اور افسانہ پڑھنے کا انداز منفرد اور سحر انگیز ہے۔

☆ کامران ندیم صاحب نے نظم کے حوالے سے دو کناروں کا ذکر کیا ہے جس کی وضاحت آپ ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں؟

☆☆ کامران ندیم نے صرف نظم کے حوالے سے نہیں، نظم و نثر کے حوالے سے دو کناروں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ بہت کم تخلیق کار ہیں جو دونوں کناروں کو سیراب کرتے ہیں۔ چونکہ میں نظم و نثر دونوں لکھتا ہوں اس لئے انہوں نے مجھے ان کم تخلیق کاروں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

☆ آپ کی شاعری کی سراہنا کرتے ہوئے مشاعروں میں آپ کی شرکت کو جواز بنایا گیا ہے جبکہ عام طور پر مشاعرے کے شاعر اور کتاب و قلم کے شاعر میں حدِ فاصل کھینچی ہوئی ہے؟

☆☆ میں مشاعروں کا شاعر نہیں ہوں۔ مجھے مشاعروں میں بہت کم داد ملتی ہے۔ چند قدر دان ہیں جنہیں میری شاعری پسند آئی تو انہوں نے مجھے مدعو کر لیا۔

☆ گوئٹے نے ادیب بننے کے لیے جن تین بنیادی شرائط کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے آپ کے ہاں اُن کا گزر یا دخل پہلے سے موجود تھا یا سانحہ مشرقی پاکستان نے آپ کو قلم تھامنے پر مجبور کیا؟

☆☆ درست! سانحۂ مشرقی پاکستان نے قلم تھامنے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ لکھنے کے جراثیم پہلے سے موجود تھے، مگر اس وقت تک تحریک نہیں ہوئی تھی۔ سقوط ڈھاکہ نے سارے بند توڑ دیے۔

☆ ستر کی دہائی میں ہمارے بہت سے دوست عازم امریکہ ہوئے تو ہمارے دل میں خاص طرح کے احساسِ محرومی نے جگہ پالی مگر تیسری دنیا بالخصوص پاکستانیوں کو امریکہ میں جن مسائل کا سامنا ہے انہیں دیکھ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے؟

☆☆ یہ عجیب سی صورت حال ہے۔ جو امریکہ آیا وہ بھی پچھتایا اور جو نہ آیا وہ بھی۔ ہم جیسے لوگ امریکہ آ کر اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کے لئے ترستے ہیں۔ اپنا ملک، اپنی زبان، اپنا مذہب، اپنی تہذیب بہت یاد آتے ہیں۔ یہاں گرین کارڈ مل جائے، امریکی شہری بن جائیں لیکن بات نہیں بنتی۔ ایک اجنبیت کا احساس پھر بھی رہتا ہے۔ میں نے کتنے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''ریٹائر ہونے کے بعد اپنے ملک چلے جائیں گے اور سکون سے وقت گزاریں گے۔ لیکن جاتا کوئی نہیں ہے۔ اول تو اولاد، پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کو چھوڑ کر جایا نہیں جاتا۔ دوسرے اپنے

ملک کا حال جب دیکھتے ہیں تو بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔ چوری، ڈکیتی، جھوٹ، بے ایمانی، فریب، ملاوٹ، اقربا پروری، غریبوں کی زبوں حالی اور امیروں کی بے حسی، عورتوں کی بے حرمتی، سڑکوں پر گندگی اور غلاظت کے ڈھیر، صفائی کا فقدان، کراچی جیسے شہر میں پبلک ٹرانسپورٹ کا فقدان، لوڈشیڈنگ، بارشوں کے بعد سڑکوں کا نہریں بن جانا، غرض کیا کیا گنوایا جائے۔ پاکستان میں برائیاں جس انداز کی ہیں اور جس پیمانے پر ہیں، یوں لگتا ہے کہ ہم قبل از اسلام کے زمانہ جاہلیت میں واپس چلے گئے ہیں۔ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اگر اپنا ملک صحیح ہوتا تو کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی؟ اب کسے خوش نصیب کہا جائے، جو آیا اسے یا جو نہ آیا اسے؟

☆ نطشے سے اختلاف کرتے ہوئے آپ کس برتے پر انسان کے زندہ ہونے کی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ بندہ پرور گھوڑے، گدھے، کتے، سؤر کے بعد انسان انسان کو کھا رہا ہے۔ زمین تو زمین کہکشاؤں پر قابض ہونے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ انسان کو ربورٹ بلکہ چوہا بنانے کی تیاریاں مکمل ہیں؟

☆☆ نطشے نے کہا تھا ''خدا مر چکا ہے'' اس نے انسان کے مرنے کی بات نہیں کی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بہت سے لوگ دیر سے مرتے ہیں اور چند جلدی مر جاتے ہیں۔ یہ نظریہ عجیب سا لگتا ہے کہ " صحیح وقت پر مرو"۔ انسان کے مرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ مولانا حالی نے کہا تھا "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"۔ آپ کا کہنا درست ہے کہ انسان انسان کو کھا رہا ہے۔ اس لئے کہ "انسان ظالم ترین جانور ہے"۔ (یہ بھی نطشے کا ہی قول ہے)۔ مگر ابھی بھی دنیا میں سچائی اور اچھائی برائی کی نسبت زیادہ ہیں۔ پاکستان کو ہی لے لیجئے، ہم کہتے ہیں کہ ہر طرف بے ایمانی اور چوری ہے۔ ناقص سیمنٹ اور گارا استعمال کر کے عمارتیں بناتے ہیں۔ فلاں عمارت گر گئی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ کتنی عمارتیں، سڑکیں اور پل برسوں سے کھڑے ہیں اور گرے نہیں۔ اگر برائی اتنی ہی زیادہ ہوتی تو ہر عمارت اور ہر پل کو گر جانا چاہیے تھا۔ کراچی میں میری گاڑی ایک گڑھے میں پھنس گئی۔ بہت زور لگایا مگر نہیں نکلی۔ چار اشخاص نہ جانے کہاں سے آئے اور گاڑی کو اٹھا کر گڑھے سے نکال دیا۔ میں نے اجرت دینی چاہی مگر ان لوگوں نے لینے سے انکار کر دیا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میں نے کہا ہے: یقیں جانو وہاں ظلمت کا قبضہ ہو نہیں سکتا + ابھی اس شہر میں کچھ صاحب کردار باقی ہیں۔

☆ دنیا کے موجودہ منظرنامے کی روشنی میں یہودی فلسفی نوزا کا ''کیوں'' اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کیا اہل علم، اہل ہنر اور اہل قلم بالخصوص اردو والے اس ''کیوں'' کے حوالے سے کسی طرح کی حرکت میں نظر آتے ہیں؟

☆☆ اسپائی نوزا کا " کیوں " یقیناً اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی تشدد ہوتا ہے تو لوگ سوال کرتے ہیں " کیوں؟"۔ امریکی شہر منیاپولس میں سفید فام پولیس والے کے ہاتھوں افریقی امریکی کے قتل پر پورا امریکہ سڑکوں پر نکل آیا۔ اس طرح کے مظاہرے امریکی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ اسی طرح ہندوستان میں مودی سرکار کے ظلم و ستم کے خلاف پورا ہندوستان اٹھ کھڑا ہوا اور فیض کی نظم " ہم دیکھیں گے " اس احتجاج کا ترانہ بن گئی۔ اس کا ترجمہ بنگالی، گجراتی، بھوج پوری، ملیالم اور نہ جانے کن کن زبانوں میں ہوا اور شمال سے جنوب تک جہاں بھی مظاہرے ہوئے ان میں یہ نظم پڑھی گئی۔ مگر آپ کا سوال کہ "اردو والے کسی طرح کی حرکت میں نظر آتے ہیں؟" ذرا مایوس کرتا ہے۔ ظلم و ستم، بربریت، عورتوں سے زیادتی، وڈیرہ شاہی، عروج پر ہیں لیکن اہل قلم ان کے خلاف کہاں آواز اٹھا رہے ہیں؟ چودھریوں نے کسی غریب کو سزا دینے کے لئے اس کی عورت کو بے آبرو کر کے اس کا ننگا جلوس نکلوایا۔ کیا کسی سیاسی یا مذہبی جماعت نے اس کے خلاف احتجاج کیا؟ کراچی کی فیکٹری میں ساڑھے تین سو مزدور زندہ جلا دیے جاتے ہیں۔ کیا اس جماعت نے جو لوگوں کے حقوق کی چیمپئن بنتی ہے کچھ کیا؟ کیا اس جماعت نے جو خود کو عوام کا نمائندہ کہتی ہے احتجاج کیا؟ بس دونوں ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہے لیکن ٹھوس قدم کسی نے نہیں اٹھایا۔ بلوچستان میں آئے دن زائرین کو قتل کیا جاتا ہے، ان کی بسیں جلا دی جاتی ہیں اور مسافر مار ڈالے جاتے ہیں۔ کیا کسی سیاسی جماعت، کسی مذہبی جماعت، کسی سماجی فورم، کسی شہری انجمن کی طرف سے آواز اٹھی کہ اس خونریزی کا حتمی ازالہ ہونا چاہیے؟ مجھے افسوس کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب "نہیں" میں دینا پڑ رہا ہے۔

☆ آپ نے امریکہ کے ایک فیصد نقصان اٹھانے کی بات رواروی میں کی ہوگی وگرنہ حضور امریکہ بہادر تو ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ایچ او، سائنس و ٹیکنالوجی حتی کے موسمیات کے بَل پر ہم جیسے ناتوانوں کی سانسوں کا مالک و مختار بنا ہوا ہے؟

☆☆ نہیں نہیں، میں تو امریکہ بہادر کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو اپنے افسانے "نقصان" میں صرف اس ایک لڑائی کی بات کر رہا ہوں جس میں پانچ سو امریکی فوجیوں میں پانچ مارے گئے جبکہ عراقیوں کا اسی فیصد نقصان ہوا۔ لیکن وہ امریکی بڑھیا، جس کا بیٹا لڑائی میں کام آ گیا، کہتی ہے کہ اس کا تو سو فی صد نقصان ہو گیا چونکہ اس کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ آپ کی بات درست ہے کہ امریکہ بہادر پاکستان جیسے کمزور ممالک کا مالک و مختار بنا ہوا ہے۔

☆ نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کے بعد امریکی سپر میسی برقرار رہنے کے کتنے امکانات ہیں گر جواب نفی میں ہے تو متبادل کا نام بتلانا ضروری ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر میں امریکی سپر میسی برقرار رہے گی۔ لوگ متبادل کے طور پر چین کا نام لیتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ چین اس کا اہل نہیں ہے۔ چین بے شک ایک فوجی اور معاشی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور مزید ابھرے گا، لیکن امریکہ کی جگہ لینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ چین کی معیشت کا دارومدار اس کے برآمدات پر ہے اور امریکہ چینی اشیاء کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ امریکہ کے بازاروں میں آپ کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئے گی جو "میڈ ان چائنا" نہ ہو۔ دوسرے ممالک کی چیزیں بھی ہوتی ہیں مگر بہت کم۔ اس لئے چین اتنی بڑی مارکیٹ کو کھونا نہیں چاہے گا۔

☆ آپ جیسا مشرقی اور اسلامی ذہن کا ہوش مند انسان مغربی معاشرے کے آزادانہ اختلاط اور بے مہار آزادی کو سراہتے نہیں تو اختلاف بھی نہیں رکھتے؟

☆☆ دیکھئے، مغربی معاشرے کے آزادانہ اختلاط کا میں حامی نہیں ہوں۔ لیکن آپ مغرب کو قصوروار نہیں ٹھیرا سکتے کہ انہوں نے اپنے ملکوں میں یہ آزادی کیوں دے رکھی ہے۔ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے ملکوں میں مغربی بے راہ روی نہ آنے دیں۔ کیا ایسا ہو رہا ہے؟ نہیں! ہم تو اندھا دھند مغرب کی تقلید میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں فادرز ڈے، مدرز ڈے، ویلینٹائینز ڈے، ہیلووین وغیرہ منائے جاتے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر اسپیشل پروگرام اور ڈرامے نشر ہوتے ہیں۔ اب صرف کرسمس منانا باقی رہ گیا ہے۔ ''ہم'' ٹی وی کے ایوارڈز پروگرام آپ دیکھ لیں۔ ہماری عورتیں ایسے لباس میں ہوتی ہیں کہ ہالی ووڈ کی اداکارائیں شرمائیں۔ ان پروگراموں میں شاید اردو بولنا منع ہے۔ ہر شخص انگریزی بول رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ایوارڈز اردو ڈراموں پر دیے جا رہے ہوتے ہیں، جنہیں ایوارڈ مل رہا ہے وہ اردو بولنے والے ہیں، جن لوگوں کے لئے وہ ڈرامے پیش ہوتے ہیں وہ اردو والے ہیں، ہال میں جو سامعین بیٹھے ہوتے ہیں وہ پاکستانی اور اردو داں ہوتے ہیں۔ پھر یہ انگریزی کیوں؟ خدارا کوئی تو اس قوم کو احساس کمتری سے باہر نکالے۔ اگر ہمارا ملک ایک متبادل معاشرہ پیش کرتا ہے جو اسلامی اصولوں پر قائم ہو تو دوسرے ضرور آپ کی تقلید کریں گے۔ آپ یقین کریں مغرب والے خود اس بے مہار آزادی سے تنگ ہیں۔ لڑکیوں کی ٹین ایج پریگننسی، لڑکوں کی نشے کی حالت میں ڈرائیونگ اور اس میں اموات، نوجوان نسل کی منشیات کی عادت، ماں باپ میں طلاق اور اس کے نتیجے میں بچوں کی بے راہ روی اور ان کی شخصیات کو نقصان، یہ تمام باتیں یہاں کے لوگوں کو بہت پریشان کرتی ہیں۔ وہ ایک متبادل نظام ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن وہ نظام کون پیش کرے؟ ہم وہ نظام پیش کر سکتے ہیں، لیکن ہم تو وہ کوے ہیں جو ہنس کی چال چلنے کی کوشش میں اپنی چال بھول گئے ہیں۔

☆ پروفیسر خالدہ ظہور اردوئے معلیٰ کی بابت فکرمندی کا اظہار کر رہی ہیں جبکہ ہم جیسوں کو اردوئے محلّہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ عام بول چال تو چھوڑیئے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے اردو زبان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے؟

☆☆ میں آپ سے متفق ہوں۔ کہاں کی اردوئے معلیٰ! اب تو سیدھی سادی صحیح اردو بھی سننے کو نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ٹیلی ویژن چینلز ہیں۔ ایک وقت تھا جب ٹی وی پر ایسی اردو بولی جاتی تھی کہ دیکھنے والے اس سے سیکھتے تھے۔ اب تو ٹی وی پر ایسی زبان بولی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ مزاحیہ ڈرامہ "بلبلے" کے محمود صاحب فرماتے ہیں کہ "میرے سر میں درد ہو رہی ہے"، ایک اور ڈرامے کا کردار اپنی "اولادوں" کی فکر کرتا ہے، اذان کے بعد کی دعا میں رسول اکرم صلی الل ؟علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کو "بہرامند" لکھا جاتا ہے۔ شیف شیریں انور سالن میں دہی ڈال کر کہتی ہیں، "لیجئے دہی ڈل گئی"۔ کسی کو فکر ہے؟ اور ہولناک ترین بات یہ ہے کہ بھارتی فلموں اور ڈراموں کی طرح "خوش" کو "کھوش" اور "فقیر" کو "پھکیر" بھی کہا جا رہا ہے۔ ارباب اقتدار اور اردو کے چاہنے والوں کو کچھ کرنا چاہیے۔

☆ انڈو پاکستان میں تعلیمی معیار، انسانی جبلّت اور اخلاقی گراوٹ کے باعث اردو والے تخلیق سے زیادہ تخریب میں مصروف نظر آتے ہیں مگر جب ہم امریکہ، برطانیہ، کینیڈا کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اردو داں خواتین وحضرات کو اس عمل سے دوچار دیکھتے ہیں تو دل پر گھونسہ ضرور پڑتا ہے؟

☆☆ جی ہاں۔ کراچی ایک وقت میں اردو کا مرکز تھا اور یہاں بولی جانے والی زبان صحیح سمجھی جاتی تھی۔ یہاں کے لیڈروں نے اردو کی تعلیم کو ہی ختم کر دیا۔ نوجوانوں کو سیاست میں اور بھتہ خوری پر لگا دیا۔ ایک نسل جاہل رہ گئی۔ امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے تعلیم یافتہ اردو دانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اردو بولنا اور اپنے بچوں کو سکھانا معیوب سمجھتے ہیں کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ انہیں انگریزی نہیں آتی۔ ہم نے یہاں ایڈیسن، نیوجرسی کی لائبریری میں کہہ کر اردو کتابیں رکھوائیں۔ کچھ مہینوں بعد کتابیں ہٹا دی گئیں۔ لائبریرین سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ایک کتاب بھی کسی نے ایشو نہیں کرائی۔ یہاں کین یونیورسٹی میں اردو کی بہت اچھی شاعرہ زریں یاسین اردو پڑھاتی تھیں۔ حکومت کی طرف سے گرانٹ بھی ملتا تھا۔ اردو کی تعلیم نہ صرف مفت تھی بلکہ اردو کلاسز لینے والے کو کریڈٹ بھی ملتے تھے جو اس طالب علم کا گریڈ بڑھانے میں مدد کرتے تھے۔ لیکن کوئی پاکستانی اردو داں طالب اردو بطور فارن لینگویج نہیں لیتا۔ نتیجتاً حکومت سے گرانٹ ملنا ختم ہو گیا اور اردو کلاسیں بند ہو گئیں۔ حکومت کا کہنا تھا کہ "جب کوئی بچہ اردو پڑھنے کو تیار ہی نہیں ہے تو ہم گرانٹ کیوں دیں؟ والدین کی منت سماجت کی گئی کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کلاسز لینے کی ترغیب دیں تو جواب ملا کہ "ہم اردو پڑھا کر کیا کریں گے؟ اگر ایسا ہی تھا تو امریکہ کیوں آئے، پاکستان میں ہی رہ جاتے؟" ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اردو پڑھانے سے ان کے بچوں کی انگریزی دانی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ الٹا ان کے کریڈٹس اچھے ہوں گے۔ مگر انہیں کون سمجھائے۔ آپ کو بتا دوں کہ ایڈیسن ہائی سکول میں ہندی بہ طور ایک سبجکٹ پڑھائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانیوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کے بچے ہندی پڑھنا چاہتے ہیں اور سینکڑوں بچے وہ مضمون لینے پر آمادہ تھے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ نیوجرسی میں تمام حکومتی خط وکتابت اور نوٹسز (notices) انگریزی کے ساتھ ساتھ گجراتی میں بھی لکھے جاتے ہیں۔ ہمارے دل پر بھی گھونسہ پڑتا ہے اور ہم دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

☆ سرمایہ دارانہ نظام مذموم مقاصد کے لیے ہر تھوڑے عرصہ بعد دنیا کے نقشے میں تبدیلی کیا کرتا ہے یقیناً مشرقی پاکستان بھی اُس سازش کے تحت بنگلہ دیش کی شکل اختیار کر گیا مگر اپنوں کی ناعاقبت اندیشیوں کی نشاندہی تو ہر صورت لازم ہے؟

☆☆ مغربی استعمار تو کبھی مسلمانوں کو پنپنے نہیں دے گا۔ سوال یہ ہے کہ ہم کتنے چوکس ہیں؟۔ ہم ہمیشہ یہ گلہ کرتے ہیں کہ ہم سازشوں کا شکار ہوئے، ہم میں غدار پیدا ہوئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہم سازشوں کا شکار ہوتے ہی کیوں ہیں؟ دوسرے کیوں نہیں ہوتے؟ مسلمان ہی کیوں ہوتے ہیں؟ علامہ اقبال نے پنجابی مسلمان کے بارے میں کہا تھا کہ "مذہب میں بہت تیزی پسند اس کی

طبیعت+کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد، تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا+ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد، تاویل کا پھندہ کوئی صیاد لگا دے+یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد"۔ یہ قول صرف پنجابی مسلمان پر نہیں دنیا کے تمام مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ مشرقی پاکستان صرف ہوس اقتدار کی وجہ سے بنگلہ دیش بنا۔ "چاہے ملک کے ٹکڑے ہو جائیں، مجھے تو اقتدار چاہئے!" اگر شیخ مجیب الرحمان کو انتخابات جیتنے کے بعد اقتدار سونپ دیا جاتا تو شاید بنگلہ دیش نہ بنتا۔ جنگ شروع بھی ہوگئی تو سیز فائر نہیں ہونے دیا گیا۔ بھٹو صاحب کو زکام ہو گیا اور وہ سیکیورٹی کاؤنسل کے اجلاس میں نہیں گئے اور پھر پولینڈ کی قرارداد پھاڑ کر پھینک دی۔ ہندوستان کو خوب وقت فراہم کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں ڈھاکے میں داخل کردے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ابھی میں وہیں تھا تو ایک پاکستانی فوجی سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے بتایا کہ "ہمیں آرڈر ملا کہ ہم اگلا مورچہ چھوڑ کر اس سے پچھلے والے مورچے کی طرف ریٹریٹ کر جائیں۔ جب ہم پچھلے مورچے پر پہنچے تو وہاں پہلے سے آرڈر موجود تھا کہ اس سے پچھلے والے مورچے کی طرف ریٹریٹ کرنا ہے۔ پھر اس سے پچھلے، اس سے پچھلے، یہاں تک کہ ہم ڈھاکہ پہنچ گئے۔ تو جناب جنگ تو ہوئی ہی نہیں اور تاریخ میں یہ بات ثبت ہوگئی کہ ۹۰ ہزار مسلمان فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ ۹۰ ہزار تھے بھی نہیں۔ ریگولر آرمی مشکل سے ۳۵ یا ۴۰ ہزار تھی اور باقی ان کے خاندان والے یا دوسرے سویلینز تھے جو جنگی قیدی بن گئے تھے۔ اور پوری دنیا میں پاکستان افواج کی بزدلی مشہور ہوگئی۔ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی کا رونا کہاں تک روئیے۔ پاکستانی تو ایسی قوم ہیں جنہوں نے اپنی صفائی میں نہ کچھ کیا نہ بولے۔

☆ بعد از کرونا کی دنیا کے خدوخال بلکہ ناک نقشہ اور اعمال وافکار آپ کے خیال میں کس طرح کے تراشے جارہے ہیں؟

☆☆ کرونا کے بعد دنیا یکسر بدل جائے گی۔ ابھی سے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں آنی شروع ہوگئی ہیں۔ امریکہ میں سپر مارکٹس بند ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ زیادہ تر خریداریاں اب آن لائن ہو رہی ہیں۔ سینما تھیٹرز جو کرونا کی وجہ سے بند ہو گئے اب کھلتے نظر نہیں آرہے ہیں۔ پہلے ہی لوگ نیٹ فلکس پر فلمیں دیکھنے لگے تھے اب تو یہ رجحان اور زیادہ ہو گیا ہے۔ محفلیں اور کانفرنسیں اب آن لائن ہی ہوا کریں گی۔ کرونا کے بعد سے زوم (Zoom) پر مشاعرے ہونے لگے تھے۔ اب اور زور شور سے یہ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ اس میں آسانی یہ ہے کہ آپ دنیا کے کسی حصے سے شاعر کو بلا لیجئے۔ نہ ہوائی جہاز کے کرائے کا خرچ اور نہ ہوٹل میں ٹھہرانے کا خرچ۔ اور بہ قول ایک صاحب کے نہ شاعروں کے ناز نخرے برداشت کرنے کی کوفت۔ لوگ تو اب کہتے ہیں کہ کرونا اگر چلا گیا پھر بھی آن لائن ہی مشاعرے کریں گے۔ حلقہ ارباب ذوق نیویارک زوم پر اب اپنا پندرہ روزہ اجلاس کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معمول کے اجلاس شروع ہو بھی گئے تو کم از کم مہینے میں ایک اجلاس وہ زوم پر کیا کریں گے۔ لوگوں کے میل جول کے طریقے بدل جائیں گے۔ ایک دوسرے سے ملنے میں لوگ احتیاط برتیں گے۔ مصافحہ یا معانقہ سے لوگ پرہیز کریں گے۔ ماسک کا استعمال عام ہو جائے گا۔ اب امریکہ کے بڑے بڑے فیشن کے ادارے ڈیزائنر ماسکس تیار کرنے لگے ہیں۔ کارپوریٹ امریکہ میں بہت سارے ملازمین سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ غیر معینہ مدت تک کے لئے گھر سے ہی کام کریں۔ اور یہ مدت شاید ہمیشہ کے لئے بڑھ جائے۔ کمپنیاں آفسز کے کرائے، فرنیچر اور پانی وبجلی کے اخراجات سے بچیں گی۔ کمیونیکیشن اتنا آسان ہو گیا ہے کہ آپ اپنے کولیگز سے کمپیوٹر پر یوں باتیں کرتے ہیں جیسے وہ سامنے ہوں۔ ایک دو نہیں پچیس تیس آدمیوں کی میٹنگز زوم پر یا گوگل میٹ پر ہوتی ہیں جن میں تمام شرکا ایک دوسرے کو دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ تو جناب اب یہ دنیا "وہ" دنیا نہیں رہی۔

☆ لاکھوں کروڑوں تارکین وطن بالخصوص پاکستانیوں کی آل اولاد کا مستقبل بھی فکرمندی کو دعوت دے رہا ہے؟

☆☆ تارکین وطن بالخصوص پاکستانیوں کا مستقبل مجھے تو فکرمند کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہاں آنے کے بعد ہم سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے اپنے بچوں کو اپنی زبان نہیں سکھائی۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں جو بچے پیدا ہوئے وہ اب بیس سال کے ہو چکے ہیں اور انہیں اردو نہیں آتی۔ انہیں تو چھوڑیں جو لوگ ستر/اسی دہائی میں آئے ہیں ان کے بچے اب ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے ہیں اور اردو سے نابلد ہیں۔ جب اپنی زبان نہ رہی تو اپنی تہذیب اور اپنا مذہب بھی گیا۔ جو بچے اردو نہیں جانتے اور عربی اتنی جانتے ہیں کہ اٹک اٹک کر قران شریف پڑھ لیں، وہ اپنی آنے والی نسلوں کو کیا اسلامی تعلیم دیں گے۔ دوسری بات یہ کہ پاکستانی لڑکے لڑکیاں اب دوسرے مذاہب کے لوگوں سے شادیاں کر رہے ہیں۔ آپ انہیں کیسے روکیں گے؟ وہ اسکول اور کالج میں ان کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کشش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس پر یہاں کا ماحول۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد ماں باپ بچوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ اگر روکتے ہیں تو بچے گھر سے چلے جاتے ہیں۔ مگر امید کی کرن اب بھی باقی ہے۔ بہت سے گھرانوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا ہوا ہے۔ ان کے بچے دین پر قائم ہیں۔ بہت سارے اسلامی اسکول اور ادارے قائم کیے گئے ہیں جو بچوں کو اسلامی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی زبان نہیں بھی جانتے تو انہیں انگریزی میں اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔ پاکستانیوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بچوں سے اردو بولیں اور انہیں اردو کی تعلیم دیں۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ دو زبانیں جاننے والے بچے ایک زبان والوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہو سکتا ہے اگر والدین اجتماعی طور پر بورڈ آف ایجوکیشن جا کر درخواست دیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے ہیں۔ اگر مناسب تعداد میں اردو تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا جمع ہو جائیں تو اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اساتذہ بھی رکھے جا سکتے ہیں اور حکومت گرانٹ بھی دیتی ہے۔ ضرورت ہے صرف جذبے کی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہماری آئندہ نسلیں دوسروں میں ضم ہو جائیں گی اور پھر ہمارا نام لیوا کوئی نہیں رہے گا۔

''بشر کی اساس''

(جمیل خان کے سخن دلپزیر سے کشید)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

☆

ادائے خوش نگاہی کو اداسی چھین لیتی ہے
غریبی آدمی سے خود شناسی چھین لیتی ہے

اُڑا دیتا ہے فاقہ زندگی کا رنگ چہرے سے
بدن کی دلکشی کو بے لباسی چھین لیتی ہے

فنا کر دیتا ہے افلاس احساسِ لطافت کو
ادا شائستگی کی بدحواسی چھین لیتی ہے

خودی کی اک رمق انسان میں رہنے نہیں دیتی
بشر سے اس کی ہر فکرِ اساسی چھین لیتی ہے

.....○.....

☆

میں نے کہا کہ زندگی اتنی کٹھن ہے کیوں
پُر خار راستوں پہ مسلسل چبھن ہے کیوں

کیوں دوستی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا
رہبر سرشت میں مثالِ راہزن ہے کیوں

راہِ وفا میں چھائی اُداسی ہے ہر طرف
دامِ فریب راستے میں خیمہ زن ہے کیوں

مظلوم کی پکار اثر چھوڑتی نہیں
یزداں خموش، تیز بہت اہرمن ہے کیوں

ماں باپ کا لحاظ دلوں میں نہیں رہا
اولاد ان کے آگے دریدہ دہن ہے کیوں

شائستگی لباس کی جاتی رہی ہے اب
جسموں کے بھید کھولتا یہ پیرہن ہے کیوں

تیرہ شبی ہمارا مقدر ہے کس لیے
ہم سے گریزاں نور کی ہر اک کرن ہے کیوں

ظلِّ ہما نصیب میں اپنے نہیں رہا
کرگس ہمارے شہروں پہ سایہ فگن ہے کیوں

رشتوں کی اہمیت کسی دل میں نہیں رہی
ہر شخص اپنی ذات کے اندر مگن ہے کیوں

☆

دعائیں جتنی بھی مجھ کو ہیں ازبر، بھول جاتا ہوں
سلیقہ مانگنے کا اس سے اکثر بھول جاتا ہوں

جو دیواروں پہ لکھّے ہیں نوشتے، پڑھ تو لیتا ہوں
مگر کیا کیجیے میں ان کو پڑھ کر بھول جاتا ہوں

محبت سے کہے جملے ہمیشہ یاد رہتے ہیں
عناد و بغض کی باتیں میں یکسر بھول جاتا ہوں

چلاتا ہے کوئی جب طنز کے نشتر مرے دل پر
میں تھوڑے ہی دنوں میں زخم کھا کر بھول جاتا ہوں

ملاتا ہوں خلوصِ دل سے اپنا ہاتھ میں سب سے
کبھی ان آستینوں میں تھے خنجر، بھول جاتا ہوں

میں حق گوئی کا عادی ہوں اور اس عادت کے بدلے میں
برستے ہیں جو مجھ پر، میں وہ پتھر بھول جاتا ہوں

مرے اللہ! میرے شہر میں مجھ کو اماں دے دے
بھٹکتا ہوں میں ویرانوں میں اور گھر بھول جاتا ہوں

نکلتا ہوں میں سَر دینے، مگر جب وقت آتا ہے
میں دے کر دست در دستِ عدو، سَر بھول جاتا ہوں

بلند آہنگ ہوتا جا رہاہوں — حریفِ چنگ ہوتا جا رہا ہوں
جو شیشہ مجھ سے ٹکرایا، وہ ٹوٹا — مثالِ سنگ ہوتا جا رہا ہوں
کئی جہتیں ہیں میرے فکروفن کی — میں اک ارژنگ ہوتا جا رہا ہوں
سفیرِ امن ہوں دنیا میں، لیکن — اسیرِ جنگ ہوتا جا رہاہوں
مرے ہمزاد کا دم گھُٹ رہا ہے — میں اتنا تنگ ہوتا جا رہا ہوں
نہ غم کی لَو، نہ احساسِ خوشی ہے — بہت بے رنگ ہوتا جا رہا ہوں

☆

اس نے کہا کہ راستے پُر خار کیوں ہوئے؟
وہ اس لیے کہ باغ لگائے نہیں گئے
تم دوستی کی بات تو کرتے ہو میرے یار
پر دشمنی کے اب بھی وہ سائے نہیں گئے
راہِ وفا میں کوئی تمہیں کس طرح ملے
اس رہ گزر پہ تم کبھی آئے نہیں، گئے
یزداں نے خیر وشر کے دو رستے دکھا دیئے
تم تو کہیں بھی شر کے سوائے نہیں گئے
اولاد کی شکایتیں کرتے ہو تم مگر
تم سے فرائض اپنے نبھائے نہیں گئے
ورثے کو منتقل تو کیا ہوتا، کیا تمہیں
آدابِ زندگی کے سکھائے نہیں گئے؟
تم نے تو خود ہی اپنے چراغوں کو گل کیا
تم علم کے قریب بھی پائے نہیں گئے
پہلے تو موت بانٹی، پھر اب کہہ رہے ہو تم
شہروں میں اپنے فاختے، ہائے، نہیں گئے
گدھ ہی وہاں ملیں گے کہ جس شہر میں جناب
نغمے کبھی بھی پیار کے گائے نہیں گئے
اپنوں کا حق تو شاید ادا بھی کرو گے تم
لیکن تمہارے دل سے پرائے نہیں گئے

چشمِ پُر نم! یہ تری شبنم فشانی کب تلک
دل کو خوں کرتا ہوا سوزِ نہانی کب تلک
کب ہوائیں لے کے آئیں گی پیامِ زندگی
ہر نفس سے موت کی یہ ترجمانی کب تلک
کب تلک معصوم جانیں تلف ہوتی جائیں گی
منعموں کی دہر میں ریشہ دوانی کب تلک
آسمانوں سے برستی ناگہانی موت پر
آدمیت شرم سے ہو پانی پانی کب تلک
کب تلک محروم رکھے گا شرابِ زیست سے
ساقیِ دوراں! تری نامہربانی کب تلک
اے امیرِ کارواں! کب آئے گی منزل، بتا!
کب تلک بھٹکے گی یونہی زندگانی، کب تلک
ظالموں کے سامنے مظلوم رٹتے جائیں گے
''مہربانی، مہربانی، مہربانی'' کب تلک
آشیاں کو غیر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر
طائرِ لاہوت کی نقلِ مکانی کب تلک
اپنی بردباری کا رونا ہم سے، اے بلبل! نہ رو
ہم سنیں گے تیری فرسودہ کہانی کب تلک
اپنے لفظوں کی فسوں کاری سے آگے بھی نکل
اے مقرر! تیری یہ شعلہ بیانی کب تلک
بزمِ آب وگل میں کوئی کارنامہ خود بھی کر
اپنے آبا کی دکھائے گا نشانی کب تلک
ہم بھی اپنی کوششوں سے باز آنے کے نہیں
دیکھیں منہ پھیرے گی ہم سے کامرانی کب تلک

افسانوں میں مقیّد ایک دن

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

(●)

یہ پاکستان کا سالِ جشنِ طلائی ہے اور اسی سال جلا وطن کہانیاں شائع ہورہی ہیں۔اس سال پاکستان کے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوں گی اور کچھ ہوچکی ہیں۔پاکستان کی تاریخ سے متعلق،اس کے مختلف ''ادوار'' کے بارے میں، پچاس سال میں کئی ادوار۔۔۔! وقت کی رفتار کتنی تیز ہوگئی ہے۔ پہلے تو چھوٹے سے چھوٹا دور پچاس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہوتا تھا اور اب وقت ہماری طرف دیکھے بغیر اُڑا جا رہا ہے اس دن میری چھ سالہ پوتی کہہ رہی تھی: ''دادا! دن اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟'' اس کا پیمانہ تو بس ایک دن ہے اور پیمانہ بدل جائے تو وقت کی پیمائش کچھ یوں کی جاتی ہے:

سیّاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
ہیں موڑ پہ صدیوں کے، دن ایک مہینے کے
(فراق)

لیکن بعض دن گزرنے کے بعد بھی نہیں گزرتے۔ ۱۶۔دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن۔۔۔ یوسف ظفر نے اس دن کے گزرنے کی تمنا کی اور خود دنیا سے یہ کہتے ہوئے گزر گئے:

گزرتا وقت، گزرتا نہیں قیامت ہے

اور جمیل عثمان کے لیے، میرے لیے، میری نسل کے لوگوں کے لیے، وہ دن ابھی تک موجود ہے۔۔۔اور ایسے بھی ہیں جو ہنگامۂ سود و زیاں میں اس دن کی یاد کو خسارے کا سودا سمجھتے ہوئے نشاطِ امروز میں گم ہوگئے ہیں۔

جمیل عثمان نے اس دن کو اپنے افسانوں میں مقید کر دیا ہے۔ وہ دن، جس کے سائے اس سے پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی یادوں کا سلسلہ ہے۔ یہ ان چہروں کا نقش ہے جو سدا ہماری آنکھوں کے سامنے آتے جاتے رہیں گے۔اس مجموعے کا نام اس درویشِ خوش اداو خوش نفس کی یاد دلاتا ہے جس نے جلاوطنی کی زندگی گزاری اور پھر نفسِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے وطن لوٹ گیا۔

نہیں ہے چین مجھے تیرہ خاک داں میں منیرؔ
مرے خمیر میں ہے ایک نور افلاکی

جی ہاں سراج منیر نے ان کہانیوں کو ''جلاوطن کہانیاں'' کا نام دیا تھا اور منیر نے دردِ ہجرت کو دردِ ہجر بنا دیا تھا۔۔۔اجتماع ذات میں اور ذات اجتماع میں گم ہوگئی تھی۔

آنکھ لگنے دی نہ دردِ ہجر نے پل بھر کبھی
یہ خزانہ تھا، میں اس کی پاسبانی میں رہا

سراج منیر زندہ ہوتے تو میں کہتا کہ ''کہانیاں'' کے لفظ کو ''قصے'' میں بدل دو۔جلاوطن قصّے۔ق ص ص۔اس مادہ کے معانی میں کسی چیز کی جستجو کرنا، کسی کا پیچھا کرنا، اور واقعات وحقائق کو پیش کرنا شامل ہیں۔اہم خبر اور واقعہ کی اطلاع دینا بھی قصہ کے مفہوم میں شامل ہے۔قرآن حکیم نے اس لفظ کو بہت محترم بنا دیا ہے حضرت یوسفؑ کی حیات کو ''احسن القصص'' قرار دیا گیا۔اصحابِ کہف کے واقعہ کو بھی قصہ کہا گیا۔

جمیل عثمان کی یہ کہانیاں حقیقتوں کی بنیاد پر قائم ہیں۔یہ بات قرآنِ حکیم اور اس کے قصّوں کے مطالعے سے انہیں حاصل ہوئی ہے۔ان کے کردار خواب اور بیداری کے درمیان اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ پاکستان کا خواب حقیقت بنا، مگر پھر اس کی تعبیر کو ہمارے اعمال نے بدل دیا۔ یہ ساری کشمکش جمیل عثمان کی کہانیوں میں ملتی ہے۔ان کہانیوں کی کئی سطحیں اور تہیں ہیں۔ہم تو وہ ہیں کہ ابھی ہماری آنکھوں میں ہسپانیہ کے سقوط پر بہنے والے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے ہیں اور ہم میں وہ بھی ہیں جو مشرقی پاکستان کو ایک بوجھ سمجھتے تھے اور سقوط کے بعد جن کا ردِعمل یہی تھا کہ ''بنگالیوں سے پیچھا چھٹا۔''

جمیل عثمان ان واقعات کے راوی، شاہد اور مبصّر ہیں جو ان قصوں کے قالب میں ڈھل گئے، وہ ان کہانیوں کا کردار ہیں اور کئی کرداروں میں شامل ہیں، ادب میں افسانوں کے ایک کردار میں کئی شخصیتوں کی نمود ایک معلوم حقیقت ہے، وہ ان واقعات سے قریب بھی رہے ہیں اور دُور بھی ہیں۔ان کا تجربہ حقیقی اور شخصی ہے اور وہ اس تناظر کے مالک بھی ہیں کہ تمام واقعات اور ہر بیتے ہوئے لمحے کو دیکھ سکیں، کسی تصویری نقش (پینٹنگ) کو دیکھنے کے لیے تصویر سے مناسب فاصلہ لازم ہے ورنہ نقوش، خطوط اور رنگ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔جمیل عثمان نے خاصا وقت بیتنے کے بعد یہ کہانیاں لکھی ہیں۔۔۔ وہی بات پڑھنے والے تک پہنچانے کے لائق ہوتی ہے جس کے خطوط اور یادیں وقت گزرنے کے بعد مدھم نہ ہوں اور جس کی معنویت بیتے ہوئے لمحوں کے ساتھ بڑھتی رہے۔

گوئٹے، نے وقت کی امواج رواں پر اپنا نام لکھ دیا ہے۔اس نے کہا تھا کہ ہر لکھنے والے کو اور ہر اس شخص کو جو ادیب بننا چاہے یہ تین سوال اپنے سامنے رکھنے چاہئیں۔

کیا میرے پاس کچھ کہنے کو ہے؟
اور جو کچھ مجھے کہنا ہے، وہ اس قابل ہے کہ کہا جائے؟
اور میں جس بات کو کہنے کے قابل سمجھتا ہوں اسے کس حد تک حُسن سے بیان کرسکتا ہوں؟

مجھے یقین ہے کہ جمیل عثمان نے اپنے آپ سے یہ سوال کیے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان ہی لفظوں میں کیے ہوں، یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک ساتھ یا اسی ترتیب کے ساتھ کیے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہانی لکھنے کے بعد اس کو پڑھتے ہوئے انہوں نے یہ باتیں اپنے آپ سے پوچھی ہوں، مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ

خود احتسابی اور اپنے آپ سے سوال کے ان مراحل سے ضرور گزرے ہیں۔ افسانے لکھنے والا زندگی کے ہر واقعے بلکہ ہر لمحے کو ایک قائم رہنے والی تصویر کے روپ میں دیکھتا ہے اور انسانی رویے کی گہری تفہیم کا مالک ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے المیے کو عظیم ناول میں ڈھالا جا سکتا ہے، طویل نظم کا روپ دیا جا سکتا ہے، اور تو اور غزل کے اشعار میں اس المیہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لوگ تنگ نائے غزل کا ذکر کرتے ہیں اور سند غالب کی لاتے ہیں۔

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل

یہ بیچارے غالب، غزل، فکرِ شاعرانہ، اور تاریخ و پس منظر سے بیک وقت ناواقف ہیں۔ غالب نے تو تجمل حسین خان کے قصیدے سے جان چھڑانے کے لیے غزل کے چند اشعار میں ان کی مدح کی اور پھر اس عذر کا سہارا لیا۔ وہ غزل کو بقدر ذوق نہ پاتے تو انہیں مثنوی کہنے سے کس نے روکا تھا؟ غالب نے تو تخیل کے گلشنِ نا آفریدہ کو اپنی گرمیِ نشاطِ تخیل سے موجود اور آفریدہ حقیقت بنا دیا۔

اسی طرح اپنی حدود اور اختصار کے باوجود افسانہ عظیم موضوعات کا بوجھ سہار سکتا ہے۔ بہت سے اہم موضوع افسانے مل کر ایک میورل کی تخلیق کرتے ہیں۔ میورل کی اپنی وحدت مسلم، لیکن یہ وحدت کئی تصویروں کو ایک تصویر بنا کر حاصل کی جاتی ہے۔ کلیساؤں کی دیواروں اور چھتوں کے میورل تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ہمارے مصوروں بالخصوص صادقین نے کئی طاقت ور میورل بنائے ہیں۔ اب تو آپ کو کراچی کے بعض ہسپتالوں کی بیرونی دیواروں پر دیواری تصویری سلسلہ نظر آئے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ تصویریں سینما کے بورڈ بنانے والوں نے بنائی ہیں۔۔۔!

جلاوطن کہانیاں ایک ادبی میورل ہے اور ہمیں جمیل عثمان کو ان کی ہمت اور محنت پر داد دینی چاہیے۔ اس بات کو ختم کرتے ہوئے میں اس نکتے کو مختصراً دہرا دوں کہ بے شک بعض ادبی اصناف میں وسعت زیادہ ہوتی ہے لیکن غزل اور افسانے کی وسعتیں بھی ہماری زندگی کی خوشیوں اور غموں کا احاطہ کر سکتی ہیں اور ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم فنکاروں کو یہ ہدایت نامہ جاری کریں کہ وہ کس صنف کے ذریعہ اپنا اظہار کریں۔

میں نے گزشتہ دس برس میں فن اور اس کے گہرے معانی کو اطہر نفیس کے اس شعر کے حوالے سے پیش کیا ہے:

خود اپنے ہی باطن سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

افسانہ کی صنف جمیل عثمان کی ذات کی گہرائیوں سے ابھرنے والا موسم ہے اور اس موسم میں رنگوں کے ساتھ ساتھ دل پر چھائے ہوئے غموں کے بادل، آنکھوں کی برسات اور دور افق پر امید کی قوسِ قزح کا منظر بھی شامل ہے۔

میں نے کوشش کی کہ جلاوطن کہانیاں ایک ساتھ پڑھ سکوں۔ ایک نشست میں، لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ کچھ لوگ کہا جاتا ہے کہ دیدۂ غیر سے اپنا نظارہ کرتے ہیں۔

دیدۂ غیر سے کرتا ہوں نظارہ اپنا
اپنے زخموں کی جراحت ہے تماشا مجھ کو

یہ شعر اگرچہ میرا ہی ہے مگر میں قومی سطح پر اس تماشے کا متحمل نہیں ہو سکا۔ شاید ذاتی غموں کے باب میں یہ بات درست ہو، مگر میں اپنے قومی وجود کے ان زخموں کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا جو کبھی مندمل نہیں ہوں گے۔ اگرچہ زخمی بازو کٹ چکا ہے۔ اچھا اور بڑا ادب پڑھنے کے لیے جذباتی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت اور توانائی بھی ضروری ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے لیے ان کہانیوں کا پڑھنا شروع شروع میں بہت مشکل ثابت ہوا، مگر پھر میں نے بہادر کرداروں سے بہادر لی، محمد آصف اور ان کی بیگم، ان کی بیٹیوں راشدہ اور خالدہ اور ان کے بیٹے عادل نے مجھے ظالموں سے مقابلہ کا حوصلہ دیا۔

حضرت بلالؓ کے بارے میں ایچ، اے، ایل کریگ نے ایک خوبصورت کتاب لکھی ہے جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان میں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا گیا ہے مسلمانوں پر کیسے کیسے مظالم نہیں ڈھائے گئے، مگر ان کا وجود مضبوط تر ہوتا گیا:

''ہم جس طرف بھی جاتے مصائب کا سامنا ہوتا۔ ہم نے آسمان کی طرف دیکھا، لیکن موسیٰ کی طرح ہم پر من وسلویٰ نہیں اترا۔ ہم برداشت کرتے رہے اور ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ اگر ظلم کسی انسان کی کمر نہیں توڑتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کر دیتا ہے شاید یہ عطیہ من وسلویٰ سے زیادہ بہتر تھا''

(ترجمہ: سید سجاد باقر رضوی)

مجھے اس معجزہ اور عطیۂ خداوندی کا تسلسل ''جلاوطن کہانیاں'' میں نظر آتا ہے۔ یہاں ظلم سے نہتے انسانوں کا مقابلہ زندگی کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے جس طرح اصحابِ کہف کا کروٹ بدلنا زندگی کی علامت تھا اور وہ کروٹ خود کب بدلتے تھے، انہیں کروٹ بدلوائی جاتی تھی۔

میں نے جس کہانی کے کرداروں کا حوالہ دیا ہے اس کا عنوان ہے: ''خالی ہاتھ'' میں نے اس مجموعے کی کہانیوں کو ایک خاص ترتیب دی تھی ایسی ترتیب جس نے اس المیہ کو تسلسل دے دیا تھا۔ افسوس وہ تحریر ضائع ہو گئی اور اب اس مشق سے دوبارہ گزرنا میرے لیے ممکن نہیں اور اس لمحے یہ خیال بھی ذہن میں آ رہا ہے کہ آپ کسی ترتیب سے انہیں کہانیوں کو پڑھیں، مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی کہانی کی معنویت متاثر نہیں ہوگی۔

''خالی ہاتھ'' ۱۰۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کی رات کی کہانی ہے، جب مشرقی پاکستان کی پہلی برسی میں چند دن باقی تھے۔ یہ کہانی ۱۱۔ دسمبر کی صبح کو اپنے اختتام کو پہنچتی ہے جب یہ گھرانا کلکتہ کے لیے روانہ ہوتا تا کہ نیپال کے راستے پاکستان پہنچ سکے اور ''طیارے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس خاندان کے ہر فرد کے ہاتھ خالی تھے۔'' جمیل عثمان نے بے حد مال دار ہاتھوں کو ''خالی ہاتھ'' کہا ہے۔ اس

خاندان کے ہاتھوں میں وہ قوت تھی جس نے بچیوں کی عصمت کی حفاظت کی اور ذات کے نگینے کو چکنا چُور نہیں ہونے دیا، یہ علامتی عنوان ہمیں لفظ ''خالی'' کی ایک نئی معنویت کی تلاش کا راستہ دکھا رہا ہے۔

یہی غربت، دنیا کی سب سے بڑی متاع کی صورت اس مجموعے کی ایک اور کہانی ''احساس'' کے مطلع سے سورج بن کر ابھری ہے۔ جلیل کو مکتی باہنی کے رضا کاروں نے ''جئے بنگلہ'' کا نعرہ لگانے کا حکم دیا۔ یہ نعرہ ہی اسے زندگی کی خیرات دے سکتا تھا۔ ''جلیل کے انکار پر اسٹین گن کا کندا اس کے منہ پر پڑا۔ ہونٹ پھٹ گئے اور ان سے خون جاری ہو گیا۔'' جلیل گرا اور پھر اٹھ بیٹھا۔

''بولے گا؟'' اسٹین گن والے نے پھر پوچھا تھا۔

''ہاں بولے گا''۔۔۔ جلیل نے کہا اور ساتھ ہی اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا ''پاکستان زندہ باد'' عارفہ ششدر رہ گئی اور مکتی باہنی والے بھی حیرانی سے جلیل کو دیکھنے لگے۔

یہی وہ قوت ہے جو من وسلویٰ سے بہترین تحفہ ہے۔ جلیل تو زندگی کے بندھن سے آزاد ہو گیا مگر عارفہ اور اس کے بیٹے کو تو پاکستان آ کر پاکستانی ہونے کی قیمت ادا کرنی تھی اور عارفہ نے اپنے عمل اور دیانت سے پاکستانیت کو ایمان کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس نے اپنے بچّے کو حرام کے لقمے سے بچایا کہ رزقِ جلیل ہی آزاد وطن سے وابستگی کا سب سے پہلا اعلان ہے اور اسی کی خاطر آزادی حاصل کی جاتی ہے۔ اگر لقمہ حلال رزق کا نہ ہو تو عبادت بھی منافقت بن جاتی ہے۔

جمیل عثمان کی یہ کہانیاں یک رخی نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ ان کی واردات کا حصہ ہیں اور ان کا مقصد کسی قسم کا پروپیگنڈا یا کسی مقصد کا حصول نہیں، ہاں ان کا ایک مقصد ضرور ہے اور وہ ہے دیوار میں در پیدا کرنا۔ ہم جس ماحول میں سانس لے رہے ہیں اس میں دردمندی، زندگی اور معاشرے سے بھاگ کر لغت کے صفحات پر آباد ہو گئی ہے جمیل عثمان اسی کھوئی ہوئی دردمندی کو لغت کے صفحات سے ہماری زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں کیونکہ یہی زندگی کی بہت سی اعلیٰ قدروں کا سرچشمہ ہے۔

جلا وطن کہانیاں صرف ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے پس منظر میں نہیں لکھی گئی ہیں۔ یہ ایک رستے بستے، ہنستے روتے معاشرے کی کہانیاں ہیں جس کے رہنے والوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وقت اور ملّی شعور نے گوندھ دی تھیں اور پھر بس کچھ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ زلزلہ آتا ہے تو کیسی کیسی بستیاں خرابوں کا لباس اوڑھ لیتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ یہاں گھروں میں چولھے جلتے تھے اور شام ڈھلے ان کا دھواں خنک ہوتی ہوتی فضا میں شامل ہو کر سانس لینے لگتا تھا اور بچّے کھیلتے تھے، کہانیاں سنتے تھے، نوجوان آنکھیں خوبصورت چوریوں میں مصروف ہوتیں، اور ہونٹوں کے گلاب اُدھ کھلی کہانیاں سناتے، جمیل عثمان کے یہ افسانے ان فضاؤں اور ان ہونٹوں اور ان آنکھوں کے صحیفے ہیں جو کھوئیں جو چُپ ہو گئے اور جو بند ہو گئیں۔ ان کہانیوں میں باشار چاچا ہیں، اسی گندھے ہوئے سماج کے ترجمان اور وہ کشتی بان بھی جس نے اپنی دعاؤں کے سائے میں اپنی کشتی کے ذریعہ سفرِ ہجرت اختیار کرنے والوں کو ساحلِ عافیت تک پہنچایا۔ پُتلی بی بھی ہے جو راتوں کو ان لمحوں میں آپ کی آنکھوں پر آ کر بیداری کی دستک دے گی، جب آپ نیند کے کانٹوں کو اپنی آنکھوں پر اُگتے ہوئے محسوس کر رہے ہوں گے۔

میں نے افسانے کی تنقید میں ہمیشہ کہانیوں کے خلاصے بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ تنقید ان کے لیے ہوتی ہے جو کتاب کو پڑھیں اور یہ تو کتاب کا پیش لفظ ہے۔ میں ان تاثرات کو جمیل عثمان کی کہانی ''پرچمِ ستارہ و ہلال'' کے ذکر کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ پرچمِ ستارہ و ہلال ہماری مملکت اور ہماری خود مختاری کی علامت ہے اور یہ پرچم ان کے لیے زیادہ محترم ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کو اپنا شخصی تجربہ بنا لیا تھا۔ صفی اللہ کی بیوی زرینہ بیگم نے تحریک پاکستان کے دوران والدین کی شہادت کو نظارہ کیا تھا اور ان کی چھوٹی بہن نگینہ زندہ آگ میں ڈال دی گئی تھی۔ ''زرینہ بیگم نے بڑی ثابت قدمی سے غم کو سہ لیا تھا۔ صرف قائداعظم کے پاکستان کی خاطر۔''

قائداعظم کا تذکرہ ایک پوری نسل کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ نسل جس نے پاکستان کی منزل کو تاریخ کی شاہراہ پر آہستہ آہستہ اپنی طرف آتے دیکھا تھا، اور جب پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تو وہ گھڑی آئی جب لوگوں نے پاکستانی پرچموں کو اپنے گھروں میں جلانا شروع کر دیا کیونکہ مکتی باہنی والوں نے پاکستانی پرچم کو موت کا پروانہ قرار دے دیا تھا۔ زرینہ بیگم نے اپنے شوہر صفی اللہ کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ پاکستانی پرچم جلا دیا جائے۔ مکتی باہنی والے گھر میں داخل ہوئے انہیں پرچم نہیں ملا۔ زرینہ بیگم نے پرچم کو جزدان بنا کر قرآن حکیم کو اس میں لپیٹ دیا تھا۔ مکتی باہنی کا ایک رضا کار بولا ''امی دیکھو'' (میں دیکھوں گا) اور یہ کہتے ہوئے اس نے قرآن حکیم کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر زرینہ بیگم نے کلام اللہ کو اپنے ہاتھ کے حصار میں لے لیا اور آخر رضا کار کے ساتھی نے کہا ''رہنے دو، رہنے دو'' اور وہ گھر سے نکل گئے۔

''زرینہ بیگم نے ایک سسکی لی، انہوں نے کلام پاک پر اپنے لب رکھ دیئے اور ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ٹپک کر اس پرچم میں جذب ہو گئے جس میں قرآن پاک لپٹا ہوا تھا''

زرینہ بیگم کا یہ عمل ہم سب کے لیے بے لفظ وصوت پیغام ہے۔ یہ وطن، یہ پرچمِ ستارہ و ہلال کا پاکستان، قرآن حکیم کو اپنے حصار میں لینے اور قرآن پاک کو اپنا حصار بنانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ زرینہ بیگم کی نسل اور ہماری نسل کے اسلوب فکر سے اس کہانی کے تار پود بُنے گئے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے المیہ پر کئی اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان اور مغرب میں۔۔۔ لیکن آج کے پاکستانی شہری اور ہماری آنے والی نسلیں جمیل عثمان اور ان جیسے دوسرے تخلیقی فن کاروں کی تحریروں کے آئینے میں اس المیہ کے خدوخال اور نقوش کا حقیقی اور گہرا مطالعہ کر سکیں گی۔ ادب، زندگی کا سب سے معتبر اور سچا آئینہ ہے۔

طلوع ہوتی ہوئی مسکراہٹ

انور سدید

(●)

جمیل عثمان سے میری پہلی ملاقات ان کے افسانوں کی کتاب ''جلاوطن کہانیاں'' کے ذریعے ہوئی۔ یہ کہانیاں سقوط ڈھاکہ کے پس منظر سے ابھری تھیں جو ہماری قومی تاریخ کا سب سے المناک باب ہے۔ان کہانیوں میں متعدد ایسے کرداروں کا ذکر دلِ پُر درد سے کیا گیا تھا جو بقول جمیل عثمان قتل بھی نہیں ہوتے اور زندہ رہنا بھی جن کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ جان بچانے کے لیے ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں، یہ ایسے ہی لوگوں کی کہانیاں ہیں جو جرمِ وفا کے سزاوار ٹھہرے اور جنہیں:

''کبھی دوستوں نے لوٹا، کبھی دشمنوں نے مارا''

جمیل عثمان جب اپنے دوستوں کی منفی تنقید کی زد میں تھے اور اکثر سنتے تھے کہ یہ کیا تم ہر وقت مشرقی پاکستان کو لیے بیٹھے رہتے ہو، تو اس نے اپنے بارے میں ایک بات تو یہ کہی کہ:

''شاید میرے حصے میں مشرقی پاکستان کا ماتم آیا ہے۔''

اور دوسروں کی طرف رخ کیا تو کہا:

''یہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ سارے پاکستانی اس پر ساری عمر بھی روتے رہیں تو کم ہے۔''

ان دو جملوں نے میرے ذہن میں جمیل عثمان کی شخصیت کا ایک نقش مستقل طور پر ثبت کر دیا کہ زندگی کی گوناگوں اور متنوع حقیقتوں میں سے المیہ حقیقتیں ان کے باطن میں کہرام برپا کر دیتی ہیں اور جب تک ان خونچکاں حقیقتوں کو تمام تر جراحتوں کے ساتھ افسانے کا روپ نہ دیں انہیں داخلی ''کیتھارسس'' نصیب نہیں ہوتا۔

میرے کرم فرما کلیم چغتائی صاحب نے ان کی کتاب ''پری خانے کا مسافر'' کا مسودہ عنایت کیا تو اس کے پہلے مضمون ''شین قاف'' کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوا کہ جمیل عثمان کی پلکوں پر ۱۹۷۱ء سے جو آنسو اٹکے ہوئے تھے، اچانک ستاروں کی طرح مسکرانے لگے ہیں۔ مجھے ان کی کیفیت غالب کے اس مصرعے کے مصداق نظر آئی:

''مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں''

اور پھر میں اس کتاب کے باطن میں جتنا گہرا اترتا گیا، اتنا ہی لفظ کے گنجینۂ معنی کا طلسم کھلتا گیا اور واقعات کی ظرافت، کرداروں کی اس بوالعجبی کو ابھارتی چلی گئی، جس سے خود کردار قطعاً نا آشنا تھے، لیکن جمیل عثمان کی چشم مشاہدہ بیں سے ان کی فطری ناہمواریاں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ مجھے ان کی تخلیقی شخصیت کا یہ زاویہ انوکھا محسوس نہیں ہوا بلکہ مجھے اس وقت انجم اعظمی (مرحوم) یاد آئے جن کا ارشاد ہے کہ:

''ذاتی پیکار اور الجھنوں سے گزر کر ہی ادب اور زندگی کی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ غم اور خوشی کا سلیقہ بھی اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب جذبوں کے بھنور میں ڈوب کر کوئی ابھر آیا ہو۔ اس وقت آنکھ کا قطرہ سمندر اور ہنسی سورج بن جاتی ہے''

جمیل عثمان نے ''جلاوطن کہانیاں'' لکھی تھی تو وہ حقیقت فراموش قوم کا ایسا فرد تھا جو غم کے سمندر میں مسلسل غوطے کھا رہا تھا لیکن جب اس نے بیرونی دنیا کا سفر اختیار کیا تو اس پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ ایسے کو زندگی پر مستقل ثبت کرنے کی بجائے اسے سلیقے سے برداشت کرنے اور نئی زندگی اور نئی توانائی حاصل کرنے کے لیے ایسے پر مسکرانا بھی ضروری ہے۔ اس نقطے کا اثبات اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ جب وہ جلاوطن کہانیاں لکھ رہا تھا تو بنگلہ دیش ایک مملکت بن چکا تھا اور پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اس نئے ملک کو جو کبھی قائد اعظم کے پاکستان اور دایاں بازو تھا اور مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم ہوتا تھا تسلیم بھی کر چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''بہادر انسان وہ ہوتا ہے جس میں بدلہ لینے کی قوت موجود ہو لیکن وہ بدلہ لینے کی بجائے معاف کر دے اور ہنسنے کا سلیقہ بھی معاف کر دینے کے بہترین حوصلے سے پیدا ہوتا ہے۔'' لیکن یہ اعتراف ضروری ہے کہ ہم میں مکتی باہنی اور اس کی سرپرست غیر ملکی حکومتوں سے بدلہ لینے کی قوت موجود نہیں تھی، مشرقی پاکستان کے مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کی بجائے ''فوجی آپریشن'' اختیار کیا گیا تو ہمیں اپنوں کے ہاتھوں منہ کی کھانی پڑی۔ اس شکست نے فوجی حکمرانوں اور سیاستدانوں کے خلاف جو رویہ پیدا کیا اس نے پاگلوں کی ہنسی کو بیدار کیا، تاہم ہمارے چند افراد نے اس بے تحاشا قہقہے کو ناہمواریوں کے ادراک کے لیے استعمال کیا تو ان کی مسکراہٹ میں رحمتِ عام کا زاویہ بھی پیدا ہو گیا۔ آپ اس نوع کے لطافت نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی، سید ضمیر جعفری، نصر اللہ خان، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، جمیل آذر، ابراہیم جلیس اور سلیم آغا قزلباش جیسے نثر نگاروں کو شامل کر سکتے ہیں۔ میں اس فہرست میں جمیل عثمان کا نام اس کے میرٹ پر شامل کروں گا کہ اس نے ایک المناک کیفیت سے کربناک حال کی طرف شعوری طور پر پیش قدمی نہیں کی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطافت نگاری اس کی الم نگاری ہی کا ایک رخ ہے جس کی متعدد صورتیں وہ اپنے افسانوں میں پیش کر چکا ہے۔

جمیل عثمان کی لطاف نگاری میں مجھے ''صورتِ واقعہ'' سب سے زیادہ اہم نظر آتی ہے۔ پطرس بخاری، کنہیا لعل کپور اور مشتاق احمد یوسفی کی طرح، مسکراہٹوں کی بھرپور فصل اُگانے کے لیے وہ پہلے ایک کردار کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اس کردار کی زندگی کی چند قاشوں سے ایسے واقعات منتخب کرتا ہے جو مجھے اور آپ کو بے ساختہ مسکراہٹوں سے سرفراز کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے دو غیر متعارف زبانوں کے الفاظ کا معنوی گھونگھٹ الٹا کر لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ لطافت متخیلہ کی بجائے ٹھوس حقیقت سے منسلک

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجیے

معجزات مسلسل

ابوالحسن نقمی
(یو۔ایس۔اے)

آدھی صدی بیت چکی تھی-سن انیس سو اکیاون عیسوی کے پانچویں مہینے-مئی-کی ستائیس (27) تاریخ اور اتوار کی رات-شب برات گزر چکی تھی-شعبان کے مہینے کے بقیہ دس دنوں کا چاند قطار اندر قطار جھونپڑیوں پر اپنی پھیکی پھیکی بے کیف روشنی بکھیر رہا تھا-وہ جیٹھ کے مہینے کا چودھواں دن تھا-مشرقی پاکستان کی بندرگاہ کھلنا کی جاں بخش ہوائیں غریبوں کی بستی میں بھی آرہی تھیں-چاند کی روشنی اور سمندر کی ہواؤں پر کسی کا اجارہ نہیں-غریبوں کی اس بستی کے ایک مکین کا نام تھا محمّد عثمان (بی اے)-چند گز زمین پر ایک ننھی سی جھونپڑی، کل ایک کمرہ، فقط ایک برآمدہ، آدھا حصہ مٹی کا، بقیہ حصہ اینٹوں کا-برآمدے کے اندر چولھا-بانس کی چٹائی کی دیواریں، پھوس کی چھت، مٹی کا فرش، کرایہ پندرہ روپے ماہوار-ہر مہینے کی ادائیگی بے حد دشوار---کل تین افراد-محمّد عثمان، ان کی بیوی اور جمیل عثمان---جمیل عثمان ابھی تھوڑی دیر پہلے دنیا میں آیا ہے-

اس بستی کے لوگ اتنے زیادہ غریب تھے کہ انہیں غریب کہنے سے بھی ان کی غربت کی شدت کو بیان کرنا ممکن نہیں-مفلسی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ اوسطاً چار افراد پر مشتمل دس خاندانوں کے لئے، جو دس جھونپڑیوں میں رہتے تھے، ایک بیت الخلا تھا-عورتیں گھروں کے باہر چادر کا گھیرا بنا کر اس میں نہاتی تھیں-

اس بستی میں محمّد عثمان (بی اے) کی سکونت---؟؟؟

کیا محمّد عثمان بہت غریب تھے؟ وہ غریب کم اور عجیب زیادہ تھے---لہذا وہ عجیب وغریب تھے---ہندوستان کے صوبے بہار کے شہر چھپرہ میں ان کے دادا کی دو منزلہ حویلی تھی---اور یہاں کھلنا میں غریبوں کی اس بستی میں سو فیصد لوگ یکسر ان پڑھ تھے- وہ واحد شخص تھے جو بی اے پاس تھے-دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک ابھرا تھا-اس ترقی پذیر ملک کو محمّد عثمان (بی اے) کی شدید ترین ضرورت تھی-محمّد عثمان فقط بی اے پاس نہ تھے، ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا-شعروشاعری، علم وادب، قران وحدیث پر اتنی متوازن گفتگو کرتے تھے کہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے---محمّد عثمان شاعر تھے-ذرا دھیان سے سنیے، وہ اپنا کلام سنا رہے ہیں-

زندگی کتنی گراں ہے کس قدر ارزاں ہے موت
حادثوں میں ہے نہاں، آفات میں پنہاں ہے موت
کتنی وحشتناک ہے، کتنی بھیانک ہے فضا
شکل میں ابلیس کے چاروں طرف رقصاں ہے موت

لیکن چوبیس گھنٹوں میں کم از کم ایک لمحہ ایسا ضرور آتا تھا جب ابلیس انہیں مکمل طور پر دبوچ لیا کرتا تھا اور وہ ام الخبائث کی خباثت کا شکار ہو جایا کرتے تھے-جی ہاں، ایسی بلندی اور ایسی پستی-

ماہ وسال گزرتے چلے گئے-محمّد عثمان کے پانچ بچے ہو گئے-تین بیٹے، دو بیٹیاں-جمیل عثمان سب سے بڑے--- تمام بچوں کا مستقبل انتہائی ڈانواڈول-شراب نوشی کی وجہ سے محمّد عثمان کوئی نوکری مستقل مزاجی سے کر ہی نہ سکتے تھے-آئے دن کی بے روزگاری---پھر یوں ہوا کہ کھلنا کے ایک امیر کبیر آدمی کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام مل گیا-ساٹھ روپے ماہوار پر-اس زمانے میں اتنے پیسے گھر چلانے کے لئے کافی تھے---ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ نورالحق ماموں آ گئے اور کہنے لگے "جمیل کو انگلش سکول میں داخل کروا دیجئے-" نورالحق جمیل کے سگے ماموں نہیں تھے-ان کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے-

بھلا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا-Lions English School میں داخلہ ہو گیا-مگر وہ وقت تو آنا ہی تھا جب سکول کی فیس نہ دینے کی وجہ سے نوٹس آ گیا کہ مقررہ تاریخ تک فیس نہ ملی تو نام کاٹ دیا جائے گا-محمّد عثمان نورالحق کے ساتھ سکول کے پرنسپل سے ملے-جمیل عثمان کا تمام ریکارڈ دیکھا گیا--- ہر مضمون میں اول--- پوری کلاس میں سب سے زیادہ ذہین---جمیل عثمان کی فیس مکمل طور پر معاف کر دی گئی-جمیل عثمان نے نہایت اعلیٰ سطح پر فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول پاس کیا- ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا اس لئے انٹرمیڈیٹ پری میڈیکل میں داخلہ لیا-انٹر بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا اور ڈھاکہ میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے فارم بھی پر کر کے بھیج دیا-لیکن راتوں رات مشرقی پاکستان ختم ہو گیا اور بنگلہ دیش کی حکومت بن گئی-اعلان کر دیا گیا کہ پاکستان کی حکومت کے زمانے میں جو ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات ہوئے، وہ سب منسوخ-اب نئے سرے سے امتحان ہوں گے-جمیل عثمان اپنے کالج گئے وہاں انہوں نے پچھلے امتحانات کے نتائج نوٹس بورڈ پر لگے دیکھے-جمیل عثمان فرسٹ ڈویژن میں کامیاب---جمیل نے ادھر دیکھا، ادھر دیکھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نوٹس بورڈ کا پرچہ نوچ کر جیب میں ٹھونس لیا اور تیز تیز قدموں سے بھاگ گئے-یہی کاغذ انٹرمیڈیٹ میں ان کی کامیابی کا واحد ثبوت تھا-یہ جمیل کی خوش نصیبی کا دوسرا اہم واقعہ تھا-پہلا واقعہ وہ تھا جب انگلش میڈیم سکول میں فیس کے بغیر تعلیم کا موقعہ ملا تھا-

جمیل عثمان کی زندگی کی مووی کا وہ سین ڈیزالو ہوا-اب پیش نظر سین یہ ہے کہ ایک بس ہندوستان سے نیپال کو جا رہی ہے-دسمبر کا مہینہ ہے-دھوپ نکلی ہوئی ہے-یہ انتہاء سنسنی سے بھرپور لمحے ہیں-اخباروں میں خبریں آ رہی ہیں کہ بنگلہ دیش سے جو مسلمان بہاری بھاگ کر ہندوستان کے راستے نیپال جا رہے ہیں، انہیں مشکوک حالت میں دیکھ کر گرفتار کیا جاتا ہے اور جیل میں بند کر دیا جاتا ہے-

جمیل نیپال جانے والے بس میں سفر کر رہے ہیں - دل قابو سے باہر ہے - بس کنڈکٹر مسافروں سے نام پوچھ رہا ہے - جمیل کی باری ضرور آئے گی - آخر وہ لمحہ آ ہی گیا -- کنڈکٹر نے سوال کیا -

" تمہارا نام کیا ہے؟"

" سنیل "

" پورا نام بولو "

" سنیل کمار سنہا "

" کہاں رہتے ہو؟"

" کلکتے میں "

" کیا کرتے ہو؟"

" پڑھتا ہوں "

" کہاں؟

" لا مارٹینیر کالج میں "

آئی ہوئی بلا ٹل گئی - لیکن دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پر نہیں آئی --- راستے میں ایک مندر آ گیا --- دیوی کے درشن کے لئے سب مسافر اتر پڑے - جمیل بھی اترے - سب مسافر باری باری مورتی کے آگے جھک کر پرنام کر رہے ہیں - پرنام کے بعد مندر کا پجاری ہر مسافر کے ماتھے پر ٹیکا لگا رہا ہے - جمیل نے بھی پرنام کیا - جمیل نے بھی ٹیکا لگوایا - جمیل بس میں آ کر بیٹھ گیا - اس کا جی چاہا کہ وہ زر زور سے کہے کہ میں سنیل نہیں جمیل ہوں - مگر وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا تھا - وہ دم بخود بیٹھا رہا - کوہ ہمالہ کی چھوٹی بڑی چوٹیوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر بس کا سفر --- باہر کے مناظر بہت خوشگوار تھے - نیپال نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا - دوسرے روز جب وہ کاٹھمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے میں داخل ہوا تو اس کا جی چاہا کہ وہ زمیں بوس ہو کر سجدہ کرے اور سبز ہلالی پرچم کو چومے -

کراچی پہنچ کر جمیل نے بی اے، ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے --- انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری کمائی --- شعر کہنا شروع کیا --- افسانے لکھے --- ان دنوں کراچی سے نیو یارک بہت دور معلوم ہوتا تھا - وہ سوچتا تھا کہ وہ اتنا خوش نصیب نہیں کہ اسے امریکہ جانے کا موقع ملے - اس نے سعودی عرب جانے کی کوششیں شروع کیں - وہ اسی کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا -

سعودی عرب میں ملازمت مل گئی - چودہ سال تک سعودی عرب میں رہے - مگر اب ان دنوں کو یاد کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہیں چودہ سال کی قید با مشقت جھیلنا پڑی تھی - جمیل عثمان کو کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ کاش وہ بھی امریکہ جا سکتے --- پھر خبر گرم ہوئی کہ امریکہ جانے کے لئے حکومت امریکہ نے لاٹری کھول دی ہے - انہوں نے سوچا کہ پوری دنیا میں لاکھوں میں سے فقط پچاس ہزار لوگوں کے نام لاٹری میں نکلیں گے - تو بھلا جمیل عثمان کا نام کیوں نکلے گا؟ پھر انہوں نے سوچا کہ اگر میں کوشش ہی نہیں کروں گا تو پھر تو بالکل ہی کوئی امکان نہیں - لیکن کوشش کرنے میں میرا نقصان ہی کیا ہے --- انہوں نے کوشش کی --- ان کا نام لاٹری میں نکل آیا --- امریکہ آئے --- نہ تو انہیں ٹیکسی چلانی پڑی، نہ گیس سٹیشن یا سیون الیون کے کیش رجسٹر پر کھڑا ہونا پڑا --- دنیا کی نہایت ممتاز دانش گاہ کولمبیا یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی -

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

مستقبل کے پردے کے پیچھے ابھی کئی اور لاٹریاں جمیل عثمان کی منتظر ہیں -

بقیہ : طلوع ہوتی ہوئی مسکراہٹ

ہے اور زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اس کے فن کی یہ خصوصیت ''زبان کی کھچڑی''، ''پورب پچھّم''، ''اقامہ''، ''شین قاف'' جیسے مضامین میں بہجت افروزی کا فنی فریضہ ادا کرتی ہے اور غضنفر علی، میر مہتاب الدین، میاں چنوں، جیف ال ڈیٹو عرف جعفر اللہ دتہ اور صدو بھائی جیسے کرداروں سے متعارف کراتی ہے، جن کی ہیئت کذائی اور دیارِ غیر میں زبان کی عدم واقفیت نہ صرف مسکراہٹیں بیدار کرتی ہے بلکہ ہمدردی کا احساس بھی پیدا کر دیتی ہے۔

مجھے جمیل عثمان کی لطافت نگاری میں مشاہدہ اور بذلہ سنجی کا امتزاج نمایاں نظر آتا ہے۔ مشاہدہ اس کے خارج کا عطیہ ہے اور بذلہ سنجی اسے مبدائے فیاض نے عطا کی ہے۔ دونوں صورتیں اس مکالمے سے ہمارے سامنے آتی ہیں جو جمیل عثمان اور ان کے علاوہ کردار کے مابین ہوتا اور صورتِ واقعہ کو ابھارتا چلا جاتا ہے۔ مصنف صورتِ واقعہ کا راوی اور قصے کا کردار ہونے کے باوجود غیر جانبدار نظر آتا ہے۔ بلاشبہ پردیس میں ٹھوکریں کھانے والوں اور روزگار کے لیے عزت و وقار داؤ پر لگانے والے لوگوں میں وہ ایک مردِ دانش ہے لیکن اس کے بیانیے میں تبصرے کا عنصر شامل نہیں اور جو شگفتگی پیدا ہوتی ہے وہ فطری ہے۔ اس قسم کی شگفتگی کا جزوی اقتباس ممکن نہیں، پورا مضمون اپنے سیاق اور سباق کے ساتھ اقتباس کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ اس لیے ابھیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ''پری خانے کا مسافر'' کا مطالعہ کیجیے اور ان غریب الوطنوں سے ملاقات کیجیے جو در در کی ٹھوکریں رزق کی تلاش میں کھا رہے ہیں اور سقوطِ ڈھاکہ جیسا تاثر پیدا کر رہے ہیں۔

پری خانے کا مسافر

حسرت کاس گنجوی

(سندھ)

پری خانے کا مسافر، ان قصوں، کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے جنہیں جمیل عثمان نے مختلف اوقات میں لکھا۔ وہ شائع بھی ہوئے اور انہیں مقبولیت کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ میں نے جمیل عثمان کی صرف ایک کتاب ''جلا وطن کہانیاں'' پڑھی ہے جو قطعی ایک الگ موضوع ہے انہیں دردناک اور سچی کہانیاں بھی کہا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تھا وہ نظریوں کی جنگ تھی جسے جنونیوں نے انسانیت کے قتل کے بعد مذہب کا نام دے کر صدیوں کے رشتے توڑ ہی نہیں دیے تھے بلکہ اپنی حیوانی خصلت کو زندہ کر کے انسانیت کو تاراج کیا تھا۔ خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ دوقومی نظریے کے تحت دوقومیں وجود میں آئیں تھیں۔ وقتی طور پر تو یہ آگ بجھ گئی تھی ہندوؤں نے اسے اپنی شکست تسلیم کیا تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ برصغیر میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ پاکستان کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا جائے۔ سقوط مشرقی پاکستان اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ڈرامہ اس انداز سے رچایا گیا اور مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ اور نفرت قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دن مسلمان مسلمان کے سامنے بندوق لے کر کھڑا تھا۔ بربریت کا دور شروع ہوا اور جو کچھ ہوا اور جس انداز سے ہوا، ''جلا وطن کہانیاں'' میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن ''پری خانے کا مسافر'' اور اس جیسی دوسری کہانیاں موضوع کے لحاظ سے قطعی مختلف ہیں۔

ان کہانیوں میں نفسیات اور فلسفیانہ نرم گرم روّیے، انسانیت، اصولوں اور قاعدوں سے مل کر ایسی داستانیں ترتیب دی گئی ہیں جو حقیقی بھی ہیں اور وہ واقعاتی بھی۔ انہیں پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ زبان اور لسانیات کی گتھیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے اکثر کرداروں کا معاشرہ قدرے یکساں ہے۔ جمیل نے واقعات کی گہرائی میں جا کر انسانی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور اس نفسیاتی جائزے میں انسانی ہمدردی کا عنصر غالب ہے۔ وہ معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اقدار اور روایات کا جائزہ لیتے ہیں لیکن زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتے، ورنہ جو ٹھوس چیز سامنے آتی وہ کہانی یا کردار سے زیادہ ثقیل ہو جاتی۔ پری خانے کا مسافر، دوسروں کی بیویوں کی خدمت کرتا ہے۔ ان کی تمام مشکلات میں نہایت خوش دلی سے پیش آتا ہے۔ جب اپنی بیوی کی مشکلات دیکھتا ہے تو ہر ممکن طریقے پر نظر انداز کرتا ہے۔ بوریت محسوس کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کی بیزاری (اسے کسی حد تک ظلم بھی کہا جاسکتا ہے) کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ بس یہ اس کی طبیعت کی شعوری یا غیر شعوری کیفیت ہے۔ زیادہ گہرائی میں جا کر اگر مطالعہ کیا جائے تو اسے کسی نفسیاتی بیماری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جمیل عثمان اسے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ خود بھی لطف لیتے ہیں اور قاری کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں لیکن یہاں ان کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا نہیں ہے عبرت ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا کردار اپنی کج فہمی کی وجہ سے تھیٹر کا کامیڈی کردار نظر آتا ہے، جسے آپ آسان زبان میں جوکر کہہ سکتے ہیں، جو ہر کام یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ شاید یہ کام فطری ہے، لیکن وہ اصل میں فطرت سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ آخر وقت تک غیر ذمہ دار اور مضحک ہی رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آتا کہ وہ ان غیر فطری حرکات کی وجہ سے عبرت بنا ہوا ہے۔ قاری کے لیے یہ حرکتیں انہونی تو نہیں ہوتیں، معاشرے میں ایسے کردار مل بھی جاتے ہیں۔ ہاں! کبھی کبھی ضرور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کردار اپنی ان حرکات پر خود ہی قہقہہ لگاتا ہے۔ جمیل عثمان نے اسی معاشرے سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ کبھی کبھی اس سے حسِ لطیف بھی جاگتی ہے۔

جمیل عثمان نے پوری کتاب میں حس لطیف کے ایسے ہی موضوعات کو اپنی گفتگو کو محور بنایا ہے وہ انسان کی فطری کمزوریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی اس واقفیت میں نفرت یا حقارت کا پہلو کہیں بھ نہیں ہے۔ انسانی ہمدردی ہی ہے۔ اس کا اظہار ان کے ہاں طنز و مزاح کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ وہ کون کون سی انسانی کمزوریاں ہیں جنہیں دیکھ کر یا بھگت کر انسان اپنے آپ پر بھی قہقہہ لگا سکتا ہے۔ مثلاً شین قاف کا مسئل دور تک چلتا ہے۔ جو لوگ انسانیت سے تھوڑا سا بھی مس رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں جہاں انسان درست تلفظ، درست ادا نہیں کر پاتا وہیں مزاح کا پہلو بن جاتا ہے۔ اس میں فطری امر کو بھی دخل ہے لیکن جب انسان اپنا ہی خاکہ اڑانے پر آجائے تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی مثالیں ہر قوم میں اور ہر معاشرے میں مل جاتی ہیں۔ حیدر آباد دکن کے لوگ ''ق'' کا استعمال درست نہیں کر پاتے۔ پنجاب اور سندھ کے لوگ ''ش'' اور ''ق'' کے درست استعمال پر توجہ نہیں دیتے۔ ''ع'' کا استعمال صرف عرب ہی کر سکتے ہیں۔ جمیل عثمان نے اس کی عملی یا لسانی صورت سے بحث نہیں کی یہ بات تو اس وقت لاشعوری طور پر سامنے آتی ہے جب ان کے کردار بغیر کسی جھجک کے بات کرتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت اور بھی زیادہ مضحک ہو جاتی ہے جب ان الفاظ کو دوسری زبانوں کے ساتھ ملا کر عوامی صورت دی جاتی ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار اپنی حرکات وسکنات سے ایک پُر لطف سماں باندھ دیتے ہیں۔ دراصل یہ مختلف کرداروں کے طبقوں کا جائزہ ہے۔ جہاں اور جس جگہ وہ ہیں، اسی حوالے سے ایسی بات اپنے کردار سے کہلوائی ہے۔ جمیل اپنے کردار کو جہاں بھی لے جاتے ہیں۔ وہ اس کی پسند، ناپسند اور فطری عمل میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ بلکہ ایک مخصوص ماحول میں اسے اس کی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ متعارف کراتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر جگہ یکساں ماحول تو نہیں ہو سکتا۔ اس عمل سے بھی وہ مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ترتیب اور کبھی

کبھی بے ترتیبی سے مزاح کا پہلو نکالنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

''زبان کی کھچڑی'' بھی انسانی پہلوؤں کے لحاظ سے واقعات کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جہاں پر خود بخود دلچسپی اور مزاح کے پہلو نکل آتے ہیں۔ یہاں سنجیدگی کا بس اتنا دخل ہوتا ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ زبانیں ایک وقت میں بولنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بعض الفاظ ایک زبان کا ساتھ دے کر ایک مخصوص معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسی لفظ کو کسی دوسری زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے سے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات تو بڑی مضحکہ خیز صورت سامنے آتی ہے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو ہندوستان یا پاکستان سے اردو بولتے ہوئے عرب سرزمین پر جاتے ہیں۔ وہاں انہیں زندہ رہنے کے لیے ایک عوامی زبان کی ضرورت شدت سے درپیش آتی ہے۔

جمیل عثمان نے اپنی ان کہانیوں میں انسانی نفسیات کے گہرے تجربے اور تجزیے کیے ہیں۔ وہ ایک سچے اور ہمدرد انسان کی طرح اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں، البتہ وہ ان کرداروں کی انگلی نہیں پکڑتے نہ انہیں یہ احساس ہونے دیتے ہیں کہ کوئی سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ ہے۔ انہیں اچھے برے کی تلقین کر رہا ہے، تمیز سکھا رہا ہے کہ کون سی راہ منزل کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ اس راہ کو بھول بھلیوں میں ملا دیتی ہے۔ بس وہ بڑی دلچسپی سے تماشا دیکھتے ہیں۔ جیسے یہ کٹھ پتلیاں ہیں اور عجیب وغریب تماشے دکھا رہی ہیں۔ ان کا یہ مشاہدہ نہایت ہی پُرخلوص ہوتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بیان تو وہ واقعات ہی کرتے ہیں جن پر سچ ہونے کا گمان زیادہ گزرتا ہے۔ چونکہ سیدھی سیدھی بات میں سپلٹ پن پیدا ہو جاتا ہے، دلچسپی ماند پڑ جاتی ہے، اس لیے وہ ماہر فنکار کی رح اس سچائی میں تخیل کا عنصر شامل کر لیتے ہیں اور تصویریں واضح اور نمایاں نظر آتی ہیں۔ جو باتیں درمیان میں ادھوری ادھوری نر آ سکتی تھیں وہ اس تخیل کی آمیزش سے اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ قصے مکمل ہونے کے باوجود سنجیدہ قارئین کو کبھی متاثر نہ کرتے۔

انسان کی محرومیوں اور زندگی کی الجھنوں سے اور وافر مواقع نہ ملنے سے انسان اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی بار بھٹکتا ہے۔ خواہشیں دراصل انسانی زندگی کی ایسی راہیں ہیں جہاں سے بہتر زندگی کا سراغ مل سکتا ہے۔ کہیں جمیل کو انسان کی حد درجہ سادگی متاثر کرتی ہے کہیں معاشرے کی ان خرابیوں کا تفصیلی اور کبھی کبھی اختصار کے ساتھ بیان آتا ہے، جو اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہیں اور انسان کو نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی ہیں۔ پری خانے کا مسافر یوں تو ایک شخصیت کا جائزہ ہے۔ اس مسافر نے اپنی دنیا خود بنائی اور سجائی ہے۔ وہ اپنے اس خول میں بغیر کسی کراہیت کے خوش بھی ہے اور اپنے ہی خیال کے مطابق وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے اور کرتا ہے وہ اس کی فطرت کی عین مطابق ہے اور یہ برملا درست بھی ہے۔ اسے اپنے کردار پر ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ اپنے اس مضحکہ خیز کردار کو وہ اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے۔

ان قصوں میں کسی نہ کسی کردار کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے بات آگے بڑھائی گئی ہے۔ یہ کردار نوکریوں کی تلاش میں جمع ہوتے ہیں۔ ان میں اردو بولنے اور سمجھنے والے کافی لوگ ہیں۔ عوامی گفتگو کا ذریعہ انہیں قریب لے آتا ہے۔ سعودی عرب میں عربی زبان اور تھوڑی سی انگریزی، ایک عجیب ماحول سامنے لاتا ہے۔ مختلف بولیوں کے بولنے والے بھی ہیں۔ بولیاں جب گڈ مڈ ہو کر سامنے آتی ہیں تو خود بخود مضحک پہلو نکل آتے ہیں۔ باہر سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کی وجہ سے ماحول اور معاشرے پر اثر ہوتا ہے۔ یہ کردار اپنے مخصوص معاشرے کو زندہ رکھنے کے لیے جب لاشعوری کوشش کرتے ہیں تو روزمرہ کی زندگی انوکھی اور دلچسپ نظر آتی ہے۔ انہی کرداروں میں جمیل اپنی مطلب کے کردار تلاش کر کے انہیں تراشتے خراشتے ہیں۔ ان کی تراش خراش کا فن معنی خیز بھی ہے۔ وہ کسی کو نشانہ نہیں بناتے بلکہ ان کرداروں کی حرکات وسکنات دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ ایسی تصویریں قاری کے ذہن پر نقش کرتے ہیں جو محفوظ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ تصویریں دیر تک ہمارے ذہنوں میں رہتی ہیں، ان کی نفسیات، ان کی گفتگو، ان کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک اور ان کے آئیڈیل سب میں رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ کیری کیچر اس قدر مضحکہ خیز ہونے کے باوجود بھلائے نہیں جا سکتے۔ جن لوگوں نے جمیل عثمان کی کتاب ''جلاوطن کہانیاں'' پڑھی ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ جمیل عثمان پر ہر قسم کے جذبات اور محسوسات کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔

چیچہ وطنی کوئی انقلابی یا نظریاتی کردار نہیں۔ وہ ایک مخصوص دنیا کا ایک فرد ہے۔ وہ حصول معاش کے لیے آیا ہے۔ پردیس میں بھی وہ اپنی روایات اور اپنے تمدن سے جڑا ہوا ہے۔ وہ یہاں پر ہر بات اپنی روایات کے حوالے سے سوچتا ہے۔ وہ ایک عام آدمی ضرور ہے لیکن اسے اپنے وطن کی ایک ایک چیز سے محبت ہے بلکہ وہ وطن میں ہونے والی زیادتیوں کو بھی یاد کر طور پر اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اسے اپنا گھر، اپنے افراد، ہر قیمت پر عزیز ہیں۔ لوگ اس کے سیدھے پن سے لطف لیتے ہیں۔ وہ بیچارہ اگر سیدھی بات بھی کرے تو لوگ اسے چھیڑنے کی غرض سے ان باتوں کو ذو معنی بنا کر پیش کرتے ہیں، لیکن اس شخص کی روایت پرستی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کی سادگی، سچائی اور کھری گفتگو کچھ لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔ ایسی ہی باتوں میں جمیل نے لطف کے پہلو نکالے ہیں۔

یہ قصے خاکے بھی ہیں، ہر خاکے میں ایک کہانی ہے، جس میں کوئی بڑا نظریہ یا فلسفیانہ پہلو نہیں، لیکن یہ کردار اپنے اپنے علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس بدلے ہوئے معاشرے اور ماحول میں ان کی جو حیثیت ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ بظاہر تو یہ کردار فرضی ہیں لیکن ان کی بنیادیں حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ فرضی ہونے کے باوجود مکمل طور پر سچے ہیں۔ یہی جمیل کی فن کاری ہے۔

جمیل عثمان اور ان کی کہانیاں

رفیع الدین راز
(نیویارک)

جمیل عثمان سے میری شناسائی چند برسوں کی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہیں اور اس کی وجہ بہت سادہ ہے- ہم دونوں کے احساس میں ایک مخصوص خطے کی خوشبو اب تک موجود ہے- اس خوشبو کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ایک مقناطیسیت پائی جاتی ہے اور مقناطیس کی صفت سے کون واقف نہیں- دنیا کے ہر خطے کے خون میں یہ مقناطیسیت موجود ہے- یہی وہ صفت ہے جس کے سبب ہم لوگ قوم کی بجائے قبیلوں، زبانوں، ذات پات اور مسلکوں کے حوالوں سے پہچانے جاتے ہیں- ہمیں بہ حیثیت پاکستانی ایک دوسرے سے مل کر وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو زبان، قوم، ذات اور مسالک وغیرہ کے حوالوں سے ہوتی ہے- اور حیرت یہ ہے کہ ہمیں اپنے اس رویئے پر کسی قسم کی شرمندگی نہیں- میں نے یہ چند سطور کسی تنقید نگار کے طور پر نہیں لکھی ہیں- ایسا کرنا میرے لئے کسی طور ممکن نہیں، کیوں کہ میرے اندر ایسا کوئی محتسب نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہوگا- آپ پوچھیں گے تو پھر میں نے یہ سب کچھ کیوں لکھا؟ اس کی وجہ جمیل عثمان کی وہ تحریریں ہیں جو اس وقت میرے سامنے ہیں-

''جلاوطن کہانیاں'' ہوں یا ''پری خانے کا مسافر'' یا ''بساط'' ہر تحریر میں اس تلخ حقیقت کی آنچ ہمیں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے- کہیں صاف اور کہیں بین السطور- ''بساط'' میں بھی، جو ڈرامے کی شکل میں ہے، ہمیں یہ فضا نظر آتی ہے- چودھری شہباز کا کردار کیا ہے؟ خود ساختہ احساس برتری، نام و نسب کا غرور، دولت اور طاقت کی بربریت! ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے سامنے قانون کے رکھوالے دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں- جمیل عثمان ایک حساس قلم کار ہیں- ان کی نظر جب ایسے مناظر کو دیکھتی ہے تو ان کی روح تڑپ جاتی ہے- اور پھر یہ اپنی روح کی تڑپ کا اظہار مختلف طور سے کرتے ہیں- کہیں ''بساط'' کے سنجیدہ رنگ میں تو کہیں ''پری خانے کا مسافر'' کے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں اور کہیں آنکھوں کو خون رلانے والی ''جلاوطن کہانیاں'' کی شکل میں- نطشے نے انسان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا، ''خدا مر چکا ہے-'' اس نے انسان کے مرنے کی بات نہیں کی تھی- جمیل عثمان نطشے سے اختلاف کرتے ہوئے قدم قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ خدا مرا نہیں ہے، نہ وہ کبھی مرے گا- لیکن ساتھ ساتھ وہ نطشے کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہاں، انسان ابھی زندہ ہے، وہ مرا نہیں ہے- جمیل عثمان کی نظروں میں خدا اور انسان دونوں زندہ ہیں- کرن کو ظالموں کی قید سے رہائی دلانے والی بوا، اس مظلوم لڑکی کے لئے جان پر کھیل جانے والا نوجوان، چودھری شہباز کے خلاف پرچیاں کٹوانے والے کمزور لوگ، مکتی باہنی کے کیمپ سے مظلوم لڑکی کو نکال لے جانے والا بنگالی نوجوان، اپنے بہاری پڑوسیوں کو جان پر کھیل کر بچانے والے منور علی، برٹش میوزیم کے بھائی صاحب، جو کہتے ہیں "ان کتابوں کو یہیں رہنے دو- اپنے امین تو انہیں ردی میں بیچ کھائیں گے"، یہ سب کون ہیں؟ یہ وہ کردار ہیں جو انسان کے زندہ ہونے کی گواہی دے رہے ہیں- یہ الگ بات ہے کہ انسان اس وقت انتہائی اقلیت میں ہے- لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہیرے موتی ریت کے ذرات کی طرح عام نہیں ہوتے- ہماری تمام تر خواہشوں کے باوجود ہر دور اور ہر زمانے میں آدمی اکثریت اور انسان اسی طرح اقلیت میں رہیں گے- لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس اقلیت کے پیکر سے خارج ہونے والی روشنی پر ظلمت کبھی فتح یاب نہیں ہو پائے گی- جگنو سے راتیں ڈرتی ہیں، رات جگنو سے کبھی خائف نہیں ہوتے- جمیل عثمان کی تمام تحریروں میں ہمیں اس روشنی کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے- وہ دل گرفتہ تو ہوتے ہیں، نا امید نہیں- یہی ایک سچے قلمکار کی پہچان ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کا فنی معیار کیا ہے- یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تحریر چاہے جیسی ہو وہ غیر اہم نہیں ہوتی- کمزور ترین تحریر میں بھی آپ کو اس عہد کے سانسوں کی حدت محسوس ہوگی- غاروں کی دیواروں اور چٹانوں پر کندہ نقوش بھی ہمارے سامنے ایک عہد کی تصویریں لیے کھڑے ہیں- کوئی بھی تحریر اپنے عہد کے اثر سے نہیں بچ سکتی- بہ ظاہر شاعری، افسانہ نگاری، مصوری اور سنگ تراشی ہمیں تاریخ کا حصہ نظر آئیں، لیکن ایسا نہیں ہے- ہر تحریر میں آپ کو تاریخ کے خدوخال نظر آئیں گے- البتہ تحریر کے موضوع اور اس کی معروضیت پر گفتگو ہو سکتی ہے-

جمیل عثمان ہر چند کہ شاعر بھی ہیں لیکن ان کی بنیادی پہچان افسانہ نگاری ہے- سو افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے بھی اپنے عہد کی تاریخ رقم کی ہے اور کر رہے ہیں- ان کتابوں کے بعد بھی یہ اتنے افسانے لکھ چکے ہیں کہ ایک ضخیم مجموعہ اس وقت بھی چھپ سکتا ہے- ویسے تو جمیل عثمان کی تحریروں میں ہر اعتبار سے پختہ کاری نظر آتی ہے لیکن ان میں ایک خاص صفت بھی ہے اور وہ یہ کہ تخلیقی اعتبار سے کسی مخصوص فضا کے اسیر نہیں- عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعر و ادیب کسی خاص ماحول کے دائرے میں گردش کرتے ہیں- وہ دنیا کے کسی خطے میں کیوں نہ ہوں ان کی فکر کا محور پرانا ہی رہتا ہے- مثلاً اگر ان کا تعلق برصغیر سے ہے تو وہ بھلے یورپ و امریکہ میں ہوں یا آسٹریلیا اور مشرق وسطیٰ میں، وہ برصغیر کی فضا سے باہر نہیں نکل پاتے- تخلیق کار تو زیادہ تر موضوعات اپنے اطراف سے لیتا ہے- لیکن ہمارے ہاں بہت کم تخلیق کار اس حصار سے نکل پاتے ہیں- اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ہمارے نزدیک کی نظر کمزور ہوتی ہے- شاید اسی سبب سے ہم اپنوں سے دور اور غیروں کے نزدیک ہوتے ہیں- ہمیں سر منظر کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں جبکہ پس منظر کو ہم بہت واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں یا دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں- جمیل عثمان کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہیں سامنے کے مناظر بہت صاف نظر آتے ہیں- بنگلہ دیش کے پس منظر میں ''جلاوطن کہانیاں''، مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ''پری خانے کا مسافر'' اور امریکہ میں رہتے ہوئے گزشتہ چند برسوں کے افسانے، ہر جگہ

موضوعات انہوں نے اپنے اطراف سے لیے ہیں- یہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں وہاں کے زمان ومکان سے ان کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے- مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں- آپ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے میرے ہم خیال ہو جائیں گے-

جمیل عثمان اپنے افسانوں اور کہانیوں میں خوبصورت جزیات نگاری سے کام لیتے ہیں- یہ اپنی جزیات نگاری کے سہارے اس ماحول کا پورا جغرافیہ بھی ہمارے سامنے لے آتے ہیں- ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ وہ پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں- اگر بازار کا ذکر ہے تو آپ خود کو اس بازار میں محسوس کریں گے- کردار کو پڑھتے ہوئے آپ کو ایسا لگے گا جیسے وہ کردار آپ کے سامنے ہے- ماحول کی منظر کشی بھی بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں- پردیس کی زندگی ہم سب گزار رہے ہوتے ہیں، کہیں تنہا اور کہیں فیملی کے ساتھ- ہمارا چھوٹا بڑا احباب کا ایک حلقہ بھی ہوتا ہے- ہم ان کے درمیان شب وروز گزارتے ہیں لیکن ان سچے مناظر کو ہم اس طرح محسوس نہیں کرتے جس طرح جمیل عثمان ہمیں محسوس کراتے ہیں- ''پری خانے کا مسافر'' پڑھتے ہوئے، ہمیں پتا چلتا ہے کہ کم وبیش ہم بھی ویسی ہی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں- اس تصور کے ساتھ ہی ہمارے ہونٹوں پر ایک خوش گوار سی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے- ان کا طرز تحریر اتنا شگفتہ ہوتا ہے کہ ہمیں طنز پر بھی مزاح کا گمان گزرتا ہے- یہ کتاب پڑھتے ہوئے جب ہم بند آنکھوں سے اپنی بیگم اور دوستوں کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں- ہنسنے کی وجہ وہ زاویۂ نظر ہے جو ہمیں جمیل عثمان عطا کرتے ہیں- جمیل عثمان کو المیہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی تحریروں پر اچھی خاصی دسترس حاصل ہے- وہ ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں بڑی خوبصورتی سے تلخ حقائق بیان کر دیتے ہیں- سعودی عرب کا ''اقامہ'' ہو یا بوڑھے انگریز کی تنہائی، ان کے قلم میں تلخی کی بجائے شگفتگی نظر آتی ہے- وہ چاہتے تو سعودی عرب کے اس نظام اور مغربی تہذیب کے اس رنگ پر بھرپور تنقید کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا- ''پری خانے کا مسافر'' کے مختلف کرداروں کو بھی انہوں نے فکاہیہ انداز میں لکھا ہے- وہ چاہے ''فنکار'' ہوں یا ''بھائی صاحب''، چچا وطنی ہوں یا امداد حسین، کہیں بھی ان کا لہجہ تلخ نہیں ہوتا- اسی طرز تحریر کے ساتھ یہ اپنے پڑھنے والوں کی معلومات میں بھی اضافہ کرتے ہیں- مثلاً ہم جیسے مسلمان سمجھتے ہیں کہ سعودی عرب میں سینما نہیں ہے- جس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے وہاں غیر قانونی طور پر فلم دکھانے کی ہمت کون کر سکتا ہے؟ لیکن ایسا نہیں ہے- وہاں فلم بینوں کی نگاہ شوق کے لئے یہ کاروبار بھی ہوتا ہے- اور یہ غیر قانونی کاروبار کرنے والے یہ کام ایمانداری سے کرتے ہیں- ہاؤس فل ہونے کے بعد بھی اگر آپ فلم دیکھنا چاہتے ہیں تو گیٹ پر کھڑا وہ شخص، جو آپ سے ٹکٹ کے پیسے لے رہا ہے، آپ کو چیخ چیخ کر بتاتا ہے، ''مافی کراسی'' یعنی کرسی نہیں ہے- میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ''پری خانے کا مسافر'' ضرور پڑھیں- اگر آپ عربی زبان نہیں جانتے تو بہت سارے روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ سے آپ کی شناسائی ہو جائے گی اور آپ یہاں رہتے ہوئے ہم جیسوں پر اس زبان کا رعب بھی ڈال سکیں گے- مجھے ''پری خانے کا مسافر'' پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں یہ گمان گزرا کہ جمیل عثمان کسی فارما سیوٹیکل کمپنی میں شوگر کوٹڈ گولیاں بنانے پر بھی مامور رہے ہیں-

جمیل عثمان کے افسانے ہوں یا کہانیاں، سب میں ان کا انداز بیانیہ ہے- بیانیہ انداز کو آپ سرسری نہ لیں- جن تحریروں کو کلاسک ہونے کا اعزاز حاصل ہے ان میں زیادہ تر بیانیہ ہیں- یہ انداز براہ راست دل پر دستک دیتا ہے- حقیقت کی منظر نگاری جتنی خوبصورتی سے بیانیہ انداز کرتا ہے وہ علامت نگاری کے ذریعے ممکن ہی نہیں- اگر ''جلاوطن کہانیاں'' کو لکھنے کے لئے علامت نگاری کا سہارا لیا جاتا تو جو کچھ ان کہانیوں کے ساتھ ہوتا اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں- ویسے بھی جن کہانیوں پر تاریخ کا اثر غالب ہو انہیں بیانیہ انداز میں ہی لکھنا چاہئے- آٹھ بج کر پندرہ منٹ کو سوا آٹھ ہی کہنا مناسب ہے- اگر آپ نے اسے ساڑھے سات بج کر پینتالیس منٹ یا پونے آٹھ بج کر تیس منٹ کہا تو ابلاغ کا جو حال ہوگا وہ آپ سمجھ سکتے ہیں-

جمیل عثمان کی کہانیوں کا تعلق بنگلہ دیش سے ہو، مشرق وسطیٰ سے ہو یا امریکہ سے، یہ سوا آٹھ کو ہمیشہ سوا آٹھ ہی لکھتے ہیں- ''جلاوطن کہانیاں'' کی تمام کہانیاں مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں چاہے ان کا تعلق کٹھمنڈو سے کیوں نہ ہو- ان کی اس کتاب کو بڑی پذیرائی ملی- جب ہی اس کا تیسرا ایڈیشن آج ہمارے سامنے ہے- ان تمام کہانیوں کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے مشرقی پاکستان کے خونی انقلاب سے بھی ہے- ہمیں ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ کوئی تاریخی ناول نہیں ہے- یہ کہانیوں کی کتاب ہے- افسانے اور مختصر کہانیوں کا کینوس ناول کی طرح پھیلا ہوا نہیں ہوتا- اس کے کردار، واقعات اور زمان ومکان محدود ہوتے ہیں- سو ایسی کہانیوں میں ہمیں مکمل منظر نامہ دکھائی نہیں دے گا- کہانی کا پھیلاؤ آپ کو مختصر نظر آئے گا کیوں کہ یہ کہانی اپنے کردار وواقعات کے گرد گھوم رہی ہوگی- اسے اس وقت کے پورے منظر نامے سے جوڑ کر دیکھنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب، چونکہ موضوع بہت حساس ہے- اس سانحے کے تین بڑے کردار ہیں، پاکستانی فوج، بنگالی عوام اور غیر بنگالی جنہیں بہاری کہا جاتا ہے- تینوں اس سے متاثر ہوئے- کون کتنا ہوا یہ الگ بحث ہے- ہر شخص کو اپنی اور اپنے عزیزوں کی تکلیف زیادہ دکھائی دیتی ہے- اس حادثے کو مکمل غیر جانبداری سے دیکھنا بہت مشکل ہے- اگر کسی نے اسے مکمل غیر جانبداری سے قلمبند کر بھی دیا تو پڑھنے والے اس سے یکساں اتفاق نہیں کریں گے- بات یہ نہیں کہ ہمارے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ کتنا ظلم ہوا- ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایسا کیوں ہوا- لیکن اس ''کیوں'' نے سوچنے والے ذہنوں کو صدیوں سے پریشان کر رکھا ہے- سترہویں صدی کے وسط میں مشہور یہودی فلسفی اسپائی نوزا کو بھی اسی ''کیوں'' نے بہت پریشان کیا تھا- وہ ایک جگہ لکھتا ہے، ''وہ کون سی چیز ہے جو لوگوں کو منحرف عقائد قبول کرنے اور عقیدے کے اختلاف کے باعث ایک دوسرے پر تشدد کرنے پر اکساتی ہے؟'' آج بھی یہ سوال اسی طرح زندہ ہے اور جب تک ہم انسان کو صرف انسان نہیں سمجھیں گے یہ سوال اسی طرح زندہ رہے گا-

''روشنی کا درخت''

پروفیسر خالدہ ظہور
(امریکہ)

محترم جمیل عثمان نیویارک اور نیوجرسی کے اہلِ قلم حضرات کے دل کے کسی گوشے کے نہایت مہربان مکین ہیں۔ اپنی روزمرہ زندگی میں بہت مہذب اور متواضع شخصیت کے مالک ہیں۔ دھیما پن، برداشت اور کم سخنی صوفیاء کا مسلک ہے۔ جمیل صاحب نے صوفیا کی خصوصیات کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ آپ بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں اس لیے دنیا کو ایک تخلیق کار کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

میں گُل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں
گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

لوگ بچوں کی مانند ہوتے ہیں کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔ جب انسان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا تو تب کہانی سنانے یا قصّہ گوئی کا رواج تھا۔ رات کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر کہانیاں سنائی جاتی تھیں جب انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو ان قصے کہانیوں کو قلم بند کیا جانے لگا جس کے نتیجے میں قصّہ چہاردرویش، داستانِ امیر حمزہ، فسانۂ عجائب، باغ و بہار اور عمرو عیار جیسے مشہور و مقبول قصّے کہانیاں سرمایۂ ادب بنے۔ جب تک انسانی زندگی بہت تیز رفتار اور مشین کا پہیہ نہیں بنی تھی اس وقت تک تو لوگ قصے کہانیوں کی ضخیم کتابوں کو پڑھ لیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب انسان فکرِ معاش میں مصروف ہو گیا تو اس وقت مغرب سے متاثر ہو کر شارٹ سٹوری یا مختصر کہانی لکھنے کا انداز اپنایا گیا اور ہمارے ہاں بھی معاشرتی کہانیوں کو مختصر بیانیہ انداز میں لکھا جانے لگا۔

افسانہ نگار یا کہانی کار فطرت اور ماحول سے کہانیاں اخذ کرتا ہے جس طرح شہد کی مکھی ایک ایک پھول کے پاس جا کر شہد چوستی ہے اور پھر اُس کو جمع کرتی ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار بھی عام زندگی کے حالات و واقعات سے کہانی کا تانا بانا بُنتا ہے۔ جمیل عثمان کی کہانیاں روزمرہ زندگی کی کہانیاں ہیں۔ زیرِ بحث کتاب ''روشنی کا درخت'' دراصل کرسمس ٹری ہے۔ ایک عرصہ سے امریکہ میں رہنے کی وجہ سے اس افسانوی مجموعے کی کہانیوں کا پس منظر امریکہ ہے۔ یہ تقریباً سولہ افسانے ہیں جن میں جمیل عثمان نے امریکی تہذیب کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

جمیل عثمان کے ہاں وہ باریک بین نظر ملتی ہے جو ظاہر سے ہٹ کر اشیاء کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک سچا ادیب اور حقیقی شاعر اُس رمز کو تلاش کرتا ہے جو بین حقیقت موجود نہیں ہوتی۔ جمیل عثمان نے تہہ داریوں اور گنجلک انداز سے اجتناب کرتے ہوئے معمول کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے بقول شاعر:

تم آسمان کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمین کے مسائل پر بات کرنی ہے

جزئیات نگاری اور منظر کشی جمیل عثمان کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے وہ لفظوں سے ماحول کی تصویر کشی بہت احسن طریقے سے کرتے ہیں۔ آپ اپنے زورِ قلم سے خوابوں، اُمیدوں اور آدرشوں کا ایک جہان تخلیق کر لیتے ہیں اور پھر اس میں رنگ بھرنے کے لیے حالات و واقعات کی جزئیات اتنی باریک بینی سے بیان کرتے ہیں کہ منظر یا واقعہ تفصیل سے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنے افسانے ''روشنی کے درخت'' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

'جب نومبر کا مہینہ شروع ہوتا ہے اور ہوا میں ہلکی ہلکی سی خنکی تیز تر ہوتی ہوئی بدن میں چبھنے لگتی ہے جب شمال سے زمستانی ہوائیں مستانہ وار چلتی ہیں اور درختوں کے رہے سہے پتوں کو بھی گرا دیتی ہیں۔ جب پرندے دُور دراز کے سفر پر جنوب کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور جب آسمان پر اڑنے والی بطخیں کسی جھیل کے کونے میں پانی کی سطح پر ایک دوسرے میں گھسی ہوئی چپ چاپ پڑی رہتی ہیں۔ تب مائیکل اپنے اٹیک میں پڑے ہوئے گرد آلود اور الجھے ہوئے برقی تاروں کو اُتار کو سلجھانا شروع کر دیتا ہے۔''

جمیل عثمان نے کرسمس سے پہلے کی تیاری کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم خود اس منظر کشی کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ اور یہ ایک کامیاب کہانی نویس ہونے کی دلیل ہے۔

جمیل عثمان نے اپنے مشاہدے اور مطالعے سے جتنے ہنر، جتنے اسالیب اور جتنے کمالات اخذ کیے ہیں وہ ادب کی مختلف اصناف میں برتے ہیں۔ آپ شاعری کرتے ہیں، افسانے لکھتے ہیں، کالم نگار ہیں اور بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔ انہیں ماورائی اور خیالی باتوں سے زیادہ زندگی کے حقائق و مسائل سے دل چسپی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان دولخت ہوا تو آپ مشرقی پاکستان میں موجود تھے آپ نے اپنے مشاہدات پر مبنی کہانیاں لکھیں جن کا مجموعہ ''جلاوطن کہانیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران آپ نے پاکستانیوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے مزاحیہ کہانیاں ''پری خانے کا مسافر'' کے نام سے تحریر کیں۔ جمیل عثمان کی تیسری کتاب ''بساط'' ایک طویل ڈرامہ ہے۔

افسانوی مجموعہ ''روشنی کا درخت'' اور جمیل عثمان کی دیگر کتابیں سب کی سب ہمیں باور کرواتی ہیں کہ زندگی کا اپنا ایک قرینہ ہے۔ اس کا رشتہ حقائق سے ہے زندگی کی عمارت سچائی پر استوار ہے اور یادیں جب ضبطِ تحریر میں آ جائیں تو یادگار ہو جاتی ہیں۔ بقول ظفر زیدی:

لوگ آتے ہیں ٹھہرتے ہیں چلے جاتے ہیں
بستیاں کیسی میرے دل میں بسا رکھی ہیں

باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ کیجیے

اُجلی اُجلی کہانیاں

نصرت انور
(نیویارک)

پاکستانی ٹائمز کے کارٹونسٹ انور علی جن کا قلمی نام ننھا تھا انہوں نے پنجابی میں بڑی خوبصورت کہانیاں لکھیں۔ اُنہیں لگا کہ ہجوم دوستاں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی غیبت میں وقت برباد کرنے سے اچھا ہے کہ کہانی لکھی جائے۔

جمیل عثمان کی صورت اور سیرت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اس طرح کے منفی مشاغل سے دور رہ کر کہانیاں لکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اُس کے رکھ رکھاؤ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بیباک بندہ ہے۔ یعنی احترامِ آدمیت کو افضل گردانتا ہے۔ اُس نے بڑی یگانگت کے ساتھ دیارِ غیر کو اپنایا ہے۔ نئی زمین اور نئے لوگوں کے رہن سہن کا شوقِ تجسس کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور بڑے تپاک کے ساتھ کہانیوں کا روپ دیا ہے۔ اپنی کہانی میں وہ قاری کو ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

ہر تہذیب دوسری تہذیب سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان میں انسانی قدریں بہت حد تک مشترک ہوتی ہیں۔ جمیل عثمان نے امریکہ کے طرزِ زندگی سے مختلف گوشوں کو گہری نظر سے دیکھا اور کہانیوں میں ڈھال لیا۔ جمیل عثمان اپنے اردگرد کو گہری نظر سے دیکھتا ہے۔ مختلف شعبوں کی جانکاری میں بھی دلچسپی لیتا ہے اور پھر وہیں سے کہانی نکال لیتا ہے۔ مجموعی طور پر اُس نے اپنی کہانیاں امریکہ کی مٹی پر ہی اُگائی ہیں۔ کہانیوں کا دورانیہ بھی عصری ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں معاشرتی سطح پر ہونے والے واقعات کی چھوٹی چھوٹی جھلکیاں دِکھاتا ہے۔

اپنی کہانیوں میں وہ عمر رفتہ کو آوازیں نہیں دیتا بلکہ موجودہ زندگی سے پیوستہ زمین اور زمینی اقدار سے ہی کہانی بُن لیتا ہے۔ اُس کی کہانیوں کے بیشتر کردار امریکی عورتیں اور مرد ہیں۔ اُس کی کتاب میں سولہ کہانیاں ہیں۔ عموماً وہ اپنے کرداروں کے اندر کی نیکی کو Scan کر کے باہر لانے کا چارہ کرتا ہے۔

جمیل اپنے مشاہدے اور تجربے کو گوندھ کر کہانی بنانے کی فنکاری دکھانے کا جتن کرتا ہے۔ زیادہ تر کردار نیک سیرت ہوتے اور معدودے چند کم نیک۔ کہانی کے موضوعات میں آج کے انسان کے سماجی اور معاشی مسائل کا تذکرہ ہوتا ہے۔

وہ فطری انداز میں لکھتا ہے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ کہانی کا پلاٹ اُس کے دماغ میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ یا پھر کوئی معاشرتی واقعہ کہانی کا محرک بنتا ہے۔ قاری کو دورانِ مطالعہ لگتا ہے جیسے وہ تمام کرداروں کا ذاتی طور پر واقف ہے۔ یہ اس کا ایک Plus Point ہے۔ ''نقصان'' بے مہر حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ جس میں امریکی بیانیے کے مطابق امریکہ کا صرف ایک فیصد نقصان ہوتا ہے اور دشمن کا اسّی (80) فیصد۔

یہ دلگداز کہانی ایک بوڑھی امریکن مسز پیٹرسن کے بارے میں ہے۔ مسز پیٹرسن کا بیٹا افغان جنگ میں بھیجا گیا ہے۔ ہر امریکی کی طرح مسز پیٹرسن بھی اس جنگ کے متوقع نتائج سے لحہ بہ لحہ کسی بُری خبر کے آنے کے دھڑکے میں مبتلا ہے۔ ہر آہٹ اور ہر دستک سے خوفزدہ ہے۔ آخر کار وہی ہوتا ہے جس کا اُسے ڈر تھا۔ مسز پیٹرسن کا بیٹا جنگ میں ہلک ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کا اختتامیہ بہت پرسوز ہے۔ جہاں مسز پیٹرسن امریکی آفیسر کو کہتی ہے ''تمہارا صرف ایک فیصد نقصان ہوا ہے لیکن میرا تو 100 فیصد نقصان ہوا ہے۔''

ایک اور کہانی ''روشنی کا درخت'' اخلاق، محبت اور دوستی سے لبریز کہانی ہے۔ کہانی کا پس منظر 2013 میں کینٹی کٹ کے ایک سکول میں ہونے والی خونی ڈرامے کی نشان دہی کرتا ہے۔ جہاں بچوں اور اساتذہ کو ایک نوجوان نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ کہانی کی بُنت بہت اچھی ہے۔ حادثے سے جڑے واقعات کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

''جینی کا بیٹا'' امریکہ میں Gay Rights ملنے کے بعد کی زندگی کے نئے Set up کی کہانی ہے۔ اس میں جمیل عثمان نے ماں، بیٹے اور بیٹے کے Gay ساتھی کی تصاویر بنانے میں چھوٹی چھوٹی سی تفاصیل کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ جمیل عثمان ایک رجائیت پسند ادیب ہے وہ کہانی ''جینی کا بیٹا'' میں امریکی معاشرے کے کھلے ڈھلے چلن پر تنقید نہیں کرتا بلکہ جینی میں اُسے دنیا بھر کی باقی ماؤں کی طرح اپنے بیٹے کے لیے بے پناہ محبت نظر آتی ہے۔ عموماً اس کی تحریر نیچرل ہے۔ جیسے نقصان، روشنی کا درخت اور بہت سی دوسری کہانیاں۔ وہ علامتی یا تجریدی کہانی لکھ کر قاری سے دماغ کے کل پرزوں کو نہیں جھنجھوڑتا۔ اپنی کہانیوں میں ایسی صورت حال پیدا نہیں کرتا جس سے قاری کو کشمکش سے گزرنا پڑے۔ اور اُس کے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہو جائیں یعنی وہ زیادہ تر Challenging کہانیاں نہیں بُنتا۔ جمیل کی شخصیت کی Coolness ہے کہ اُس کی کہانی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں چلتی رہتی ہے۔

''کام کا آدمی'' ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس کہانی میں ایک بیاہتا بیوی خاوند کی کاروباری مصروفیات کی بدولت جذباتی طور پر بار بار خود کو Ignored محسوس کرتی ہے۔ جبکہ خاوند کا خوبرو سیکرٹری اپنے باس کو گھر سے متعلق تمام اہم واقعات کی یاددہانی کراتا ہے۔ جیسے بیوی کی سالگرہ یا شادی کی سالگرہ اور دوسرے اہم مواقع تاکہ وہ بیوی کے لیے تحائف وغیرہ کا بندوبست کرلیا کرے۔ ایک دن بیوی کو پتہ چل جاتا ہے جب سیکرٹری خاوند کی جانب سے پھولوں کا تحفہ بیوی کے لیے لاتا ہے اور بیوی گلدستے کے ساتھ سیکرٹری کو یہ کہہ کر پکڑ لیتی ہے ''سب کچھ تو تمہیں یاد رہتا ہے تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔''

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ کیجیے

جمیل عثمان کا تخلیقی بہاؤ

کامران ندیم

(●)

تخلیقی وفور بھی کسی دریا کے بہاؤ کی طرح ہوتا ہے جو مدھم اور گنگناتے ہوئے انداز میں رواں دواں رہتا ہے، لیکن جب کبھی تخلیقی لاشعور کے پہاڑوں کی برف تمازت فن سے پگھل کر شعور کی وادیوں میں آتی ہے تو سرکش موجیں دریا کے مقررہ راستوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہیں اور پانی کناروں پر دور دور پھیل جاتا ہے- یعنی ایک تخلیقی سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے- نثر اور نظم تخلیقی دریا کے دو متوازی مگر مسلسل کنارے ہیں اور کم از کم اردو زبان کے ادب میں یہ صورت حال کم تخلیق کاروں کے ہاں پائی جاتی ہے کہ ان کا تخلیقی بہاؤ ان دونوں کناروں کو سیراب کرتا ہو- جمیل عثمان کا شمار ایسے ہی تخلیق کاروں میں کیا جاتا ہے-

شمالی امریکہ میں جمیل عثمان جیسے لکھنے والوں کا دم غنیمت ہے- جمیل عثمان کی فنکارانہ اپج، ان کے موضوعاتی منظر نامے، ان کے لسانی کرافٹ میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، ان کے ہاں تکنیکی سادگی، ان کا ہیئتی تنوع اور سب سے بڑھ کر ان کی تخلیق کے لئے کمٹمنٹ بہت الگ تھلگ اور منفرد ہے- پھر نثر میں بھی کبھی وہ کشت زعفران کو سیراب کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی کشت غم کو سینچتے ہیں- دریا کے دوسرے کنارے پر ان کا تخلیقی بہاؤ مملکت شعر و سخن کو بھی سیراب کرتا ہے-

ان کی اردو کہانیوں کے مجموعے "جلاوطن کہانیاں" کے دو ایڈیشن شایع ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ ان کا قاری سے ابلاغیاتی سطح پر رابطہ برقرار بلکہ بے حد استوار ہے- گو مجھے ان کہانیوں کے موضوع سے سیاسی اور نظریاتی سطح پر اختلاف ہے، لیکن اگر اختلاف کی عینک ہٹا کر دیکھا جائے تو ان کہانیوں کے بیانئے میں ایک ایسا رچاؤ، چاشنی اور شائستگی پائی جاتی ہے جو قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی- ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ان میں موجود کہانی پن ہے- وہ تجرید اور علامت کی بھول بھلیوں میں پڑے بغیر قاری کے تخیل کی انگلی تھامے چلتے ہیں- ان کے بیانئے میں قدیم زمانے کے داستان سنانے والوں کی سی مہارت ہے جس کے ساتھ وہ قاری کو تحیر کی وادیوں میں گھماتے پھراتے یکدم ایک چونکا دینے والی منزل پر کہانی کا اختتام کر دیتے ہیں- "جلاوطن کہانیاں" کے علاوہ مجھے ان کے جو دیگر افسانے سننے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا، ان کا کرافٹ بھی یہاں کے دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد ضرور ہے- بالعموم ہمارے افسانہ نگار ناسٹلجیائی رو میں بہتے ہوئے ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کا موضوعاتی منظر نامہ پاکستان اور اس سے متعلق؟ مسائل ہی ہوتا ہے، اور اس میں کسی قسم کی قباحت بھی نہیں- لیکن جمیل عثمان کے قلم کی یہ خاصیت ہے کہ وہ زمانی اور مکانی حوالے سے کہانیوں کا تانا بانا بنتے ہیں- اس سلسلے میں انہوں نے امریکی معاشرے کے حوالے سے زمانی اور مکانی تخلیقی چاک پر جن افسانوں کی تخلیق کی ہے وہ انہیں شمالی امریکہ کے اردو لکھنے والوں میں ایک ممتاز مقام دلوانے کے لئے کافی ہیں-

ان کی شگفتہ تحریروں کے مجموعے "پری خانے کا مسافر" میں ظرافت آمیز اسلوب میں ایک مخصوص ابلاغ و اظہار کی ترسیل کی تکمیل کے لئے جس فنی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے وہ ہماری روزمرہ زندگی سے مستعار ہیں جو عام ہوتے ہوئے بھی مخصوص ہیں- وہ کہتے ہیں نا کہ اگر خارے بود گلدستہ گردد، لیکن جمیل عثمان کی شگفتہ تحریروں میں طنز کی کاٹ نظر نہیں آتی- ان کی ظرافت کی یہ پھلواری طنز کی کاٹوں سے تہی ہے- اس کے برعکس ان کی شگفتہ تحریروں کو خالص مزاح کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے- عام طور پر وہ کرداروں کی شخصی ناہمواری سے ایک فضا کی تخلیق کرتے ہیں جو قاری کو زیر لب تبسم پر آمادہ کرتی ہے اور یہی مصنف کا مقصد ہے- ان تحریروں کے پس منظر میں ان کی طبعی شگفتگی اور بذلہ سنجی کا گہرا دخل ہے- ان کی تحریر "پری خانے کا مسافر" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو: "چند مہینوں بعد خبر آء کہ رقیب ایک بچے کا باپ بن گیا ہے- کسی سابقہ محبوبہ کے ہاں بچے کی پیدائش کی خبر سن کر اتنی خوشی مناتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا- دیوانہ ہو کر ناچتے پھر رہے تھے، مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے اور سبھوں کو خوش خبری سنا رہے تھے-"

نثر میں جمیل عثمان نے ڈرامے میں بھی جوہر دکھائے ہیں اور ان کا طویل ڈرامہ "بساط" کتابی صورت میں 2010 میں شایع ہو چکا ہے- ڈرامے کا فن اور تکنیک افسانے اور مزاح سے بالکل مختلف ہے اور جمیل عثمان نے ثابت کیا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی جادہ پیما ہو سکتے ہیں-

اب کچھ ذکر ہو جائے شاعری کا- جمیل عثمان مشاعروں میں بلوائے جاتے ہیں اور خوب خوب داد سخن وصول کرتے ہیں- اگرچہ اپنی طبعی انکساری کے باعث وہ خود کو نثر نگار ہی سمجھتے ہیں، لیکن آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان اشعار کی تخلیق کرنے والے میں شعری تخلیق کے کیسے کیسے امکانات پوشیدہ ہیں:

بلند آہنگ ہوتا جا رہا ہوں
حریف چنگ ہوتا جا رہا ہوں

مرے ہمزاد کا دم گھٹ رہا ہے
میں اتنا تنگ ہوتا جا رہا ہوں

میں اپنی شاخ سے ٹوٹا ہوں جب سے
بہت بے رنگ ہوتا جا رہا ہوں

☆

''خوشی کے گیت''

(جمیل عثمان کے نظمیہ کلام سے بصد اختصاص)

فاری شا (لندن)

اعصاب

میرے کمرے کا وہ بوسیدہ بڑا دروازہ
جس کی دہلیز کے باہر مرے خوابوں کی گہر
گرد آلودہ و پیچیدہ گزر گاہوں میں
خس و خاشاک کے ہمراہ کہیں رولتے ہیں

میرے کمرے کی کرم خوردہ ٹوٹی ہوئی چھت
جس سے برسات میں بارش کے ٹپکتے قطرے
فرش پر رکھی ہوئی بالٹی میں گرتے ہیں
اور گھنٹی کی طرح کان میں رس گھولتے ہیں

میرے کمرے کی وہ گرتی ہوئی سی دیواریں
جن کی شہتیر میں مکڑوں نے بُنے ہیں جالے
اپنے جالوں سے لٹکتے ہوئے یہ بازی گر
سامنے میری نگاہوں کے سدا ڈولتے ہیں

میری کھڑکی کے وہ قبضوں سے لٹکتے ہوئے پٹ
جس میں آباد ہے دیمک کی بڑی کالونی
رات ہوتی ہے تو اک راگ سا چھڑ جاتا ہے
کئی انجانی زبانوں میں وہ کچھ بولتے ہیں

میرے اعصاب ابھی تک ہیں سلامت شاید
ذہن سے عقل کا رشتہ نہیں ٹوٹا ہے ابھی
اب بھی آتے ہیں خیالات مسلسل ایسے
اپنے اطراف کے ماحول کو جو تولتے ہیں

○

پردیس سے ایک خط

آج اچانک یہ خیال آیا کہ پردیس سے میں
کوئی پیغامِ محبت تمہیں لکھ کر بھیجوں
کئی گھنٹوں سے یونہی بیٹھا ہوں میں خامہ بدست
سوچتا ہوں کہ یہ نامہ تمہیں کیوں کر بھیجوں
اپنے جذبات کی ، الفاظ میں تشریح کروں
یا اشاروں میں سوالِ دلِ مضطر بھیجوں
اَن گنت جاگتی راتوں کی حکایات لکھوں
یا کہ خوابیدہ دنوں کا کوئی منظر بھیجوں
حالتِ ہجر کی تعریف قلمبند کروں
کہ شکایات کا لے کر کوئی دفتر بھیجوں
دل کے احوال بیاں کروں میں دولفظوں میں
یا خیالات کی تفصیل رقم کر بھیجوں
چاہو تو طول دوں قصّے کو میں ساگر کی طرح
اور اگر چاہو تو کوزے میں سمندر بھیجوں

○

دجلہ اور مس سس پی

(اگست ۲۰۰۵ء میں کٹرینا طوفان کے بعد New Orleans میں لوٹ مار کے بعد)

دجلے نے مس سس پی کو پیغام یہ دیا
''ہم دونوں کی کہانیوں میں کوئی فرق ہے؟
بغداد کو جنہوں نے ملایا ہے خاک میں
نیواورلینز ان کی شقاوت سے غرق ہے
جو شہر تھا خلیج کے شہروں میں بے مثال
وہ شہر آج مبتلائے قہرِ برق ہے

موجوں نے تیری پھولتی لاشیں اٹھائیں ہیں
میرے بھی پانیوں میں بہت جسم بہہ گئے
نیواورلینز آج لٹیروں کی زد میں ہے
بغداد کے خزانے بھی اب کم ہی رہ گئے

تہذیبِ نَو کا تو ہے نمائندہ گر تو کیا
تہذیب میری گود میں پل کر جواں ہوئی
حالت ہماری ایک ہے وہ شرق ہو کہ غرب
دعویٰ ہے جس ترقی کا تجھ کو، کہاں ہوئی؟''

مشرقِ وسطیٰ میں بلند و بالا عمارتیں دیکھ کر

جنہیں قدرت نے دنیا بھر کی دولت سے نوازا ہے
بساطِ عالمی میں کس قدر وہ ناتواں ٹھہرے
کیے تعمیر شہر ایسے کہ جن سے خلد شرمائیں
نئی تعلیم کے میداں میں لیکن بے نشاں ٹھہرے
یہ ناداں لوگ کیسے ہیں، خبر یہ بھی نہیں رکھتے
نہ جانے ان کی قسمت کا ستارہ کل کہاں ٹھہرے
لکھی جاتی ہیں ان کی قسمتیں ایوانِ مغرب میں
جہاں بانی کیا کرتے تھے، اب ننگِ جہاں ٹھہرے

سیلاب

(یہ نظم پاکستان میں ۲۰۱۰ء کے سیلاب سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

اللہ مرے، کیسی قیامت کی گھڑی ہے
ہے قہر تر اہم پہ کہ ساون کی جھڑی ہے
جھیلے ہیں بہت پہلے ہی آلام، پہ اب کے
سیلاب بہت تیز ہے، آفت یہ بڑی ہے
پروا نہیں گر جھونپڑی دہقان کی ڈوبے
منعم کو فقط اپنی زمینوں کی پڑی ہے
سیلاب کا ریلا تو بہالے گیا سب کچھ
عزت ہے بچی سو وہ دوراہے پہ کھڑی ہے
کشکول لیے ہاتھ نہ پھیلائیں جہاں میں
غیرت مری ہر لمحے ضرورت سے لڑی ہے
پہلے ہی بہت پانی ہے پھر اے دلِ گریہ
کیوں آنکھ سے پیہم رواں اشکوں کی لڑی ہے
ایسی بھی خطا کیا ہوئی اس قوم سے، یارب!
کیا بھول ہوئی جس کی سزا اتنی بڑی ہے

مغربی کارٹونسٹ سے

آزادیٔ صحافت و اظہار کے لیے
کیا یہ ضرور ہے بنے وجہِ ملال تُو؟
دنیا کے سو کروڑ مسلمانوں کے لیے
یکلخت بن گیا ہے مجسّم سوال تُو
اسلام سے عناد نے تجھ کو بنا دیا
ابلیس اور اس کے حلیفوں کا پالتو
صیہونیت کی رد میں بھی کچھ لکھ سکے، تو لکھ
ایسا ہی ہے اگر کوئی مائی کا لال تُو
اسلامیوں سے بُغض نے اندھا کیا تجھے
وقت آ گیا ہے اپنے قلم کو سنبھال تُو
حرمت قلم کی تجھ سے سنبھلتی نہیں اگر
ذوقِ لطیف پر تو نہ بن یوں وبال تُو

شہرِ نگاراں

(کھلنا شہر کو گوگل کے نقشے پر دیکھ کر)

کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے

کبھی اس شہر میں چھوٹا سا تھا اک گھر ہمارا بھی
بس اک دالان تھا، کمرے تھے دو اور اک اُسارا بھی
وہ گھر، گھر ہی نہیں تھا، تربیت کا تھا ادارا بھی
جہاں بھی جائیں لیکن شام کو گھر لوٹ آتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
مرے دل میں خیال آتا ہے میرے شہر میں اب بھی

پکڑتے تھے جہاں ہم تتلیاں وہ باغ تو ہوں گے
منڈیروں پر سدا چلّانے والے زاغ تو ہوں گے
وہ دیواروں پہ اُپلے تھاپنے کے داغ تو ہوں گے
وہ دیواریں کہ جن پہ چڑھ کے ہم پھر کود جاتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر

ہم اپنے دوستوں کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے
وہاں امرود، جامن اور پپیتے توڑ کر کھاتے
کبھی بھٹے کے کھیتوں سے کئی بھٹے چرا لاتے
انہیں پھر بھون کر کیسے مزے سے سارے کھاتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
لبِ جُو بیٹھ کر پانی میں اپنے پاؤں لٹکا کر

نظارہ ہم کیا کرتے تھے دریا کی روانی کا
ہر اک لمحے بدلتا دیکھتے تھے رنگ پانی کا
فضا میں گونج اٹھتا تھا کوئی نغمہ جوانی کا
ندی کے بیچ میں ملّاح جب بنسی بجاتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
ہم اے شہرِ نگاراں تجھ کو اکثر یاد کرتے ہیں

ترے گلشن کو خوشبوئیں مرے سانسوں میں بستی ہیں
ترے بَن کا نظارہ کرنے کو آنکھیں ترستی ہیں
حسینائیں تری اب بھی مرے خوابوں میں ہنستی ہیں
ہنسی ایسی کہ جس کے سحر میں ہم ڈوب جاتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
یہی وہ شہر ہے جس کے کسی سنسنا گوشے میں

وہ اک گھر تھا کہ جس کے چار سو پھولوں کی تھی وادی
رہا کرتی تھی اس گھر میں مرے خوابوں کی شہزادی
مئے دیدار کی خاطر بہ شکلِ مَے کشِ عادی
ہم اس کوچے کے روزانہ کئی چکر لگاتے تھے
کبھی اس شہر میں ہم بھی خوشی کے گیت گاتے تھے
پھر ایسا وقت آیا ساری خوشیاں چھن گئیں ہم سے

تعصّب کا اٹھا عفریت اور اس شہر پر چھایا
کیا شیطان نے قبضہ دلوں پر، خوں کو گرمایا
پڑوسی بھائی کو بھائی کے ہاتھوں قتل کروایا
یقیں آتا نہ تھا ہم جس قدر بھی سر کھپاتے تھے
کبھی اس شہر میں کیا ہم خوشی کے گیت گاتے تھے؟

○

پشاور

(۱۶۔دسمبر ۲۰۱۴ء۔پشاور کے اسکول میں دہشت
گردوں کے ہاتھوں معصوم بچوں کے قتلِ عام پر)

کہاں ہیں وہ کہ جن کے دم سے تھے ہر گھر میں اجیالے
بڑے پیارے وہ بچے تھے، بڑے ہی لاڈ کے پالے
خداوندا! یہ کیسا ظلم ہے، کیسی ہے سفّاکی
یہاں پر بھیڑیے بستے ہیں انسانوں کے منہ والے
کوئی بھی گھر نہیں ایسا پشاور میں کہ جس گھر سے
نہ اٹھی ہوں صدائیں درد کی، گونجے نہ ہوں نالے
غم و اندوہ سے سینے پھٹے جاتے ہیں ماؤں کے
نظر میں پھرتے ہیں چہرے کہ جیسے موتیے، لالے
ہمیں ان کا نہیں ہے غم، کہ وہ جنت کے طائر ہیں
خدایا ان کے گھر والوں پہ اب تو رحم فرما لے

○

- افسانہ -

خالی ہاتھ

جمیل عثمان

10۔دسمبر 1972ء کی رات تھی۔ بنگلہ دیش کو وجود میں آئے ایک سال ہو چلا تھا۔ یہ ایک سال پاکستانی فوج کا ساتھ دینے والوں پر بہت بھاری گزرا تھا۔محمد پور کے بیشتر مکانات لوٹے جا چکے تھے۔ کچھ کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔

ایک مکان ایک سال گزرنے کے بعد بھی محفوظ رہا تھا۔اس کی دو وجوہ تھیں۔ایک تو ''تھانہ اس گھر کے قریب تھا'' جہاں بھارتی فوج تعینات تھی، دوسرے ''انٹرنیشنل ریڈ کراس کا کیمپ اس گھر کے سامنے تھا۔''

پاکستانی افواج کے ہتھیار ڈالنے کے دو اڑھائی مہینے بعد تک اس گھر کے مکیں باہر نہیں نکلے تھے۔ راشن وغیرہ ختم ہوتا تو بنگالی پڑوسی اور دوست پہنچا دیا کرتے۔ گھر والے خوش تھے کہ ان کا گھر اور جان و مال محفوظ رہے تھے۔

چند مہینوں بعد بھارتی فوج تھانے سے چلی گئی اور اس کا چارج مقامی پولیس کے ہاتھ میں آ گیا۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے بھی رخصت ہوئے اور کیمپ کا انتظام نوزائیدہ بنگلہ دیش ریڈ کراس نے سنبھال لیا۔

اس گھر میں جو خاندان رہتا تھا وہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔محمد آصف اور ان کی بیگم، دو بیٹیاں راشدہ اور خالدہ جن کی عمریں پندرہ اور سولہ سال تھیں، اور سب سے چھوٹا بیٹا عادل جو دس سال کا تھا۔

ان دنوں غیر بنگالیوں کے گھروں کی تلاشیاں معمول بن چکی تھیں۔ مکتی باہنی والے بے دریغ گھر میں گھس آتے۔ جسے جو چیز پسند آتی وہ بے تکلفی سے اٹھا کر چلتا بنتا، جیسے وہ اسی کی ہو اور گھر والوں نے چوری کی ہو۔ اگر کوئی مدافعت کرتا تو اس کی شامت آ جاتی۔

پہلے دن ان حضرات نے تمام اہل خانہ کی گھڑیاں اتروالیں۔ایک نے ٹیلی ویژن کی طرف اشارہ کیا ''یہ میں لے جاؤں گا''

''لے جاؤ'' صاحبِ خانہ نے بخوشی اجازت دے دی۔ ٹیلی ویژن اٹھا لیا گیا۔ جاتے جاتے ایک نے میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کو اٹھایا اور نہایت اطمینان سے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

اسی روز سرِ شام ہی اس گھرے کا بجلی کا کنکشن کاٹ ڈالا گیا۔ چاروں سمت خوف کا راج تھا اور اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ گھر میں موم بتی بھی تو نہیں تھی۔ وہ سب چاروں طرف سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ رہے۔ایک دوسرے کو تسلی بھی دیتے جاتے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے شرارتاً بجلی اور ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے ہوں مقصد کچھ نہ ہو لیکن ان کے دل انجانے خوف سے لرز رہے تھے۔

نصف شب بیت چکی تھی کہ اس گھر کے سامنے دو بھاری بھر کم ٹرک آ کر رکے۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ تینوں بچے سہم گئے۔

''کون ہے؟'' آصف نے پوچھا۔

''دروا جا کھولو۔''

''تم کون ہے؟''

''کھولو!!'' کسی نے باہر سے ڈپٹ کر کہا۔

''پہلے بتاؤ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''نہیں کھولے گا تو ہم دروا جا تو ردے گا۔''

محمد آصف نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ بچوں کو لے کر اندر کے کمرے میں چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کانپنے لگا۔ اس پر پڑنے والی ضربوں سے سارا گھر لرز رہا تھا۔ دروازہ ٹوٹنے میں تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ محمد آصف نے اندر والے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔محمد آصف نے دروازہ بند کر کے اس کے آگے کرسیاں وغیرہ لگا دیں۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور اب ڈاکو اندر آ گئے تھے۔ اب دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر زور آزمائی شروع ہو گئی تھی۔ جب یہ دروازہ بھی ٹوٹنے کو آیا تو سب تیسرے کمرے میں چلے گئے اور اس کا دروازہ بند کر لیا۔اسی طرح ہوتا رہا۔ یہ لوگ سمٹتے ہوئے مکان کے اندرونی حصے میں جاتے رہے اور لٹیرے دروازے توڑتے اور اندر داخل ہوتے رہے۔ محمد آصف نے چاہا کہ پچھلے دروازے سے آنگن میں نکل جائیں اور کسی طرح پڑوس میں خبر کر دیں۔ مگر آنگن میں بھی دو تین غنڈے بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ اور کیا پڑوسیوں کو خبر نہ ہو گی؟ اتنا تو شور ہو رہا تھا۔ گاڑیاں اور ٹرک کھڑے تھے۔ دروازے توڑے جا رہے تھے۔ شور تو دور تک سنائی دیتا ہو گا۔ مگر انارکی کے اس دور میں کس میں ہمت تھی کہ ان لوگوں کو روکتا۔

گھر والے آخری کمرے میں محصور ہو چکے تھے، مگر وہاں بھی پناہ نہ ملی۔اب آنگن کی طرف والے دروازے پر بھی ضربیں پڑنے لگی تھیں۔ عادل سہما ہوا تھا۔ لڑکیوں پر بھی تھرتھری طاری تھی۔ محمد آصف بے بسی سے کبھی ایک دروازے کی طرف جاتے تو کبھی دوسرے دروزاے کی طرف بھاگتے۔ آخر کار دروازے ٹوٹ گئے۔ وہ بندوقیں اور سنگینیں اور فلش لائٹس لیے اندر گھس آئے اور آتے ہی محمد آصف پر پل پڑے۔ چار آدمی انہیں گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور غسل خانے میں دھکیل دیا، پھر عادل کو بھی اٹھا کر غسل خانے میں پھینکا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا اب بیگم آصف اور دونوں لڑکیاں باہر تھیں۔انہوں نے بیگم کو بھی غسل خانے میں جانے کو کہا مگر وہ نہیں گئیں۔ چیخ کر بولیں:

''تم شوق سے گھر کا سارا سامان لے جاؤ مگر میں اپنی لڑکیوں کو نہیں چھوڑوں گی۔ یہ بھی میرے ساتھ ہی غسل خانے میں جائیں گی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بیٹیوں کے لانبے بال اپنے دونوں ہاتھوں میں کئی پیچ دے کر لپیٹ لیے۔ انہیں بدمعاشوں کی نیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔انہوں نے دونوں کو اپنے آپ سے

چمٹا لیا تھا۔ جب غنڈوں نے یہ دیکھا تو مشتعل ہو گئے اور بیگم آصف سے زور آزمائی کرنے لگے۔ آصف بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔ عادل دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

آصف نے دروازے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے چیخ کر کہا:

''اگر آج میری بچیوں کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔''

بیگم آصف تن تنہا اپنی بیٹیوں کی عزت کی خاطر غنڈوں سے نبرد آزما تھیں۔ خدا نے انہیں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت بخش دی تھی کہ بے تحاشا ڈنڈے برس رہے تھے مگر وہ لڑکیوں کے بال چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ غنڈے لڑکیوں کو ان سے الگ کرنے کے لیے جھنجھوڑ رہے تھے لیکن وہ تھیں کہ انہوں نے دونوں لڑکیوں کے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے انہیں بھینچ رکھا تھا۔ جب انہیں گھسیٹا جاتا تو لڑکیاں بھی ان کے ساتھ گھسٹتی چلی جاتیں اور جب دھکیلا جاتا تو تینوں ساتھ ہی زمین پر گر پڑتیں۔ بال کھینچنے کی وجہ سے دونوں لڑکیوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ وہ زار زار رو رہی تھیں، منتیں کر رہی تھیں لیکن کوئی ان کی نہیں سن رہا تھا۔ اس دوران بیگم آصف کو نہ جانے کتنی مار پڑی۔ ان کے سر سے خون بہنے لگا، آنکھیں سوجھ گئی تھیں اور چہرے پر خراشیں اور نیل پڑ گئے تھے مگر خدا نے انہیں اتنا حوصلہ عطا کر دیا تھا کہ انہوں نے لڑکیوں کو خود سے الگ نہیں کیا۔ محمد آصف کبھی غسل خانے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرتے، کبھی قفل کے سوراخ سے باہر جھانکتے اور ہاتھ ملتے۔ بے بسی میں انہوں نے اپنا سر دروازے سے دے مارا۔

ادھر یہ سب ہو رہا تھا۔ اُدھر غنڈوں کے دس بارہ ساتھی گھر کا سارا سامان ٹرکوں پر لاد رہے تھے۔ پلنگ، الماریاں، صوفے، کرسیاں، پنکھے، سلائی مشین، گھر کے برتن یہاں تک کہ پکی ہوئی ہانڈیاں بھی کھانوں سمیت ٹرکوں پر لاد دی گئیں۔

چار مرد مل کر بھی راشدہ اور خالدہ کو ان کی ماں سے الگ نہیں کر سکے۔ ان کا سر پھٹ گیا تھا۔ لباس تار تار ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ تنگ آ کر غنڈوں نے دھمکی دی: ''اگر تم نے لڑکیوں کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بندوقیں لوڈ کرنے لگے۔ دونوں لڑکیاں ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں، مگر بیگم آصف پُرعزم تھیں۔ انہوں نے کہا:

''تم بے شک مجھے مار دو۔ مگر میرے جیتے جی تم میری بیٹیوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔''

قریب تھا کہ غنڈے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے کہ ان کا ایک ساتھی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ باہر ایک اور گروہ آ رہا ہے۔

ان دنوں لٹیروں کے غول کے غول شہروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ ہر گروہ لوٹ مار میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا۔ ان میں آپس میں رقابتیں اور دشمنیاں بھی ہو گئی تھیں۔ اکثر مال غنیمت ہتھیانے کے لیے آپس میں گولیاں بھی چلتیں اور فسادات شروع ہو جاتے۔ آنے والے نے متنبہ کیا کہ لڑکیوں کے چکر میں لوٹ کے مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مخالف گروہ کے آنے کی خبر سن کر غنڈے ایسے بدحواس ہوئے کہ سب کچھ بھول کر باہر کی طرف بھاگے۔ کود کود کر ٹرکوں میں سوار ہوئے اور ٹرک زناٹے بھرتے ہوئے ایک کے پیچھے ایک روانہ ہو گئے۔ ان ٹرکوں پر محمد آصف کی پچیس برس کی کمائی لدی ہوئی تھی۔

بیگم آصف اور ان کی بیٹیاں لڑکھڑاتی ہوئی غسل خانے کی طرف بڑھیں، دروازہ کھولا اور اندر چلی گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کر کے یہ لوگ سانس روکے اندر بیٹھے رہے۔ باہر گیٹ پر گاڑیاں رکنے کی آوازیں آئیں۔ بھاری بوٹوں کی آواز اندر آئی۔ قدموں کی آوازیں کبھی دور چلی جاتیں اور کبھی باتھ روم کے دروازے کے قریب سنائی دیتیں۔ اندازے سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی افراد ہیں جو مختلف کمروں میں گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔ باتیں کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''سارا گھر خالی پڑا ہے۔''

''گھر والے کہاں گئے؟''

''کوئی لاش بھی تو نظر نہیں آ رہی۔''

محمد آصف اور ان کے گھر والے اتنے دنوں بنگال میں رہ چکے تھے کہ بنگلہ زبان میں ہونے والی ان قیاس آرائیوں کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ ان پانچ نفوس کا اس وقت یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ ایک دوسرے سے لگے ہوئے سہمے بیٹھے تھے۔ سانس بھی احتیاط سے لے رہے تھے کہ کہیں اس کی آواز دشمنوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ گھر کی ہر چیز تو لٹ چکی تھی۔ صرف ایک عزت باقی رہ گئی تھی۔

''یا اللہ یہ آخری دروازہ نہ ٹوٹے۔'' صدق دل سے وہ لوگ اس وقت اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آوازیں دور جاتی سنائی دیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ گاڑی کی آواز سناٹوں میں گم ہو گئی۔

11۔ دسمبر 1972ء کی صبح طلوع ہوئی تو اس گھر میں ایک تنکا بھی نہیں تھا۔ جس کے جسم پر جو کپڑا تھا وہی بچا تھا۔ بیگم آصف، خالدہ اور راشدہ کے تو کپڑے بھی تار تار تھے۔ ماں اور بیٹیاں زخموں سے چور تھیں۔ لڑکیوں کی گردنوں کے پچھلے حصے بال کھینچے کی وجہ سے پھول گئے تھے۔

بیگم آصف نے احتیاطاً کچھ روپے اور زیورات اپنے بنگالی پڑوسن کے گھر رکھوا دیے تھے۔ (ان چنگاریوں کی بھی اپنی تب و تاب تھی) دوسرے دن آصف وہ پیسے لے کر بازار گئے اور کھانے پینے کی چیزیں اور ضرورت کے مطابق کپڑے خرید لائے۔ رات ہونے سے پہلے پہلے یہ خاندان ڈھاکہ سے میسور جانے والے طیارے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس کی اگلی منزل کلکتہ تھی جہاں سے اسے نیپال ہوتے ہوئے وطن پاک پہنچنا تھا۔

طیارے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس خاندان کے ہر فرد کے ہاتھ خالی تھے۔

- افسانہ -

چیئرمین

جمیل عثمان

حبیب کو امریکہ آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک اسے ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی۔ ہر نئے آنے والے کی طرح وہ کبھی یہاں، کبھی وہاں چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ کبھی میکڈونلڈز میں تو کبھی ڈنکن ڈونٹس میں ،کبھی وال مارٹ میں تو کبھی شاپ رائٹ میں کبھی کسی گیس اسٹیشن پر تو کبھی کسی سب وے ٹرین اسٹیشن کے اسٹال پر۔

پاکستان سے اس نے بی کام کیا ہوا تھا مگر یہاں اس کی پاکستانی ڈگری قابل قبول نہیں تھی۔ اس کا Evaluation ہوا تو معلوم ہوا کہ امریکی معیار کے مطابق اس کی حیثیت یہاں کے بارہویں جماعت کی ہے۔ نیویارک میں جوتیاں چٹخاتے ہوئے اسے کئی سال ہو گئے۔ آخر تیسرے سال اسے ایک کارپوریٹ کمپنی میں جونیئر اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل ہی گئی۔ حبیب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بالآخر وہ بھی وائٹ کالر لوگوں میں شمار ہونے لگا۔

نئے آفس کا ماحول بہت اچھا تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن نیویارک کی ایک بڑی سی عمارت کی بارہویں منزل اس کی کمپنی نے پوری کی پوری کرائے پر لی ہوئی تھی۔ اسٹاف کے لیے الگ الگ کیوبیکلز (Cubicles) بنے ہوئے تھے۔ حبیب سکون سے ایک کونے میں بیٹھا اپنا کام کیا کرتا تھا۔ دفتری اوقات صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک تھے۔ ہفتے اور اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ اسٹورز یا گیس اسٹیشن کی طرح نہیں کہ ہفتے اور اتوار کو بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ پھر تین مہینے مکمل ہونے کے بعد حبیب کو بہت سارے مراعات بھی ملنے والے تھے۔ سال میں تنخواہ کے ساتھ دو ہفتوں کی چھٹی، بیمار ہوں تو اس کی چھٹی الگ، گھر میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے یا خدانخواستہ کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس کی چھٹی بھی ملتی تھی۔ میڈیکل انشورنس، زندگی کا بیمہ اور ریٹائرمنٹ پلان جسے عرف عام میں 401K کہتے ہیں، سب کچھ اس کو ملنے والا تھا۔

کمپنی کا رواج تھا کہ نئے اسٹاف سے کمپنی کے چیئرمین ملاقات کیا کرتے تھے۔ حبیب نے جب جوائن کیا تو چیئرمین صاحب بزنس ٹور پر بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ وہ کب آئے پتہ بھی نہیں چلا۔ ایک روز اس کے پاس ایڈمنسٹریشن سے ای میل آیا کہ پچھلے ایک مہینے میں جتنے نئے لوگ ملازمت پر رکھے گئے ہیں ان سے چیئرمین صاحب ملاقات کریں گے۔ جس روز حبیب کو ای میل ملا اس روز منگل تھا اور اگلے پیر کی صبح دس بجے میٹنگ طے ہوئی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ میٹنگ سے پہلے شرکا کو ناشتہ بھی پیش کیا جائے گا۔ حبیب کا دل دھڑک رہا تھا، نہ جانے کیا پوچھیں، اس نے سوچا۔ اس نے کچھ پرانے ملازمین سے معلوم بھی کیا کہ جب وہ نئے نئے آئے تھے تو چیئرمین کے ساتھ ان کی میٹنگ کیسی رہی تھی۔ سبھوں نے یہی کہا کہ بہت اچھی رہی تھی اور یہ کہ چیئرمین صاحب بہت خوش اخلاق آدمی ہیں۔

''کیا وہ فرداً فرداً سب سے ملتے ہیں؟'' اس نے ایک کولیگ سے پوچھا۔

''نہیں، ہمیشہ چار چھ آدمیوں کا گروپ ہوتا ہے۔''

حبیب کو قدرے اطمینان ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اکیلے ملنا پڑا تب تو وہ بہت نروس ہو جاتا۔ حبیب کو پاکستان میں اپنے آفس کے چیئرمین صاحب یاد آئے۔ ان سے اگر کبھی ملنا پڑتا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ اوّل تو اس کی نوبت ہی کبھی نہیں آتی تھی اور اگر ملنا ہوتا تو چیئرمین صاحب نہایت حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے رُکھائی سے بات کرتے۔ کیونکہ وہ کلرکوں یا چھوٹے موٹے ملازمین سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔

پاکستان کے چیئرمین صاحب کے کیا ٹھاٹھ تھے۔ لمبی مرسیڈیز گیٹ پر آ کر رکتی تھی تو چپراسی بھاگ کر دروازہ کھولتا، تب صاحب اُترتے تھے۔ اردلی ان کا بریف کیس اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چلتا اور ان کے کمرے کے آگے پہنچ کر دروازہ کھولتا تو صاحب اندر داخل ہوتے اور لوگوں کو چائے پیالیوں میں ملتی تھی مگر ''بڑے صاحب'' کے لیے پوری ٹرے سجا کر لے جائی جاتی جس میں چائے، دودھ اور شکر سب الگ الگ رکھے ہوتے۔ چیئرمین صاحب اور دوسرے اونچے افسران کے لیے دوپہر کا کھانا بھی آفس میں ہی پکتا اور ان لوگوں کے کھانے کا کمرہ بھی چھوٹے درجے کے اسٹاف کے کھانے کے کمرے سے الگ تھا۔ بھلا اونچے رتبے والے افسران معمولی کلرکوں کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھانا کھاتے۔ ان کی شان میں فرق نہ آ جاتا؟ حبیب نے ایک مرتبہ یہ مصرعہ لکھ کر آفس کی دیوار پر لگا دیا تھا:

''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے''

اس کا ان لوگوں پر کیا اثر ہوتا، اُلٹا اسے ڈانٹ پڑی اور وارننگ دی گئی کہ آئندہ ایسا کرنے پر اسے نوکری سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔

اس دفتری ماحول سے نکل کر حبیب امریکہ آیا تھا۔ چیئرمین صاحب سے ملنے کا دن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس میٹنگ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ذہن میں وہ فرضی سوالات بناتا جو اس کے خیال میں چیئرمین صاحب اس سے پوچھ سکتے تھے اور پھر ان کے جوابات بہت وقار کے ساتھ، اچھی انگریزی میں، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیتا۔ اس کی انگریزی اچھی تھی پھر بھی اسے اپنے ہندو پاکستانی لہجے کا بڑا خیال تھا۔ وہ ''ٹی'' (چائے) کو ''ٹھی'' بولنے کی کوشش کرتا اور ''پاور'' کو ''پھاور'' کہنے کی مشق کرتا۔ گراسری کرنے جاتا تو ٹماٹر کو ''ٹومیٹو'' کی بجائے ''ٹھومیٹھو'' کہتا کیونکہ ایک بار وہ

ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ سے سینڈوچ بنوا رہا تھا، دکاندار نے اس سے پوچھا کہ اس میں کیا ڈالے تو حبیب نے کہا تھا: ''لیٹوس اینڈ ٹومیٹوز'' دکاندار اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اسے یہ سپاٹ زبان سمجھ میں نہیں آئی۔ حبیب کے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک صاحب نے منہ ٹیڑھا کر کے امریکی لہجے میں کہا ''لیٹس اینڈ ٹھومیٹھوز'' تب دکاندار کی سمجھ میں آیا۔ اس دن کے بعد حبیب اپنے لہجے کا بڑا خیال رکھنے لگا تھا۔

آخر پیر کا دن آ ہی گیا۔ اس روز حبیب اپنے بہترین کپڑوں میں دفتر گیا۔ سوٹ، ٹائی اور چمچماتا ہوا جوتا پہنے وہ میٹنگ روم میں داخل ہوا تو ایک شخص میز پر ناشتہ لگا رہا تھا۔ کیٹرر سینیوں میں ناشتے کا سامان رکھ گیا تھا جو شفاف پلاسٹک کی شیٹس سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس نے پلاسٹک کو اتارا اور کھانے کو میز پر قرینے سے لگا دیا۔ پیپر پلیٹس، پلاسٹک کے کانٹے اور چمچے، پانی اور چائے/کافی پینے کے گلاس اور نیپکنز رکھ دیے ساتھ ہی پانی کی بوتلیں اور سافٹ ڈرنکس کے کینز بھی رکھ دیے۔ کمرے میں کل چھ نئے ملازمین تھے جن میں دو خواتین اور چار مرد تھے۔

''خواتین و حضرات'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا، ''آپ ناشتہ کیجیے، میٹنگ دس منٹ میں شروع ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

سب لوگ ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ بیگلز، کپ کیکس، کوکیز، بن، کروزاں اور انواع و اقسام کے بسکٹس رکھے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے باؤل میں کٹے ہوئے پھول تھے۔ تربوز، خربوزے، انناس، اسٹرابیری، سیب، انگور وغیرہ۔ چائے اور کافی کا بھی انتظام تھا۔ سب لوگ مزے سے کھاتے رہے اور گپ شپ کرتے رہے۔

دس منٹ کے بعد وہ شخص کمرے میں داخل ہوا جو ابھی ناشتہ لگا کر گیا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے پوڈیم پر آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

''خواتین و حضرات، میرا نام ولیم بنٹلے ہے اور میں اس کمپنی کا چیئرمین ہوں۔۔۔''

حبیب منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔

- بقیہ -

اُجلی اُجلی کہانیاں

دو کہانیاں ایسی ہیں جو مجھے کمزور لگیں۔ کہانی ندامت کے اختتامیے نے مجھے کافی مایوس کیا شاید فکری طور پر وہ مجھے اپنے سے دُور لگی۔ مالِ غنیمت، بینک ڈکیتی کی واردات پر مبنی کہانی ہے کہانی کار نے اس کہانی کو پھیلانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ سلوٹیں رہ گئی۔

قیدی اور دوسرا راستہ دو بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ جمیل عثمان نے ان کہانیوں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بڑے سے بڑے اور سفاک سے سفاک انسان کے اندر بھی انسانیت کسی نہ کسی صورت موجود ہوتی ہے۔ ان دونوں کہانیوں کے بڑے کرداروں میں پچھتاوے کے احساسات اُن کے اندر کی بھلائی کو جگا دیتے ہیں۔ جیسے ایک کردار جیل کا نگران ہے۔ (افسانہ قیدی) بہت ظالم ہے۔ قیدیوں کا مارتا پیٹتا ہے اور جب وہ ایک قیدی لڑکے کو مار مار کر لہولہان کرتا ہے بعد ازاں پوری رات پچھتاوے کے باعث سو نہیں سکتا۔ صبح وہ لڑکے سے معافی مانگتا ہے اور جب لڑکا رہائی کی درخواست کرتا ہے تو اُس سخت گیر جیلر کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے ''میں تو خود یہاں ایک قیدی ہوں۔''

جمیل عثمان کی کہانیوں میں بہت زیادہ کٹھن اور نفسیاتی الجھنیں نہیں ملتیں۔ زندگی کی اس گنجلک دوڑ میں پھنسے ہوئے قاری کو وہ کہانیوں میں مخمصے ڈال کر نہیں پھنساتا۔ وہ قاری کو مشغول رکھنے کے لیے خوشگوار احساسات فراہم کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ قاری کو انسان کے اعلیٰ ہونے کے تفاخر سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔

اوّل اور آخر یہ کہ جمیل عثمان اپنے روشن ذہن، شفاف دل اور اُجلے قلم سے اُجلی اُجلی کہانیاں لکھتا ہے۔

☆

- فکاہیہ -

زبان کی کھچڑی

جمیل عثمان

اسکول کے زمانے میں ہمارا ایک میمن کلاس فیلو اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ ہمارا تو تھا ہی وہ لنگوٹیا یار۔ ہمارے گھر والوں سے بھی اس کی بڑی بے تکلفی ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہوگئی تھی۔ ایک روز ہم دونوں Living Room میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اٹھ کر کسی کام سے دوسری طرف چلے گئے۔ اسی دوران میں والد صاحب نہا کر غسل خانے سے باہر آئے اور ہمارے دوست کے قریب ہی بیٹھ گئے اور اس سے کہا ''بیٹے ذرا میرے کمرے میں جاؤ اور اٹیچی میں سے بنیان تو نکال لاؤ۔''

اب اسے نہ اٹیچی معلوم اور نہ بنیان! وہ بڑا اسٹپٹایا۔ اندر آیا اور ہم سے پوچھنے لگا ''یار۔۔۔ یہ اٹیچی کیا ہوتا ہے؟'' ہم نے کہا ''بکس'' اس نے پھر پوچھا ''اور بنیان؟'' ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ بنیان کو کیا کہتے ہیں۔ ہم نے اپنی بنیان اسے دکھائی اور کہا ''یہ!'' ''اوہ! گنجی!!'' وہ بے ساختہ بولا اور پھر جا کر اٹیچی میں سے ''بنیان'' یعنی بکس میں سے ''گنجی'' نکال کر والد صاحب کو دے آیا۔

سعودی عرب اور خلیج کے دوسرے ممالک میں جو پاکستانی نئے نئے آتے ہیں، انہیں اپنے ہی ملک کے لوگوں کی زبان سمجھنے میں اسی طرح کی دقت پیش آتی ہے جیسی ہمارے دوست کو آئی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ دس دس اور پندرہ پندرہ سال سے مقیم ہیں۔ ان کی اردو اور پاکستان کی اردو میں اب بہت فرق ہوگیا ہے۔

1983ء میں جب ہم نئے نئے سعودی عرب میں وارد ہوئے تھے تو ہمارا دفتر شارع ستین (امیر فہد اسٹریٹ) پر Water & Sewerage Board کی بلڈنگ کے پیچھے واقع تھا۔ ہمارے دوست سراج منیر ہم سے دو سال پہلے سے جدہ میں مقیم تھے۔ ایک روز ان کا فون آیا ''بھائی، آپ کا دفتر کُبری کے کس طرف ہے؟''

''کبری؟'' ہم نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں ہاں! شارع فلسطین پر جو کُبری ہے؟''

''یہ کُبری کیا بلا ہے؟''

''اچھا اچھا!'' وہ سمجھ گئے ''اماں، شارع فلسطین پر جو پُل ہے۔''

''اوہ۔۔۔ آپ پُل سے نیچے آیئے۔۔۔'' ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''نیچے کس طرف کو؟ یعنی اگر میں مطار قدیم کی طرف سے آرہا ہوں تو؟''

اب ہم مطار قدیم پر اٹکے۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے چڑ کر کہا: ''Old Airport یار!''

''ہاں۔۔۔ تو آپ پرانے ائیر پورٹ سے آرہے ہیں۔۔۔ پُل سے اتر کر کچھ دور جائیں گے تو بائیں طرف۔۔۔''

''مصلحۃ میاہ و مجاری ہے'' انہوں نے ہماری بات کاٹی۔

''پتا نہیں۔۔۔ مگر Water & Sewerage Board کا آفس ہے۔'' ہم نے کہا۔

''وہی وہی!''

''بس اس کے پیچھے آجایئے۔'' ہم نے خوش ہو کر کہا ہماری جان چھوٹی۔

☆

آدھ گھنٹے کے اندر وہ ہمارے دفتر میں تھے۔ ''کیسے آئے؟'' ہم نے سوال کیا۔

''خط سے آئے ہیں۔''

ہم سعودی عرب کے نظام ڈاک پر عش عش کر اٹھے کہ اتنے بڑے جیتے جاگتے انسان کو بھی بذریعہ خط بھیجا جاسکتا ہے اور سرعت انتظام دیکھئے کہ آدھا گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ بندہ حاضر!

''لفافے میں خود ہی داخل ہو کر ٹکٹ چپکا کر خود کو ڈاک کے حوالے کر دیا تھا یا یہ فریضہ کسی اور نے انجام دیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''یعنی یہ جو آپ خط سے آئے ہیں تو ہمیں یہ اشتیاق ہوا کہ اس کا طریقہ کار معلوم کرلیں تاکہ کبھی ہم بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔''

''میرے بھائی، خط کا مطلب بذریعہ ڈاک نہیں۔۔۔ یہاں منی بس کو خط کہتے ہیں۔'' انہوں نے ہمیں سمجھایا۔

''اوہ! اچھا اچھا!!'' بات اب ہماری سمجھ میں آئی۔

☆

دفتر سے نکل کر ہم بس کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ان کے کسی دوست سے ملاقات ہوگئی۔

''آہا آہا۔۔۔ ریحان صاحب۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟''

''الحمدللہ ٹھیک ہوں!''

''اور آج کل دن کیسے گزر رہے ہیں؟''

''دن تو کام میں گزر ہی جاتا ہے مگر رات بڑی مشکل سے کٹتی ہے۔'' ریحان صاحب نے کہا۔

''بھلا وہ کیوں؟''

''فیملی جو نہیں ہے!''

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اور وہ آپ کی صَیدلیہ کیسی ہے؟'' رازداری سے پوچھا گیا۔

''ٹھیک ہے!''

ہم سمجھے شاید ان صاحب کی محبوبہ کا نام صَیدلِیَہ ہوگا۔ ان پر غصہ بھی آیا کہ فیملی نہیں ہے تو محبوبہ۔۔۔! مگر استفسار پر ہمیں بتایا گیا کہ وہ صاحب دراصل فارمیسسٹ ہیں اور ''صَیدلِیَہ'' یہاں فارمیسی کو کہتے ہیں۔

☆

جہاں کوئی لفظ نہ جاننے کی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہیں بعض اوقات خوشگوار حیرت بھی ہوتی ہے جب اگلا شخص کوئی ایسا لفظ بول دے جو آپ سمجھتے ہوں۔ ایک بار ہمیں ملک سے باہر جانے کی ضرورت پڑی تو ہم نے اپنے آفس کے مراقب کو بلوایا تاکہ اپنے پاسپورٹ پر خُرُوج عُودَہ لگوا سکیں۔ (آپ نے غور کیا کہ ہم بھی اب ویسی ہی اردو بولنے لگے ہیں؟ مثلاً مراقِب اور خُرُوج عُودَہ!!)

مراِب آیا اور ہم سے بولا ''جِب باسبورت!''

ہم سمجھے کہ انگریزی بول رہا ہے اور چونکہ عربی میں ''گاف'' نہیں ہے لیے Give کو ''جِب'' کہہ رہا ہے۔ مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ عربی میں Give کا متبادل لفظ ''جِب'' ہی ہے اور خوشی ہوئی کہ کسی لفظ سے ہم آشنا ہیں۔

کچھ ایسا موقع بھی آیا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگلا آپ کی زبان نہیں سمجھ رہا ہے اور سے کچھ سخت سست کہہ دیتے ہیں تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی دکاندار کی کوئی بات اخلاق سے گری ہوئی سنی تو ہم نے اپنے ساتھی سے آہستہ سے کہا ''عجب جاہل ہے!'' اب ہمیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ جاہل عربی کا لفظ ہے اور انہیں معنوں میں بولا جاتا ہے جن معنوں میں ہم نے کہا تھا۔ پھر کیا تھا۔ وہ دکاندار تو ہماری جان کو آ گیا کہ ''تم نے مجھے جاہل کیوں کہا'' پہلے تو ہم نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے مگر جب وہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تو ہم نے بھی جوابی حملہ کیا۔ اسے دھمکی دی کہ اس نے جو بیہودہ بات کہی ہے وہ ہم پولیس کو بتا دیں گے بلکہ قریب سے گزرتی ہوئی شرطہ (پولیس) کی گاڑی کی طرف لپکے بھی۔ گاڑی تو آگے بڑھ گئی مگر اس لپکنے میں جو ہم اس دکاندار کی عملی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور پھر واپس نہیں گئے۔ ہمارے ساتھی بعد میں ہم سے آ ملے۔

اب آپ کی خدمت میں گنگا جمنی اردو کی بجائے سعودی پاکستانی اردو میں گفتگو کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔

''السلام علیکم۔ جناب!''

''وعلیکم السلام۔''

''اور سنایئے، کیا حال ہیں؟''

''الحمدللہ بالکل ٹھیک! آپ کیسے ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''کیا بات ہے؟ آپ کی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے؟''

''وہ جناب وَرشہ (ورک شاپ) میں دیا ہوا ہے۔''

''خیریت تو ہے، کیا خرابی ہوگئی؟''

''اس کا مُکَیف (ائیر کنڈیشنر) کام نہیں کر رہا تھا اور آپ کے کیا شغل (کام) ہیں آج کل؟''

''کچھ نہیں یار! بس صاحب العمارۃ (مالک مکان) نے تنگ کیا ہوا ہے!''

''کیا کہتا ہے؟''

''کہتا ہے تمہارے بچے بہت ہیں!'' میں تو اب دوسرے شُقّے (فلیٹ) کی تلاش میں ہوں۔''

''ہمارے عمارے (بلڈنگ) میں ایک شُقّہ (فلیٹ) خالی ہے۔''

''اچھا! پھر تو آپ صاحب العمارۃ سے ضرور ہمارے لیے بات کیجیے۔''

''ضرور''

''اور یہ بتایئے آپ کے گھر میں پہنچوں گا کیسے؟ میں نے سوچا کہ آکر وہ شقہ دیکھ ہی لوں۔''

''ہاں ہاں۔۔۔ آپ ایسا کریں۔۔۔ فلسطین روڈ سے شارع اربعین پر مڑیں اور علیٰ طول (سیدھے) چلتے رہیں۔ پہلے اشارے کے بعد میاہ صِحّہ (صاف پانی) کی دکان آئے گی۔ اس سے دائیں مڑ جائیں۔ تھوڑی دُور جائیں گے تو بائیں طرف ایک بقالہ (گراسری کی دکان) نظر آئے گی۔ بس اس کے برابر والے عمارے میں شقہ نمبر 2 دور ارضی (گراؤنڈ فلور) پر میرا مکان ہے۔''

''میں آؤں گا تو آپ ہماری خاطر تو کریں گے نا؟۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ مذاق میں کہہ رہا ہوں!''

''ضرور خاطر کریں گے۔ آج کل فیملی گئی ہوئی ہے اس لیے اپنا تو گزارہ شاورما (سینڈوچ) پر ہے۔ ویسے ثلاجہ (فریج) میں خُبز (روٹی)، جُبنَہ (پنیر) اور لَبَن (دہی) پڑے رہتے ہیں۔ اسی سے آپ کی خاطر کروں گا۔۔۔ ہوہوہو۔۔۔!!''

''ہی ہی ہی!۔۔۔ اچھا مع السلامہ۔''

''مع السلامہ!'' (خدا حافظ)

''نظامِ زندگی''

کرونا نے ابھی تک اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں
نہیں معلوم خلقت کو ملے گی کب نجات اس سے
نہ وہ احباب کی محفل، نہ ربط و رابطہ باہم
نظامِ زندگی اَبتر، دِگرگوں ہے حیات اِس سے

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

"صدائے مرحبا"

نعتِ رسولؐ

عجب منظر کھُلا ہے اور مَیں ہوں
درِ خیر الوریٰ ہے اور مَیں ہوں
مراحاجت رَوا ہے اور میں ہوں
عطائے بے بہا ہے اور میں ہوں
زباں پر مدحتیں ہی مدحتیں ہیں
اُنہی ﷺ کی یہ عطا ہے اور میں ہوں
مدینے حاضری جب سے ہوئی ہے
"دِلِ بے مدّعا ہے اور مَیں ہوں"
مَیں خود کو بھر رہا ہوں روشنی سے
درِ انوار وَا ہے اور مَیں ہوں
سجی ہے نور کی محفل، سو دل میں
چراغاں ہو رہا ہے اور میں ہوں
لبوں پر اَور کیا الفاظ آئیں؟
فقط صلِ علیٰ ہے اور مَیں ہوں
نظر کے سامنے ہے سبز گنبد
صدائے مرحبا ہے اور مَیں ہوں
دعائیں ہوں سبھی منظور میری
یہی حرفِ دعا ہے اور میں ہوں
ابھی تو چشمِ نم سے گفتگو ہے
ابھی تو ابتدا ہے اور میں ہوں
یہیں سے ابتدا میری ہوئی ہے
یہیں اب انتہا ہے اور میں ہوں
خجالت اپنے سب اعمال پہ ہے
اب ان کا سامنا ہے اور میں ہوں
نسیمؔ اب حاضری میں ہو حضوری
لبوں پر التجا ہے اور میں ہوں

نسیم سحر
(راولپنڈی)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

رہے ہمیشہ یہی لبوں پر، درود اُن پر! سلام اُن پر!
سکون مِلتا ہے دِل کو پڑھ کر، درود اُن پر! سلام اُن پر!

اُنھی کے جلوے زمیں کی زینت، اُنھی کے چرچے فلک کی رونق
سبھی کے ہادی، سبھی کے رہبر، درود اُن پر! سلام اُن پر!

شہِ رسولاں کا شہرِ طیبہ چمک رہا ہے، دمک رہا ہے
ہے کیف آور حَسین منظر، درود اُن پر! سلام اُن پر!

سبھی زمانوں میں شاہی اُن کی، سبھی زمانوں میں معتبر ہیں
وہ انبیا کے امام و سرور، درود اُن پر! سلام اُن پر!

زمیں پہ کوئی دِکھا سکے گا، فلک پہ کوئی بتا سکے گا
نہ اُن سے افضل، نہ اُن سے برتر، درود اُن پر! سلام اُن پر!

مِری سعادت ہے، میری عزّت، جو لکھ رہا ہوں میں اُن کی مِدحت
حَسین کتنا مِرا مقدّر، درود اُن پر! سلام اُن پر!

ہر ایک برکت، ہر ایک رحمت، انیسؔ سب کچھ حقیقتاً ہے
بہ فیضِ آلِ رسولِ انور، درود اُن پر! سلام اُن پر!

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

بَرشَور

محمد حمید شاہد
(اسلام آباد)

''اُس نے اپنی بیوی کے نام پر بیٹی کا نام رکھا۔۔۔۔اور بیٹی کے نام پر مسجد بنا ڈالی۔۔۔۔
چھی چھی چھی''

جب عبدالباری کاکڑ کی چھی چھی میرے کانوں میں پڑی، میں فضل مراد رودینی کی طرف متوجہ تھا اور یہ جان ہی نہ پایا، وہ افسوس کر رہا تھا، اس پر نفرین بھیج رہا تھا یا اُس کا تمسخر اڑاتی اُپنی ہنسی دبا رہا تھا۔

رودینی چال ڈھال اور لہجے کا پکا بلوچ تھا۔ بات کرتے ہوئے آدھا جملہ منہ ہی میں گھما کر نگل لیا کرتا یا یوں ہونٹ سکیڑ لیتا کہ اُدھ کہی بات بھی گرفت میں نہ آتی تھی لہٰذا اس کی بات سمجھنے کے لیے صرف اس کی طرف متوجہ رہنا پڑتا تھا۔

رودینی یہاں بلوچستان سے اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے وفاقی حکومت کی ہدایت پر لگ بھگ سارے صوبے کے قحط کی سی کیفیت سے دوچار علاقوں کا دورہ کر کے متاثرین کی بحالی کے لیے موزوں حکمت عملی تجویز کرنا تھی۔ ہم اسلام آباد سے تین آئے تھے، نورنشان خان ہماری کمیٹی کا کنوینئر تھا۔ وہ تھا تو چارسدے کا پٹھان، مگر اسلام آباد میں مستقل قیام اور وفاقی دارلحکومت کے سب سے بڑے کلب کی ممبر شپ نے اسے بڑے رکھ رکھاؤ والا بنا دیا تھا۔ وہ ہر فرد کو پورا پورا پروٹوکول دینے کا قائل تھا اور دیتا بھی تھا۔ اس کا ایسا کرنا شروع شروع میں اچھا لگتا، مگر جب وہ بَد لے میں ایسے ہی پروٹوکول کا متمنی نظر آنے لگتا تو بہت کوفت ہوتی۔ عمر اور مرتبے میں وہ ہم سب سے بڑا تھا، لہٰذا سب اس کی خواہش کا جیسے تیسے احترام کر لیا کرتے، تاہم ہوا یوں کہ جونہی ہماری فلائیٹ کوئٹہ پہنچی اسے ایسا کمال کا پروٹوکول ملا کہ وہ ہمارے بادلِ ناخواستہ والی عزت افزائی سے بے نیاز ہو گیا۔

اِسلام آباد سے کمیٹی کا تیسرا ممبر عابد وسیم تھا، بلا کا ہنسوڑ۔ وقفے وقفے سے اُسے کوئی نہ کوئی پُر لطف بات یاد آ جایا کرتی تھی، جسے وہ بڑے اِہتمام سے شروع کرتا مگر کنوینئر کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول جایا کرتا تھا۔ کوئٹہ آنے اور کنوینئر کے پروٹوکول سمیٹنے کی مصروفیت نے اُس کی زبان کی گرہ کھول دی تھی، اَب اُسے کوئی شگفتہ بات یاد آتی تو وہ مجھے کہنی مار کر ایک طرف لے جاتا، اُپنی کہتا اور اِتنا منہ کھول کر ہنستا کہ اُس کے منہ کے اندر تالو کے عقب میں لٹکتا کتا کھوں کھوں پر جھولنے لگتا تھا۔

کنوینئر ضرورت پڑنے پر بلوچستان سے کسی اور آفیسر کو کمیٹی کا غیر مستقل ممبر بنانے کا اختیار رکھتا تھا۔ کوئٹہ ائیر پورٹ پر ہمیں ریسیو کرنے والوں میں عبدالباری کاکڑ، صحبت خان پانیزئی اور غوث بخش لشاری بھی موجود تھے، اور تینوں نے ہوٹل پہنچنے سے لے کر اگلی صبح پہلی میٹنگ تک وہ پر لطف پروٹوکول دیا تھا کہ کنوینئر نے پہلی ہی میٹنگ میں انہیں بطور کوآپٹڈ ممبر بٹھا لیا تھا۔

برشور کا لفظ میں نے کاکڑ کی زبان سے سنا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ پشین بازار سے آگے اُوپر پہاڑوں کے اندر اس گاؤں کا نام تھا جو خشک سالی سے شدید متاثر ہوا تھا۔ ہمارے پاس جو رپورٹس تھیں ان کے مطابق ڈیرہ مراد جمالی کی تین تحصیلوں کہ جن کے رقبے نہری تھے، کو چھوڑ کر سارا ہی بلوچستان متاثرہ تھا لہٰذا کمیٹی کے دیگر ممبران اس کی باتوں پر بہت زیادہ توجہ نہ دے رہے تھے .....مگر برشور نام کا صوتی تاثر ایسا تھا کہ میرے اندر کہیں گہرائی تک اتر گیا۔

تاج محمد ترین کی بیوی کے نام پر بیٹی کا نام رکھنے اور بیٹی کے نام سے ایک وسیع اور عالیشان مسجد تعمیر کرنے کی بات اس نے غالباً چوتھے روز تب بتائی تھی جب کمیٹی مختلف علاقوں کے مشاہدے کے لیے نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے اصرار کیا تھا کہ پہلے ہمیں برشور چلنا چاہیے مگر رودینی نے اسے سختی سے ٹوک دیا کیوں کہ اس نے سارا شیڈول پہلے سے بنا کر مختلف علاقوں کے مقامی افسران کو تقسیم کر رکھا تھا۔ ویسے بھی رودینی کمیٹی کا مستقل ممبر تھا، بے شک اب کاکڑ کنوینئر کا چیتا ہو گیا تھا، مگر دورے کے انتظامی معاملات کے حوالے سے رودینی کا استحقاق ایسا تھا کہ جس کا احترام بہ ہر حال ہمیں کرنا تھا اور کرنا بھی پڑا۔ کاکڑ کے برشور کے لیے اصرار نے رودینی کو کچھ ایسا بَد مزہ کیا کہ وہ دورے کے آخر تک کاکڑ اور کنوینئر سے کھچا کھچا رہا تاہم عابد وسیم ایک اور سامع میسر آنے پر خُوش تھا۔

تربت ہم فوکر سے گئے۔ نوشکی اور خاران جیسے علاقوں کا زمینی سفر تھکا دینے والا تھا۔ واپسی پر اس حصے کی اُجڑی ہوئی وسعت ہمارے دِلوں میں دُکھ اور بے بسی بن کر گھس چکی تھی۔ نصیر آباد کے نہری علاقے حوصلہ دیتے رہے جبکہ باقی ضلعوں میں وہی سنسان تباہی سنسنا رہی تھی۔ سب علاقے یوں اُجڑے ہوئے تھے جیسے ہر جگہ کوئی بھوت پھر گیا تھا۔ زیارت قدرے سرسبز تھا مگر آسمان کی ناراضی یہاں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ چمن بس نام کا چمن رہ گیا، اِدھر اُدھر دھول اُڑتی تھی۔ لورا، مٹی کلی، مہول، پونگہ، قلعہ سیف اللہ اور مسلم باغ کی ساری کاریزیں سوکھ چکی تھیں، خضدار، درہ مولا، لندھاوا، کچھی کے میدان، درہ بولان، ڈھاڈر اور سبی جیسے علاقوں سے ہم لگ بھگ گاڑیاں بھگاتے ہوئے گزر گئے مگر اِن کے اُجاڑ پن نے پھر بھی ہمیں آ لیا تھا۔ اِس دوران ہم کئی بار کوئٹہ آئے اور سستا کر پھر نکل کھڑے ہوئے۔ ہر بار کاکڑ نے کہا:

''آپ برشور دیکھ لیتے تو جتنی تباہی آپ دیکھ آئے ہیں، وہ سب کم تر لگتی۔''

جو تباہی ہم دیکھ آئے تھے اس سے زیادہ کا تصور ہمارے لیے ممکن ہی نہ تھا مگر کاکڑ کا کہنا تھا:

''برشور کی بلندیوں سے دکھ شور مچاتا اترتا ہے اور سیدھا دلوں میں گھس جاتا ہے۔''

جب وہ اِس طرح بات کر رہا ہوتا تو رودینی اور لاشاری کے چہروں پر اُکتاہٹ سی آ جاتی یوں جیسے کاکڑ ایسے معاملے کو اُٹھا رہا ہو جو کمیٹی کے ٹی او آر سے

''چہار سُو''

باہر کا ہو۔ کاکڑ اور پانیزئی دونوں کوئٹہ میں مقیم تھے اور اُن کی دل چسپی ایسے علاقوں میں زیادہ تھی جہاں سیب، بادام، انار، اخروٹ اور انگور کے باغات بہ کثرت تھے۔ کئی برس کی خشک سالی کے باعث اِن باغات سے بارہ سے بائیس لاکھ سالانہ کمانے والے بھی کنگال ہو کر یوں اجڑے تھے کہ یقین نہ آتا تھا۔ جب ہماری ٹیم پٹھان کوٹ کی کاریز کا خشک ہوتا منبع دیکھ کر نکلی تو ایک سفید پوش یک دم عین سڑک کے بیچ ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا؛ یوں کہ ڈرائیور بہ مشکل گاڑی روک پایا تھا۔ مجھے اس کے اس طرح سڑک پر آ جانے پر شدید غصہ آیا اور شاید زبان سے کوئی نازیبا جملہ بھی نکل گیا تھا۔ کاکڑ نے سنا تو بتایا کہ وہ کلی سگر کا عبداللہ جان تھا، چار ہزار درختوں والے کالا کلو سیبوں کے باغ کا مالک۔ اس کا باغ سات برس پہلے پہلی بار ستر ہ لاکھ میں بکا تھا۔ جب سے آسمان سے رحمت برسنا بند ہوئی، اس نے باغ بچانے کے لیے ہر سال نیا بور لگایا مگر پانی اتنا نیچے چلا گیا کہ ہر سال آٹھ دس لاکھ اسی پر اُٹھ جاتے۔ پانی ہر بار نکلا ضرور مگر اتنا کہ دو چار مہینے پائپ کا منھ بھرا ہوا ہوتا پھر کم ہوتا چلا جاتا حتی کہ ڈوبتی نبض کی طرح جھٹکے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتا۔ زمین کی گہرائی میں پانی تلاش کرتے کرتے کنگال ہونے والا شخص پشتو میں ہمارے کنوینئر کو کچھ کہہ رہا تھا۔ جب وہ بات کر چکا تو کنوینئر نے جیب سے پرس نکالا، پانچ سو کا نوٹ الگ کیا اور اس کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ سیبوں کے باغ کا مالک مٹھی بھینچ کر تیزی سے سڑک سے اترا، اور لورالائی کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ کاکڑ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بتایا کہ وہ ہمیں امدادی سامان تقسیم کرنے والی ٹیم سمجھ بیٹھا تھا۔ لورا، قلعہ سیف اللہ اور مسلم باغ میں باغوں کے ایسے ہی مالک آٹے کے لیے امداد مانگتے پائے گئے۔ کاکڑ کا اصرار تھا:

''برشور کے تاج محمد ترین، جس نے بیٹی کے نام سے مسجد بنائی تھی، کا قصہ بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا.....اور شاید اس سے بھی زیادہ۔''

جب ہم سفر کر کر کے اُکتا چکے تو رودینی نے بتایا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ابھی ہمیں سراواں کے پہاڑی اور جھلاواں کے میدانی علاقے دیکھنے تھے۔ اِس پروگرام میں برشور نہ آتا تھا۔ رودینی کوشش کر کے اِس طرف نکلنے کی گنجائش نکال سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہی نہ چاہتا تھا.....اور اب یہ بات کاکڑ کو مشتعل کیے دیتی تھی؛ تاہم اس کا بس ہی نہ چل رہا تھا۔

اگلے روز جب ہم نچائی اور مستونگ سے گزر کر نوشکی کی طرف جا رہے تھے تو وہ ہمیں اس صحرا نما علاقے کی طرف لے گیا جہاں جگہ جگہ جانوروں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ رودینی نے ایک جگہ گاڑیاں رکوالیں وہ نیچے اُترا، اُنگلیاں سیدھی کر کے زمین میں دبائیں اور مٹھی میں مٹی بھر کر اپنے قدموں پر گھوما، یوں کہ اُس کی مٹھی کھل کر چاروں طرف مٹی پھینکتی چلی گئی۔ پھر وہ تقریباً چیختے ہوئے کہنے لگا:

''کاکڑ تمھیں ان لوگوں کا دُکھ بڑا نظر آتا ہے جن کے باغ اجڑ گئے، جنھوں نے بہت کچھ دیکھا اور اَب بھوک دیکھ کر بوکھلائے پھرتے ہیں۔ دیکھو، ذرا اِن لوگوں کا دُکھ دیکھو۔ اِنھوں نے بھوک کی گود میں جنم لیا ہے.....اِنھوں نے بھوک کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔''

وہ بھاگتا ہوا تھوڑا سا دُور گیا، جھکا اور ایک ڈھانچے سے ہڈی کو جھٹکا دے کر الگ کر کے پلٹا، اُسے کاکڑ کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا:

''یہ ہڈیاں اِنھی بھیڑ بکریوں کی ہیں جن کے تھنوں سے یہاں والے بھوک دوہتے رہے ہیں، اس خشک سالی کے ہلے میں تمھیں جتنی ہڈیاں زمین کے اوپر نظر آ رہی ہیں نا، اتنی ہی زمین میں دفنا دی گئی ہیں۔ جانتے ہو کس لیے؟''

اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہیں کاکڑ کے چہرے سے الگ نہ کی تھیں۔ کاکڑ اس اچانک سوال پر بوکھلا سا گیا تھا اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا۔ رودینی نے اس کے چہرے سے نظریں الگ کیں اور انہیں اپنے قدموں والی زمین پر گاڑ کر کہا:

''تم جو باغوں کے اُجڑنے کا قصہ بار بار لے بیٹھتے ہو تم کیا جانو کہ زمین میں دبائی گئی ہڈیاں صرف بھیڑ بکریوں کی نہیں ہیں.....تیرے میرے جیسے انسانوں کی بھی ہیں.....ان انسانوں کی، جنھوں نے بھوک کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا.....اور.....جو بھوک ہی سے مر گئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

ہم کوئٹہ سے کراچی کو نکلنے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ مستونگ کے بعد قلات آیا قلات سے مسلسل تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد خضدار، پڑنگ آباد، سوراپ، کھڈ کوچہ، باغبانہ، زہری، وڈھ، توتک، مغلئی، ہر کہیں وہی دِل جکڑنے والی ویرانی تھی۔ ہمیں آگے جانا تھا مگر آگے جا نہ سکے۔ سب چپ تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے، مسلسل باہر پھیلی ویرانی کو اَپنی آنکھوں میں سمیٹ چکے تھے۔ اِسی دوران نہ جانے کب رودینی نے کہا تھا:

''واپس پلٹتے ہیں.....آ.....آگے بھی یہی کچھ ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کا گلا رندھا گیا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا مگر سب نے گویا رودینی کی تجویز مان لی تھی۔

کوئٹہ پہنچنے پر بھی سب چپ رہے۔ ہمارے پاس ایک پورا دن بچ گیا تھا۔ کاکڑ اب برشور کا نام تک نہ لے رہا تھا۔ ہم سب کے بیچ اتنی خاموشی حائل ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرنا از حد دشوار ہو رہا تھا اور ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ ایک لمحہ مزید اسی جگہ پر یوں گم صم بیٹھے رہنے سے ہمارے سینے پھٹ جائیں گے لہٰذا کاکڑ اور لاشاری کو اپنے اپنے گھر اور باقیوں کو ہوٹل میں اپنے اپنے کمروں کے لیے اٹھ جانا چاہیے۔

تقریباً سب اُٹھ چکے تھے، کنوینئر، کاکڑ، لشاری، پانیزئی اور عابد وسیم گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہونے کے عمل میں تھے میں پوری طرح کمر سیدھی کر چکا تھا بس ایک رودینی اَپنی نشست سے ہلا تک نہیں تھا۔ ہمیں یوں اُٹھتے دیکھا تو کہا:

''میری تجویز ہے کہ کل برشور چلتے ہیں۔''

ہم سب نے پہلے رودینی کو اور پھر کاکڑ کو دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آن کی آن میں سارا سناٹا شور مچاتا ہمارے اندر سے بہتا دور ہوتا چلا گیا۔ ہم دِن بھر کے تھکے ہوئے تھے اور ہمیں آرام کے لیے جدا ہونا تھا مگر ہم کہیں نہیں جا رہے تھے۔

کاکڑ نے ہمیں بتایا کہ تاج محمد ترین اس کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں کوئٹہ کے پبلک سکول میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور تب دونوں کی کئی خُوشگوار شامیں ہنہ جھیل پر یوں گزری تھیں کہ اسے ابھی تک یاد آتی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کیسے اسے کلی سرخانزئی کے میر ثناءاللہ ترین کی بیٹی اچھی لگی اور کیسے اُس نے ایک شام اس کے گھر کے باہر کلاشنکوف سے مسلسل فائرنگ کر کے اُپنی محبت کا اعلان کیا۔ کن مشکلوں سے کلی سرخانزئی والے رشتہ دینے پر آمادہ ہوے۔ کیسے اُس کی بیوی ایک بیٹی جنم دیتے ہوے مرگئی اور کیسے اُس نے عین جنازہ گاہ میں اِعلان کیا کہ اُس نے اُپنی بیٹی کا نام اُپنی بیوی کے نام پر نورجان رکھ دیا ہے۔

کاکڑ جو بغیر سانس لیے بولے جارہا تھا یہاں پہنچ کر دم لینے کو رکا تو ہمارا تجسس اِتنا بڑھا کہ ہم اُس کے بولنے کا بے چینی سے اِنتظار کر رہے تھے تاہم حوصلہ مجتمع کرنے کے لیے جتنا وقت اُسے چاہیے تھا وہ اُس نے لے لیا اور پھر بتایا:

''اسی برس اس کا باغ گیارہ لاکھ میں کراچی کے ایک بیوپاری نے خریدا۔ ایک سال درختوں پر زیادہ پھل لگتے اور اس سے اگلے سال کم۔''

اس نے ہمیں یہ بات ایسے لہجے میں بتائی جیسے ہمیں پہلے سے معلوم ہو پھر اس پر اضافہ کیا:

''اس کی قسمت دیکھیے کہ ہر سال اس کا باغ پہلے سے بھی زیادہ قیمت دیتا بس فرق یہ تھا کہ کم پھل والے سال میں باغ پچھلے سال سے ہزاروں میں اوپر جاتا اور بھاری پھل والے سال لاکھوں کا اضافہ دیتا۔ انہی برسوں میں اس نے اپنے لیے اور اُپنی بیٹی کے رہنے کے لیے قلعہ بنایا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ یہاں ہر تمن کا میر اور صاحب حیثیت فرد قلعہ بنا کر رہتا ہے۔ وہ جدی حیثیت والا تھا، بندوق، تلوار، خنجر کمان، گھوڑا اور قلعہ مدّتوں اس خاندان کی دل چسپیوں کا سامان رہے تھے.....مگر اس نے قلعہ نئے سرے سے بنوایا، گھوڑے کی جگہ پجارو آ گئی۔ میں نے اس کے پاس بڑھیا سے بڑھیا کلاشنکوف دیکھی.....وہ بڑا شوقین مزاج ہے اس سلسلے میں۔''

ایک مرتبہ وہ پھر چپ ہو گیا۔ شاید اسے اُپنی کہی ہوئی بات کی تصحیح کی ضرورت پڑ گئی تھی، منہ ہی منہ میں بڑبڑایا:

''شوقین مزاج ہے کہاں؟ کبھی تھا۔''

گلا صاف کرنے کو تھوڑا سا کھانسا اور اُپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوے کہا:

''جس سال قلعہ مکمل ہوا اُسی برس اُس نے بیٹی کے نام سے مسجد بنوانی شروع کی۔ ہم نے کبھی نہ سنا تھا کہ کسی نے اُپنی ہی بیوی کا نام یوں سرعام لیا ہو.....اُس نے قبرستان میں سب کے سامنے لیا تھا۔ اس سارے علاقے میں آج تک گھر کی کسی خاتون کے نام پر کسی نے مسجد کا نام بھی نہیں رکھا تھا.....مگر.....اس نے رکھا.....جب رکھ دیا تو لوگ تعجب کا اظہار کرتے تھے.....تاہم جب عالیشان مسجد مکمل ہوگئی تو سب اُس کی بیٹی نور کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔''

کاکڑ نے اِدھر اُدھر خالی نظروں سے دیکھا، لمبی سانس لی تو آہ نکل گئی کہا:

''بدقسمت''

اور پھر بولتا چلا گیا:

''جس برس مسجد نور مکمل ہوئی تھی نا، اس سے اگلے برس بارش کی ایک بوند نہ پڑی تھی اور اس سے اگلے سات سال بھی خالی چلے گئے۔ پہلے پہل اس کے ہاں پانی کی کمی نہ تھی اس کے باغ کی سیرابی کے لیے آٹھ ٹیوب ویل تھے پانچ نیچے، تین اوپر.....مگر جوں جوں زمین کے اندر پانی کی سطح گرتی چلی گئی توں توں وہ بوکھلا کر جو سمجھ آیا، یا جس نے جو صلاح دی کرتا چلا گیا۔ مسلسل خشک سالی نے اس کا سب کچھ نگل لیا۔ ایک ایک کر کے ٹیوب ویل خشک ہوتے رہے۔ وہ سوکھتے باغ کو بچانے کے لیے ہر برس دو تین نئے بور لگواتا رہا مگر زمین کا پیٹ بانجھ عورت کے رحم کی طرح خالی نکلتا۔ اس کے پاس جو جمع جتھا تھا اسی میں اٹھ گیا پھر وہ مقروض ہوتا چلا گیا .....مگر وہ باغ نہ بچا پایا۔''

اگلے روز جب ہم خدخانزئی، میاں خانزئی، طور مرغہ، کڑی درگئی اور کلی سرخانزئی کے علاقوں سے گزرے تو حد نظر تک درختوں کے کٹے تنے نظر آئے، صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہاں کبھی سیبوں کے باغ تھے، گھروں پر پڑے تالے مکینوں کی نقل مکانی کا نوحہ سناتے تھے۔ یوں لگتا تھا ایک عذاب الٰہی تھا جو پوری بستی کو روند کر نکل گیا تھا۔ بندخُوشدل خان خشک پڑا تھا، پانیزئی نے بتایا کہ ہمارے بزرگوں میں سے بھی کسی نے اس بند کو پہلے خشک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

گاڑی تِرائی سے اُوپر نکلی تو پانیزئی نے اِطلاع دی:

''ہم برشور کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔''

کاکڑ نے خشمناک آنکھوں سے پانیزئی کو دیکھا جیسے اس نے یہ اطلاع قبل از وقت دے دی تھی یا جیسے یہ اطلاع یوں نہیں دی جانی چاہئے تھی۔ تاہم وہ چپ رہا حتی کہ مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ اُس نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی ہم سب اس کے پیچھے پیچھے سڑک پر اُتر آئے۔ اُس نے اوپر پہاڑیوں کی تنی چھاتیوں کی سمت اُنگلی اُٹھائی اور کہا:

''آسمان سے ایک بوند بھی ٹپکے.....اُن دو چوٹیوں کے بیچ سے پھسلتی نیچے دامن میں آجاتی ہے۔''

اُس کی انگلی پہاڑی کی ناف تک چلی آئی تھی، وہاں تک، جہاں زمین ہموار کر کے اُوپر تلے کئی تختے بنا دیئے گئے تھے۔ انہی تختوں پر سیدھی قطاروں میں سیاہ لمبوترے نقطے سے نظر آتے تھے جو نیچے دامن تک چلے گئے تھے۔ کاکڑ نے بتایا تھا کہ وہ درختوں کے باقی رہ جانے والے ٹھنٹھ تھے۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب باغ آباد تھا تو پوری وادی میں زمین کے ایک چپے پر بھی نگاہ نہ پڑتی تھی مگر ہم نے جدھر دیکھا اُدھر جہنم کے شعلوں جیسی مٹی ہی نظر آتی تھی۔

اسی جہنم کے بغلی حصے میں گاؤں کی آبادی تھی۔ گھروں کا سلسلہ جہاں ختم ہوتا تھا وہیں وہ مسجد تھی جس کا ہم مسلسل ذکر سنتے آئے تھے۔ مسجد واقعی عالیشان تھی۔ میں نے اندازہ لگایا اس آبادی کے گھروں میں بسنے والے سارے مرد، عورتیں اور بچے بھی اس کے صحن میں جمع ہو جاتے تب بھی اس کا تین چوتھائی حصہ دوسری بستیوں سے آنے والے نمازیوں کے لیے بچ رہتا اور دوسری آبادیوں

والے آ جاتے تو بھی شاید سارا صحن نہ بھر پاتا۔

''وہ نور مسجد ہے نا۔''

مجھے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی مگر میں نے پوچھ لیا۔اس بار پانیزئی بولا:

''یقیناً''.....

''اتنی بڑی!''

میرا اگلا سوال تھا۔

کاکڑ بولا:

''تب وہ کہتا تھا، مجھے جنت میں اتنا ہی بڑا گھر چاہیے۔''

ہم چلتے چلتے نیچے تک آ گئے تھے، اتنے میں ڈرائیور اوپر سے گاڑی گھما کر لے آیا۔اب ہم اُس راستے پر تھے جو باغ کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ آبادی تک چلتا تھا۔کاکڑ نے بتایا:

''اب یہ باغ ترین کا نہیں ہے۔''.....

''کیا مطلب؟''

کنوینئر نے پوچھا:

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ یہ باغ تاج محمد ترین کا ہے؟۔''

''یہ باغ ترین ہی کا تھا مگر اِسے تباہی سے بچانے کے لیے اس نے زرگل سے جو قرض اٹھایا تھا اس میں یہ باغ، وہ قلعہ اور اس کا سارا اسباب بک چکا ہے .....اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ابھی اسے آدھے سے زیادہ قرض دینا ہے۔''

زرگل کے بارے میں ہمیں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا کہ وہ سرحد کے اِدھر اُدھر آتا جاتا رہتا اور خوب کماتا تھا۔سارے علاقے میں 'پے منٹ' کے نام کے حیلے سے سود پر قرض دیتا تھا۔

زرگل کا نام آیا تو کاکڑ نے بتایا کہ کل جب وہ ہوٹل سے اپنے گھر گیا تھا تو ترین وہاں اس کا پہلے سے منتظر تھا اور اس نے بتایا تھا کہ قرض کی واپسی کے لیے زرگل بہت دباؤ ڈال رہا تھا۔زرگل کے لمبے ہاتھ تھے۔اخروٹ آباد کے چند تلنگے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔اس کا دباؤ کوئی بھی برداشت نہ کر پاتا تھا لہٰذا ترین کا یوں پریشان ہونا بجا تھا۔کاکڑ نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے اضافہ کیا تھا:

''میں اس کی کتنی مدد کر سکتا تھا.....چالیس پچاس ہزار حد سے حد ایک لاکھ..... جتنا اس نے اٹھایا تھا، اسے ہم جیسے سفید پوشوں کی مدد سے نہیں اتارا جا سکتا تھا۔''

گاڑی عین مسجد کے سامنے رک گئی تھی کہ پچیس تیس آدمی مسجد سے نکل رہے تھے۔کاکڑ یک دم گاڑی سے اترا، لمبے لمبے قدم اٹھاتا لوگوں کے وسط میں سر نیوڑھائے کھڑے اس شخص کے پاس پہنچا، جس کے بارے میں پانیزئی نے بتایا کہ وہ ترین تھا۔

ابھی ہم گاڑیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ ہمیں دھاڑیں مار مار کر رونے کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ترین کاکڑ کی چھاتی سے لگا ''ہائے نور، ہائے نور'' کہتا پچھاڑیں کھا رہا تھا۔اس سے دگنی عمر والے تسبیح اُٹھائے دودھ جیسی سفید ریش والے معزز نظر آنے والے شخص نے اس کے کندھے پر اپنی تسبیح والا ہاتھ رکھا اور کہا:

''ترین کیوں تماشا بناتے ہو تم نے پچھلے سات سالوں میں جتنی پے منٹ مانگی میں نے دی.....میں نے دی نا؟.....دیکھو میں نے تمہاری بیٹی سے اتنے شریف لوگوں کے سامنے نکاح کیا ہے.....اب باقی قرض میں خدا رسولؐ کے نام پر تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

ترین چپ ہونے کے بہ جائے اور شدت سے چیخا:

''خدا رسولؐ کے نام پر.....؟''

پھر وہ ''ہائے نور'' کہتا مسجد کی سمت بڑھا اور ایک ستون کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر یوں جھنجھوڑنے لگا جیسے پوری مسجد کو کھسکا کر کہیں لے جانا چاہتا ہو، حتی کہ وہ نڈھال ہو گیا۔بے بسی سے سر ستون کے ساتھ ٹکرایا اور کہا:

''کاش میں تمہیں بیچ کر نور، اپنی نور کو بکنے سے بچا لیتا۔''

''کیا کفر بکتے ہو''

زرگل چیخا۔اس کا ہاتھ فضا میں یوں ناچا کہ موٹے دانوں والی لمبی تسبیح دائرہ بناتی دائیں بائیں جھولنے لگی۔اس کے ساتھ کھڑے ہٹے کٹے دو آدمیوں نے اشارہ پا کر اسے مسجد کے ستون سے زبردستی الگ کیا اور کھینچتے ہوئے قلعے میں لے چلے مگر وہ مسلسل کہہ رہا تھا:

''کاش میں تمہیں بیچ سکتا نور''.....

آواز دور ہوتی جا رہی تھی، ہم گاڑی میں بیٹھے تو ایک دفعہ پھر ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ہم جلد ہی برشور کی حدود سے نکل آئے مگر برشور ہمارا پیچھا کرتا رہا۔

جہانِ نو کی نوید!

رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

ساحل پر چہل قدمی کرتے ایوا کی بات سُن کر کارسن کے بڑھتے قدم وہیں تھم گئے۔ تیکھے لہجے میں نہ صرف اُس کی بات کی مخالفت کی بلکہ اُسے مزید اس پر گفتگو کرنے سے روک دیا۔ ایوا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ پچھلے تین سال سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اُن کا رشتہ کئی مراحل طے کر کے اب اُس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ دو جسم اک جان ہو گئے تھے۔ وہ اُس کی رگ رگ سے واقف تھی مگر یہ لہجہ، یہ تیور اُس کے لیے نئے تھے۔ ایوا کو تذبذب کی حالت میں دیکھ کر کارسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جھٹ سے اُس نے پیار سے ایوا کا ہاتھ دباتے ہوئے اپنے روٹھنے پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے معافی مانگ لی۔

’’پہلے یہ بتاؤ تمہیں یہ بات اتنی ناگوار کیوں گزری؟ میں جو کہہ رہی ہوں کسی ثبوت کی بنا پر ہی کہہ رہی ہوں۔‘‘

’’آئی ایم سوری ڈیئر۔ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔‘‘

چلتے چلتے دونوں ساحل کے قریب بنے اوپن کیفے میں جا کر دو کپ کافی کا آرڈر دے کر باہر بچھی نشست پر جا بیٹھے۔ حدِ نظر پھیلا گہرا سمندر، سمندر سے اُچھلتی اٹھکیلیاں کرتی لہروں کا کھیل خاموشی سے دیکھتے رہے۔ شام کے اس پہر جب دور اُفق پر سورج سمندر میں ڈوبنے کو بے تاب ہوتا تو اُسے سُبک خرامی سے پانی میں اپنا وجود چھپاتے دیکھنا اور اُس کے روپوش ہوتے ہی سُرمئی شام کے سائے کا وجود میں آ جانا دونوں کو بہت پسند تھا۔ قدرت کے اس خوبصورت، دلکش منظر کا لطف اک دوسرے کا ہاتھ تھامے خاموشی سے محسوس کرتے تو لہروں کا سنگیت دل و دماغ پر خمار کی کیفیت طاری کر دیتا۔

آج وہی منظر وہی ساتھ تھا مگر لہروں کا سنگیت کارسن کے دل میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ ایوا سے اس کے بدلے تیور دیکھ کر رہا نہیں گیا۔

’’تمہارا تحقیقی کام آخری مرحلے پر ہے اور یہ بات تمہارے تحقیقی موضوع سے جُڑی ہوئی ہے اس لیے چاہتی ہوں کہ تم بھی اس نکتے پر غور فرماؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات کو دلیل کے ساتھ پیش کرنا پھر دیکھتا ہوں‘‘

اُس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

ایوا نے موسم کا ذکر چھیڑ کر موضوع بدل دیا۔ کافی کا سِپ لیتے مچلتی لہروں پر نظریں جمائے ایوا نے کہا:

’’میری جان تم اُداس بالکل اچھے نہیں لگتے۔ تھوڑا سا مسکرا دو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ایوا نے بڑھ کر کارسن کے لب چوم لیے۔ کارسن مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ جلد ہی دوبارہ اُسی جگہ پر ملنے کا وعدہ کر دونوں اپنے اپنے راستے نکل گئے۔

رات بستر پر آنکھیں موندے لیٹا تو ایوا کی کہی باتیں پھر دماغ میں گھومنے لگیں۔ وہ جانتا تھا ایوا کبھی غلط بیانی نہیں کر سکتی وہ ایک اچھی اور سچی صحافی ہے۔ خوبصورتی سے زیادہ وہ اُس کی ذہانت کا قائل ہے۔ وہ اُس کے تحقیقی کام میں اُس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اُسے ایوا کی کہی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا شاید اس لیے کہ اُس نے آٹھ دن اُن لوگوں کے بیچ گزارے تھے۔ انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا اُن کی زندگی سے جُڑے ہر چھوٹے بڑے مسائل، اُن کا معمول، اُن کی عادات، اُن کی سوچ، اُن کا رہن سہن، کھان پان، اُن کی تہذیب کو سمجھا تھا۔ وہ اللہ کے بندے قدرت کے قریب اپنی الگ ہی دنیا میں مگن ہیں۔ اُن کے لیے زندگی محض جینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کھانا پینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ اُس کا تحقیقی کام جس کا موضوع ’’امیزون کے قبیلے اور اُن کی ثقافت‘‘ آخری مرحلے پر ہے اور ایوا کی دی ہوئی خبر اُس کی تحقیق کا رُخ بدل سکتی ہے۔

صبح سویرے ہی اپنی بات کی دلیل دیتے ہوئے ایوا نے موبائل پر اُسے چند تصویریں بھیجیں۔ اُس نے تصویروں کو بڑا کر کے ہر زاویے سے دیکھا۔ ٹرک مردہ جسموں سے بھرا تھا۔ ایک کے اوپر بے جان جسم ایسے لدے پڑے تھے جیسے لکڑی کی شہتیریں۔ تصویر سے مقصد تو ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر انسانیت کے زوال کا کھلم کھلا اعلان ضرور نظر آ رہا تھا۔ انسان کی موت جانوروں سے بھی بدتر ہو گی ہے کیا؟ اتنی بے ادبی، اتنی بے حرمتی؟ تصویر نے اُسے اندر تک جھنجھوڑ دیا۔ تصویروں کے ساتھ ایوا نے میسج میں لکھا تھا:

’’تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ شام کو ساحل پر ملیں گے تو تفصیل سے بات ہو گی۔‘‘

یہ تو اُس نے اپنی تحقیق میں ثابت کر دیا تھا کہ قبائلی آدم خور ہیں۔ آدم خور ہونے کا اعتراف تو خود کیڈی نے بھی کیا تھا اور اس کا ثبوت اس نے اپنے گھر میں سجا کر رکھی کھوپڑیوں سے دیا تھا مگر آدمی کو مار کر کھانے کی اُن کی وجوہات مختلف ہیں۔ وہ آدمی میں چھپے جن کو مارتے ہیں آدمی کو نہیں۔

70,00,000 کلومیٹر کے رقبے میں پھیلا امیزون کا جنگل دنیا کا سب سے بڑا، گھنا اور گرم جنگل ہے جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے۔ تقریباً چار سو مختلف قبیلے اس جنگل میں رہائش پذیر ہیں۔ ہزاروں ندیاں اس کے بیچ سے گزرتی ہیں۔ کتنے ہی ارب شجر اور ہزاروں کی تعداد میں نوع (Species) یہاں موجود ہیں۔ دنیا کے نو ملک اس سے اپنی سرحد سانجھی کرتے ہیں مگر سب سے زیادہ حصہ برازیل کا ہے۔

کارسن کا جگری دوست اولور جو کہ وائلڈ لائف فوٹو گرافر بھی ہے اُس کے ساتھ چلنے کو راضی ہو گیا۔ جنوری کے مہینے میں وہ برازیل کے راستے امیزون کے جنگلوں میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ اس مہینے بارشیں جم کر ہوتی ہیں۔ ندیاں لبالب بھری رہتی ہیں اور ایک سے دوسری جگہ کشتی میں جانا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ موسم کی پوری تیاری کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

''چہار سُو''

برازیل پہنچ کے ہیلی کاپٹر سے جنگل کے لیے روانہ ہونے سے پہلے گائیڈ پارکر اُن کا منتظر تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اٹھارہ انیس سال کا نوجوان بھی تھا۔ پارکر نے اُس کی طرف اشارہ کرتے کہا:

''یہ اسی جنگل کا باشندہ ہے کیڈی۔ باہر کی دنیا دیکھنے کے اشتیاق میں گھر سے بھاگ نکلا مگر اب یہ واپس اپنے قبیلے میں لوٹ جانا چاہتا ہے اور کوئی اسے ساتھ لے جانے کو تیار نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس کا ساتھ آپ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔''

دونوں نے غور سے اُسے دیکھا۔ دُبلا پتلا، درمیانہ قد، سانولی رنگت، گھنگریالے سیاہ بالوں والا لڑکا بڑی اُمید سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ چہرے کی مایوسی اُس کی بے بسی کا اعلان کر رہی تھی۔ اُن کی سرکی جنبش اور مسکراہٹ سے نوجوان کے چہرے پر ہنسی کِھل اٹھی۔ بڑے تپاک سے آگے بڑھا اور اُن کا سامان اٹھا کر ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ گیا۔

تیس منٹ کے سفر کے بعد ہیلی کاپٹر نے انہیں جنگل کے بیچ میدان میں اُتار دیا۔ انہیں اترتا دیکھ کر قریب کھیتوں میں کام کرتے قبائلی بچے اور نوجوان اُن کی جانب بھاگے چلے آئے۔ چہرے پر حیرت اور معصوم مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ سامان اُترتا دیکھ کر نوجوان اُن کی مدد کے لیے آئے۔ کارسن اور اولور نے سب سے ہاتھ ملایا اور نام پوچھے۔ کچھ نے بتا دئے کچھ شرما کر مسکرا دیئے اور کچھ گھبرا کر بھاگ گئے۔ دو قبائلی نوجوان پارکر سے بات کر رہے تھے۔ پارکر انہیں اُن کے پاس لے کر آیا اور بتایا:

''یہ لانسا اور ہنروی ہیں۔ پورے سفر میں یہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ یہ نہ صرف راستہ دکھائیں گے بلکہ سب کی حفاظت بھی کریں گے اور سامان بھی اٹھائیں گے۔''

لمبا قد، کسا ہوا فولادی جسم، تانبے جیسی رنگت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے آگ میں سونا تپا ہو۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ گہرا کالا، گلے میں سؤر کے دانتوں سے بنے لمبے ہار لٹک رہے تھے اور کمر پر ڈوری سے بندھی کٹار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ لانسا اور ہنروی سامان اٹھا کر آگے آگے چلتے راستہ بنا رہے تھے اور کیڈی بھی سامان اٹھائے اُن کے پیچھے تھا۔ سفر کے شروع میں ہی کیڈی کو اُن لوگوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے بابا اُس سے ملنے کو تڑپ رہے ہیں۔ دو مرتبہ وہ غصّے اور بے بسی میں اپنا گھر جلا چکے ہیں۔ یہ سُن کر اُس کی بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔

گھنے درختوں کے بیچ بنی کچی پگڈنڈی پر چلتے پیڑوں سے پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ پرندوں کی مختلف آوازیں (Reptiles) خزندوں کی سرسراہٹ، ہواؤں کا سنگیت، ہوا کی تازگی اور نمی انہیں احساس دلا رہی تھی کہ وہ مشینی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ کچھ دیر ان راستوں پر چلنے کے بعد گھنے درختوں کے جھنڈ سے نکلے تو سامنے ندی نظر آئی۔ لانسا پیڑ سے بندھی کشتی کو کھینچ کر لے آیا۔ سب کے سوار ہوتے ہی کشتی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ پانی گہرا اور بہاؤ تیز تھا۔ آسمان پر گھنے بادل چھائے تھے۔ بارش شروع ہونے سے پہلے یہ سفر طے کرنے کی کوشش میں وہ ہاتھ تیز تیز چلا رہے تھے۔ رنگ برنگی، چھوٹی بڑی مچھلیوں کے علاوہ قریب ہی مگر مچھ بھی تیرتے نظر آئے۔ دونوں قبائلی محتاط تھے اور بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے راستہ بدل کر مگر مچھ سے بچاتے ہوئے کشتی کو آگے نکال لے گئے۔ پارکر راستے میں اُس جگہ کے بارے تفصیل سے بتانے لگا:

''یہ جنگل کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ چیونٹی، سانپ، بچھو بھاری تعداد میں ملیں گے تو ستر فٹ کا اینا کونڈا اور پچھتر فٹ بڑا اجگر انسانی قد سے بڑی مکڑی اس کے اندرونی حصے میں موجود ہیں۔ اس گھنے حصّے میں کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں بٹاتا۔ وہاں کے درخت اتنے بڑے اور گھنے ہیں کہ اُن کو آدم خور درخت بھی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں وہاں ایسی مخلوق پائی جاتی ہے جس کا آدھا جسم ریچھ اور آدھا انسان کا ہے۔ وہاں سے صحیح سلامت بچ کر نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔''

جنگل کے بیچ سے نکلتی ندی کا راستہ سیدھا نہیں تھا۔ ندی کے دونوں طرف گھنا جنگل اور جنگل میں بسے کبھی کوئی قبائلی یا کوئی جانور نظر آ جاتا۔ ندی میں کچھ عورتیں اور بچے نہا رہے تھے۔ کشتی کو اس طرف آتے دیکھا تو سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ بچوں نے مخصوص آواز نکالی اور اُسی وقت نہ جانے کدھر سے چار پانچ قبائلی بھالے اٹھائے وہاں پہنچ گئے۔

کیڈی نے بتایا کہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کیڈی نے اونچی آواز میں اپنی زبان میں آنے کا مقصد بتایا اور انہیں بے خوف ہونے کو کہا۔ کشتی کو دوسری جانب سے آگے کی طرف لے گئے۔

پارکر نے بتایا کہ جنگل میں سو سے زیادہ ندیاں بہتی ہیں جو بڑی ندی میں جا کر ملتی ہیں۔ تیس ہزار سے زیادہ قسم کی مچھلیاں ان ندیوں میں موجود ہیں۔ ایک ندی کو اُبلتی ندی کے نام سے جانا جاتا ہے اُس کا پانی ہمیشہ اُبلتا کھولتا رہتا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد آخر ندی کے ایک کنارے جا کر کشتی رُک گئی۔ تھوڑا چلنے کے بعد ڈھلان اُتر کر آٹھ دس جھونپڑیوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ اُس کے کچھ فاصلے پر بڑا سا خیمہ بنا تھا جدھر اُن کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ دن ڈھلنے کی تیاری میں تھا۔ سفر کی تھکان سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد دونوں تر و تازہ ہو گئے۔

رات کو خیمے کے باہر آگ جلا کر وہیں کھانا پکایا گیا۔ کھانے کا کافی سامان وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ تازہ مچھلی کو بھون کر اُس کا سالن بنا کر چاول کے ساتھ کیلے کے پتوں پر رکھ کر سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد جڑی بوٹیوں سے تیار کیا قہوہ قبائلیوں نے انہیں پیش کیا جسے پیتے ہی دن بھر کی تھکان دُور ہو گئی۔ وہ رات اُن کی جنگل میں پہلی رات تھی۔

ہنروی اور لانسا خیمے کے باہر چوکسی کرتے رہے۔ رات بھر آگ جلتی رہی۔ جنگلی جانور آگ کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ نہ جانے تھکن کا اثر تھا یا قہوے کا دونوں صبح دیر تک گہری نیند سوتے رہے۔

سارا سامان باندھ کر اگلی صبح پھر سفر شروع ہو گیا۔ ہنروی اور لانسا

''چہارسُو''

آگے چلتے راستے کی رکاوٹ دُور کرتے جاتے۔ کوئی خطرناک کیڑے مکوڑے، سانپ، جھاڑیاں جو بھی راستے میں آتا ہٹاتے جاتے۔ اُن کے لیے راستہ بناتے جاتے۔ ایک جگہ گیلی مٹی کا گہرا گارا تھا جسے پار کرنے کے لیے دونوں نے جھٹ سے کٹار اور تلوار نکال کر پیڑ کی لکڑی کاٹ کر شہتیر راستے میں بچھا دی تا کہ اس پر چڑھ کر راستہ پار کیا جائے۔ کیڈی تو سامان اُٹھا کر بھاگتا ہوا راستہ پار کر گیا مگر شہری لوگوں کو اس کی عادت کہاں؟ اولور دو قدم چلا کہ پاؤں پھسل گیا اور وہ گارے میں جا گرا۔ پار کرنے پھرتی سے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اُٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر راستہ پار کرایا۔ کیچڑ میں لت پت اُسے دیکھ کر سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پہلی بار ہنروی اور لانسا کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کو ملی۔ اتنے گھنٹے ساتھ رہنے کے بعد اُن کے چہروں سے تناؤ کی لکیریں مٹ گئیں تھیں۔ کارسن کو بھی اس جوکھم سے بچانے کے لیے کیڈی نے ہاتھ پکڑ کر راستہ پار کرایا۔ آگے چل کر جیسے ہی ندی نظر آئی جو اُنہیں پانی میں چل کر پار کرنی تھی، اُس میں جاتے ہی کیچڑ سے لت پت اولور کے کپڑے دھل گئے۔ دونوں قبائلیوں نے دونوں کا ہاتھ پکڑ کر ندی پار کروائی۔

کیڈی کا گھر راستے میں تھا۔ صبح سے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ دو سال پہلے جب اُس کی ماں اچانک چل بسی تھی وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پایا تھا اور وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ یہاں اکثر لوگ کم عمری میں ہی چل بستے ہیں۔ بیماروں کا کوئی علاج نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی شرح اموات بہت زیادہ ہے۔

کبھی گھنے درختوں سے گزرتے ہوئے، کبھی کمر تک پانی میں ڈوب کر نالہ پار کیا تو کبھی کشتی میں سوار ہو کر۔ جدھر تھکن محسوس ہوئی وہاں دم لینے کو رُک گئے۔ اس تمام سفر کے دوران پار کر اور کیڈی اُنہیں قبائلی زندگی کی معلومات دیتے رہے۔

راستے میں پہلی بار انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگے خوبصورت چہچہاتے طوطے دیکھے تو چلتے چلتے اُن کے قدم بے ساختہ رُک گئے۔ اُن کی چہچہاہٹ ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے فضا میں نغمے گونج رہے ہوں اور پیڑوں کی شاخیں اُن نغموں کو سن کر رقص میں محو ہوں۔ وہ خوبصورت منظر کیمرے میں قید ہو گیا اور اُن لمحوں کا احساس ذہن و دل میں محفوظ ہو گیا۔

جیسے جیسے کیڈی کا گھر قریب آ رہا تھا اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی۔ دُور سے ہی اپنے گھر پر نظر پڑتے وہ خوشی سے چلا اُٹھا۔ جنگل کے بیچ زمین سے دس فٹ اوپر بانس گاڑ کر اُس کے اوپر گھاس پھوس سے بنا گھر (Tree House) اُسی کا تھا۔ اس نے گلے سے مخصوص آواز نکالی جسے سُنتے ہی قبائلیوں کا جھنڈ اُن کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ مرد، عورتیں، بچے سب اُس سے گلے لگ کر ایسے مل رہے تھے جیسے صدیوں کا انتظار اچانک ختم ہوا ہو۔ جس انداز سے اُس کے بابا اُسے ملے تھے بنا بتائے پتا چل گیا تھا کہ باپ بیٹا مل رہے ہیں۔ عمر اُس کی شاید چالیس کے قریب ہو گی مگر لگتا وہ پچاس سے اوپر کا تھا۔ کیڈی کے بتانے پر وہ اُن لوگوں سے ایسے جھک کر ملا جیسے پرستش کر رہا ہو۔ خوشی سے اُس کا وجود لرز رہا تھا اور آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

بچے اُنہیں حیرت سے ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے۔ عورتوں کے چہرے تعجب سے کھُلے تھے۔ چہروں پر رنگ لگے تھے، گلے میں لمبے لمبے ہار ڈالے، بازوؤں اور جسم کے کئی حصوں پر ٹیٹو (Tatoo) بنے تھے۔ عورتوں کے جسم پر کمر کے نیچے چھوٹا سا کپڑا بندھا تھا۔ جوان عورتوں کے جسم گندمی اور کسے ہوئے تھے جبکہ ادھیڑ عمر کی عورتوں کی جلد لٹکی ہوئی تھی۔ بچے اور مردوں کے جسموں پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ صرف گلے میں ہار اور کمر پر ڈوری سے کٹار بندھی تھی۔ کیڈی نے بتایا تھا کہ یہ ٹیٹو ہر قبیلے کی اپنی پہچان ہے۔

تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور وہ سب کیڈی کے بانس پر بنے گھر میں داخل ہو گئے۔ بڑا سا ہال کمرا جس کے ایک طرف گھر کے مرد اور دوسری طرف خواتین رہتی ہیں۔ اُس گھر میں مرد، عورتیں اور بچوں کو ملا کر سترہ افراد رہتے ہیں۔ دیواروں پر بھالے، تیر، کمان، تلواریں، سؤر کے دانتوں کے بنے لمبے لمبے ہار، انسانوں کی کچھ ہڈیاں اور آٹھ کے قریب کھوپڑیاں وہاں پر نظر آئیں۔

کیڈی کے کپڑوں کو سب ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے قبائلی کپڑے پہنے شخص کو دیکھ کر سوچتے تھے کہ ان کے جسم کا لباس ہی اُن کی جلد ہے۔

لانسا سے کہہ کر انہوں نے اپنے سامان سے کھانے پینے کا سامان نکال کر اُن لوگوں کو تحفے میں دیا تو خوشی سے اُن کے چہرے چمک اُٹھے۔ کچھ گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد اجنبیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ جو بچے اور عورتیں پہلے جھجک رہی تھیں اب بڑی اپنائیت سے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ ان سے اپنی زبان میں باتیں کرتی رہیں جس کا ترجمہ پار کر اور کیڈی کرتے رہے۔

کارسن نے جب کھوپڑیوں کے بارے پوچھا تو کیڈی نے اپنے بابا کا جواب ترجمہ کرتے ہوئے بتایا:

''یہ ہمارے خاندان کا اثاثہ ہیں''

''کس کی ہیں؟''

''جن کی''

''جن یا انسان؟''

''ہم انسان کو نہیں مارتے جن کو مارتے ہیں۔''

''مگر کھوپڑیاں تو یہ انسانوں کی ہیں یہ جن کی کیسے ہو سکتی ہیں؟''

اس کے سوال پر دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر انہوں نے بات کا موضوع بدل دیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔

اُس رات کھانا گھر کے مردوں نے بنایا۔ بھونی ہوئی مچھلی اور سؤر کا میٹ انہیں پیش کیا گیا۔ میٹ کھانے سے پہلے انہوں نے پار کر سے پوچھ لیا تھا کہ یہ میٹ کس کا ہے ورنہ کھوپڑیاں دیکھ کر انہیں کھٹکا لگا تھا۔ کیلے کے پتوں پر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کیڈی کے بابا ہنس کر بولے:

''آپ تو ہمارے جیسے انسان نکلے ہم تو سوچتے تھے گوری اور بھوری چمڑی والے جن ہوتے ہیں۔''

''چہار سُو''

جنگل میں شام کو ہی رات ہو جاتی ہے اور لوگ رات کو گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ رات دیر تک کیڈی کے گھر کے لوگ انہیں گھیرے رہے۔ زندگی میں یہ اُن کا پہلا موقع تھا جب جِن سمجھنے والے انسانوں کے ساتھ وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ رات کی خاموشی میں باہر سے سائیں سائیں ہوا کے تیز چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دور سے کبھی ہاتھی کی چنگھاڑ تو کبھی شیر کی دہاڑ، کبھی لومڑی کی آوازیں تو کبھی چمگادڑوں کا شور سنائی دیتا رہا۔ اس شور میں کب نیند آ گئی انہیں پتا ہی نہ چلا۔

گھر پر رُکنے کے بجائے کیڈی نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ جب تک یہاں ہیں میں ساتھ رہوں گا۔''

جانے سے پہلے اُس نے بابا کو یقین دلا دیا تھا کہ دو تین روز میں واپس لوٹ آئے گا۔

سب سے الوداع کہہ کر صبح سویرے ہی وہ اگلے سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ یگولفا گاؤں میں ایک بڑا قبیلہ رہتا ہے جو کوروری قبیلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے سردار سے پار کر نے ملاقات پہلے ہی طے کر لی تھی۔ سردار نے انہیں یہاں آنے کی اجازت خاصی رقم وصول کرنے کے بعد دی تھی۔ حالانکہ یہ پیسے ان کے کسی کام کے نہیں مگر انہیں پیسے لے کر جمع کرنا طاقت کی نشانی لگتی تھی۔

ابھی ایک گھنٹے کا کشتی سے سفر طے کیا تھا کہ نہ جانے یکدم کہاں سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں قبائلیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ تیر کمان اور بھالے تان کر کھڑے ہو گئے۔ کیڈی اور پار کرنے کچھ دیر اُن سے بات کی اور وہاں بھی انہیں کھانے پینے کا سامان اور رقم دے کر معاملہ سلجھ گیا۔

''یہ رقم ان کے اُس وقت کام آتی ہے جب کسی قبائلی لڑکی کی شادی دوسرے قبائلی لڑکے سے طے پاتی ہے۔ ابھی تو سامان اور پیسے لے کر انہوں نے جانے دیا مگر یہ ضروری نہیں کہ واپسی پر صحیح سلامت یہاں سے گزرنے دیں۔'' پار کرنے اندیشہ جتایا۔

''آپ فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا۔'' کیڈی نے گرم جوشی اور پُر اعتماد لہجے کے ساتھ حوصلہ دیا۔

کارسن کو اس سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ کس طرح بھیگی بلی کی طرح لگ رہا تھا اور اب دو ہی دن میں اپنے علاقے میں آتے ہی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اپنی گلی میں تو کُتا بھی شیر ہوتا ہے۔

خیمے تک پہنچنے سے پہلے بارش شروع ہو گئی تھی۔ خیمے کے اندر اینٹوں کا چولھا بنا کر چائے اور رات کا کھانا تیار کیا گیا۔ بارش مسلسل ہوتی رہی۔ آگ کے اردگرد دیر تک بیٹھے وہ باتیں کرتے رہے۔ کارسن نے کیڈی سے پوچھا۔

''تم نے کبھی جِن کو مارا ہے؟''

''میں نے؟ نہیں البتہ بابا نے ضرور مارا ہے''

''جِن کو مار کر کیا کرتے ہو؟''

''پکا کر کھاتے ہیں۔''

''تم نے جِن کھایا ہے؟'' اس نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

''صرف میں نے ہی نہیں بلکہ جنگل کے ہر قبائلی نے کبھی نہ کبھی جِن ضرور کھایا ہے بالکل سؤر کے میٹ جیسا لذیذ ہوتا ہے۔''

اُس نے لانسا اور ہنروی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''انہوں نے بھی کھایا ہے؟''

کیڈی نے ان سے پوچھا تو دونوں نے مسکرا کر ہاں میں جواب دیا۔

کارسن اور اولور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اُس رات جم کر بارش ہوئی۔ خیمے کے اندر بھی پانی برسنے لگا۔ آگ بھی بجھ چکی تھی اور موسم سرد ہو گیا تھا۔ اولور اور پار کر گہری نیند سو رہے تھے اور کارسن کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ کیڈی نے جب بے چینی سے اُسے کبھی کروٹیں بدلتے اور اٹھ کر بیٹھتے دیکھا تو وہ اس کے سلیپنگ بیگ میں اُس کے ساتھ آ کر لیٹ گیا اور اسے اپنے جسم کی گرمی سے راحت دینے کی کوشش کی۔ جسم میں گرمی آتے ہی نیند نے بھی اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُس وقت وہ بھول گیا کہ وہ ایک آدم خور سے لپٹ کر سو رہا ہے۔

صبح بادل چھٹ گئے تھے اور سورج پورے آب و تاب کے ساتھ اپنے جلوے بکھیر رہا تھا۔ ہر چیز تر و تازہ تھی۔ دوپہر تک وہ سب قبائلی سردار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہاں بھی وہ ہی منظر درپیش آیا جو کیڈی کے گاؤں میں تھا۔ انہیں دیکھنے کو بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ وہی خوف، وہی حیرانی پھر دھیمے دھیمے یہ مسکراہٹ بھی کھلکھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ سردار کے حکم سے بچے، عورتیں، نوجوان سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور چند قبائلی اُن کے پاس بیٹھ گئے۔ کھانے پینے کا دور چلتا رہا اور ساتھ میں باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں بھی باہر کی دنیا کو جاننے کا اُتنا ہی تجسس تھا جتنا انہیں قبائلی زندگی جاننے کا۔ باتوں کے دوران سردار نے بتایا کہ:

''جِن کو کھانے کی روایت بہت پرانی ہے۔ حالانکہ یہ اب بہت کم ہو گئی ہے۔ مگر آج بھی رائج ہے۔''

''آپ کو جن کا پتا کیسے چلتا ہے؟''

''جِن کوئی ہمارا دشمن یا قریبی دوست بھی ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جس شخص کو جِن اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرنے لگتا ہے یہ اُس شخص کو معلوم ہو جاتا ہے اور وہ گھر والوں کو اُس کا نام پتا بتا دیتا ہے۔ بدلا لینا ہر قبائلی کا فرض ہے۔ ہم کبھی معاف نہیں کرتے اور اس طرح اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔''

''آپ اُسے کیسے مارتے ہیں؟''

''اس جِن کو درخت سے باندھ دیتے ہیں۔ کمان سے اُسے چھلنی کرتے ہیں بے شک وہ روئے، چلّائے، گڑگڑائے مگر ہم اپنا کام کرتے جاتے

ہیں۔کلہاڑی سے اُس کی کھوپڑی توڑ کر دماغ نکال لیتے ہیں۔جسم کے ایک ایک حصے کے ٹکڑے کر کے اُسے کیلے کے پتے میں لپیٹ دیتے ہیں پھر اُسے لوگوں میں بانٹ دیتے ہیں۔کھوپڑی اُس شخص کے پاس رہتی ہے جس نے جِن کو مارا ہوتا ہے۔اُس کی بوٹیاں اُسی طرح پکاتے ہیں جس طرح سؤر کا ماس پکاتے ہیں۔ دماغ سب سے زیادہ خوشی سے کھایا جاتا ہے۔''

''جِن کے علاوہ کیا قبائلی مردہ بھی کھاتے ہیں؟''

''میں نے کہا نا، ہم انسان کو نہیں کھاتے صرف جِن کھاتے ہیں'' اُس کا لہجہ بڑا تند تھا اس لیے اولور نے اُسے مزید اس موضوع پر گفتگو نہ کرنے کا اشارہ کر دیا۔

اُس رات وہ سو نہیں پائے تھے اور دیر تک اُن لوگوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اگلی صبح روانگی سے پہلے قبیلے کے بچے، عورتیں اور نوجوان سب اُن سے ملنے آئے۔عورتیں اُن کے لیے تازہ مچھلی، ہرے مینڈک، مکڑیاں، کیکڑے جنگل سے شکار کر کے بطور تحفہ دینے ساتھ لائی تھیں۔اُن کے چہرے ایسے اُداس تھے جیسے بہت قریبی رشتے دار جُدا ہو رہا ہو۔اُن کی معصومیت اور اپنائیت کا تحفہ دل میں سمیٹے انہیں الوداع کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔

واپسی کا راستہ ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔شاید اس لیے کہ اب وہ راستوں اور ماحول سے آشنا ہو چکے تھے۔واپسی کے تین دن کے سفر کے بعد وہ ہیلی کاپٹر تک پہنچے۔کیڈی انہیں لانسا اور ہنروی کے ساتھ ہیلی کاپٹر تک چھوڑنے آیا۔جتنا سامان اُن کے پاس تھا وہ سب ان میں بانٹ دیا تھا۔اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا کیونکہ ان کے ساتھ اور راہ نمائی کے بِنا یہ تجربہ ممکن ہی نہیں تھا۔ایک وقت پر تو انہیں لگا تھا کہ شاید اب وہ اس جنگل سے کبھی زندہ لوٹ کر واپس نہیں جا سکیں گے مگر اُن کے ساتھیوں نے اُن کے راستے کی ہر مشکل آسان کر دی تھی۔ بچھڑتے وقت کیڈی تو لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑا تھا۔لانسا اور ہنروی رنجیدہ ضرور تھے مگر وہ اپنائیت سے مسکرا رہے تھے۔

ایوا کی بھیجی تصویر نے ان آٹھ دنوں کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔سارا دن کارسن کا بے چینی میں گزرا۔

شام کو ساحل پر کارسن مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ایوا نے اسے کیفیٹیریا میں منتظر پایا تو اُس کا وجود کِھل اٹھا۔کافی کی چسکیاں لیتے کارسن مدعی پر آ گیا۔

''بہت سی الجھنیں ہیں جو سارا دن دل و دماغ کو پریشان کرتی رہیں''

''بات تو پریشانی کی ہے۔مجھے لگتا ہے تمہیں اپنے تھیسس پر دوبارہ سے نظر ثانی کرنی پڑے گی کیونکہ جو ثبوت میرے پاس ہیں وہ کہیں نہ کہیں تمہارے تجربے سے مختلف ہیں۔''

''تم بتاؤ کیا جانتی ہو میں سُن رہا ہوں۔''

''تم جانتے ہو جب سے امیزون کے جنگلات میں تیل اور گیس کا ذخیرہ ہاتھ لگا ہے اُس پر حق جمانے کے لیے کیا کچھ نہیں ہو رہا۔اُس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں کے قبائلیوں کی ہے جو کام مکمل نہیں ہونے دیتے موقع ملتے ہی وہاں موجود لوگوں کو ختم کر دیتے ہیں۔یورپی کمپنی ہار ماننا نہیں چاہتی لہٰذا انہوں نے بڑے ہتھکنڈے اپنائے مگر کامیابی نہیں ملی۔

آخر میں وہ قبیلے کے لوگوں کو اپنی مٹھی میں کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

''وہ کیسے؟''

''آدم خور قبیلے کو ٹرک بھر بھر کر اُن کی خوراک بھیجی جا رہی ہے جس کے عوض میں وہ کام میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔''

''کیا مطلب؟ یہ سب مردے آئے کہاں سے؟'' اس نے پریشان ہو کر حیرت سے پوچھا۔

''پہلے گینگ وار۔۔۔جب اس سے کام نہ بنا تو عالمی ادارہ صحت کے ساتھ ساز باز۔۔۔!''

''مگر قبائلی لوگ جِن کھاتے ہیں مردے نہیں؟''

''جِن زندہ تو نہیں کھاتے؟ مردہ ہی کھاتے ہیں نا؟''

''ہاں'' باؤلے کی طرح وہ اس کا منہ تک رہا تھا۔

''اس کے پیچھے بھی ایک سازش ہے۔''

''وہ کیا؟''

''قبائلیوں کا دھیرے دھیرے صفایا کر دیا جائے، انہیں بیمار خطرناک جراثیم والے مُردے کِھلا کر'' ایوا نے اس کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔

''جانتے ہو نہ آئے دن وہاں آگ لگ جاتی ہے۔چالیس ہزار بار امیزون کے جنگل آگ کی چپیٹ میں آ چکے ہیں۔کتنے جانور کتنے انسان مرے کوئی اندازہ نہیں۔''

''یہ سب پیسے اور طاقت کی خاطر ہو رہا ہے؟ معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔'' افسردہ لہجے میں کارسن نے کہا۔

''نئی دنیا کی تخلیق ہونے والی ہے۔تم دیکھتے جانا'' ایوا نے پھر سرگوشی کی۔

سورج سمندر میں ڈوبنے کو بے تاب نظر آ رہا تھا اور کارسن کو آسمان پر بکھری سورج کی لالی میں لوگوں کے لہو کا رنگ نظر آنے لگا۔سمندر میں سورج چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے چاروں طرف پھیلنے لگے۔آج اُسے یہ منظر سرشار نہ کر سکا۔یہ بڑھتا اندھیرا اخلاقی قدروں اور انسانیت کو نگلتا محسوس ہوا اور منہ زور طاقتیں، مفاد پرست حکمران اور نئی دنیا کے تعمیر کردہ قبائلیوں سے بھی بڑے آدم خور نظر آنے لگے۔

شوم کا مال

آغا گل
(کوئٹہ)

زندگی بہت ہی رنگین اور دلکش تھی۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو اسلامیہ سکول کی وردی بدل بستہ پٹخ دوستوں کے ہمراہ نکل جاتا۔ میرے والد محمد اکبر خان ان دنوں ڈسٹرک انسپکٹر اسکولز کوئٹہ ڈویژن تھے۔ بلوچستان کہنا جرم تھا۔ سبھی اسے کوئٹہ قلات ڈویژن ہی پکارتے۔ ہر جانب دہشت کی فضا تھی، فلموں کی طرح ہماری سرکار بھی مار دھاڑ سے بھرپور شاہکار تھی۔ بابا بتاتے کہ انگریز ایسے ظالم سنگدل اور کمینے نہ تھے، حکومت کالے صاحبوں کو دے گئے۔ صرف گلیمر کی ہی اجازت تھی۔ بازار حسن، گتے خانے، چنڈوخانے، جوئے کے اڈے سبھی کچھ آباد تھے شاد باد منزل مراد تھے۔ صرف حقوق مانگنے پر پابندی تھی جو کوئی زباں کھولتا سرکاری ٹرک اسے مفت میں قلّی کیمپ پہنچا دیتا۔ یہ ایک عقوبت خانہ تھا۔ انگریز گئے تو بنیادی حقوق مانگتے شہریوں کو پکڑ پکڑ کر قلی کیمپ لے جا کر تشدد کیا کرتے۔ بلوچستان کا شاید ہی کوئی لیڈر قلّی کیمپ یافتہ نہ رہا ہو۔ سبھی اس کوچۂ یار کے اسیر رہے۔ میں نے ضد کر کے لڑ جھگڑ کر سبز رنگ کا ہمبلر سائیکل والد سے حاصل کر لیا تھا۔ ہم سبھی دوست سائیکلوں پر نکل جاتے خوب تفریح رہتی۔ چونکہ والد افسر تھے لوگ بھی خیال رکھتے خصوصاً محکمہ تعلیم کے لوگ تو زیادہ ہی لاڈ کرتے۔

اتنے میں بابا کی تبدیلی قلات ڈویژن ہوگئی جو زلف یار کی طرح طویل تھا۔ اسپیز نڈ سے شروع ہو کر جھٹ پٹ، ایرانی سرحد سے گوادر اور حب تک پھیلا ہوا تھا۔ ہیڈ کوارٹر خضدار تھا جہاں جانے کا یارانہ تھا۔ ہر پندھرو ملیشیاء کے ٹرکوں کے ہمراہ خضدار جاتے۔ اگلے ہی روز لوٹ آتے۔ تمام دفاتر مستونگ میں کام کرتے۔ سرکار سے نالاں لوگ پہاڑوں سے جہاں موقع ملتا افسروں پر گولیاں برساتے اس لیے زندہ واپس لوٹ آنے پر سبھی مسرور ہوتے۔ ہمیں شاہی باغ کے قریب ہی سرکاری رہائش مل گئی۔ چوہدری موہن لال کی دو بسیں تھیں جو کوئٹہ مستونگ کے مابین چلتیں۔ کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ بٹوارہ ہوا تو خان قلات نے منادی کرا دی کہ ہندو ہمارے بھائی ہیں۔ سیاسی تقسیم کے باعث ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ ریاستی حکم کے باعث ریاست قلات کے ہندو قتل عام اور لوٹ مار سے محفوظ رہے۔ وہ بدستور کاروبار کرتے رہے۔ چونکہ نویں جماعت اہم تھی بابا مجھے مستونگ اسکول میں داخل کرانے پہ راضی نہ ہوئے۔ البتہ چھٹی کے دنوں میں یا پھر اتوار کو میں بھی مستونگ چلا آتا۔ یہاں بہت سی شخصیات سے تعارف ہوا جن کے ہاں بابا کا آنا جانا رہتا۔ میں بھی ساتھ ہی ہولیا۔ ملک سعید دھوار، ملک فیض محمد یوسف زئی، وزیر دربار ملک اللہ بخش، بابائے براہوی نور محمد پروانہ جو مستونگ سے اخبار ایلم (بھائی) نکالتے تھے۔ ان دنوں ملنے ملانے کا بہت رواج تھا۔ وسیع دسترخوان، مہمان نوازی اعلیٰ صفت شمار ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر سیٹھ طوطا رام بہت اچھا لگا۔ بڑا ہی نستعلیق انسان تھا، ہندوؤں والی سفید پگڑی پہنتا۔ اچھا خاصا امیر کبیر انسان تھا۔ سنگر میں اس کے باغات تھے، زمینداری تھی، کاروبار بھی تھا۔ اس دولت مندی کے باوجود نہایت ہی انکساری سے پیش آتا۔ اس کا مہمان خانہ ہمہ وقت آباد رہتا۔ چونکہ اس کا حویلی نما مکان سڑک کے قریب ہی تھا۔ آتے جاتے اس کے ہاں ٹھہر جاتے، کھانا چائے گپ شپ اور پھر آگے نکل جاتے۔ خاصہ تعلیم یافتہ انسان تھا۔ مختلف مذاہب پہ اس کی گہری معلومات تھیں۔ ویسے تھا وہ انسان دوست، بابا جب گپ شپ مارتے تو اجازت لے کر میں اس کے ملازم کے ہمراہ باغوں میں نکل جاتا۔ کاریز یا لب جو کے کنارے بیٹھ کر سارا حسن دل میں سمو لینا چاہتا۔ جب کبھی عصر سے رات گئے تک اس کے ہاں محفل جمتی تو اس کی اکثر باتیں میرے سر سے گزر جاتیں۔ ویاس کی شرمید بھاگوت گیتا کے اٹھاراں ابواب اسے ازبر تھے والمیک جی کی رامائین پہ بولتا تو کہانیاں میرے دل میں اترنے لگتیں، زرد زود بلبوں کی روشنیوں میں وہ مجھے قدیم داستان گو دکھائی دیتا۔ جو سر شام الاؤ کے ساتھ بیٹھ کر باقر قصہ گو کی مانند کہانیاں سنایا کرتا۔ فارسی ادب پہ بھی عبور حاصل تھا۔ اچھا بھلا پروفیسر نما کاروباری تھا۔ سرکار دربار میں بھی اثر و رسوخ تھا۔ وہ جانے کیوں ریاست قلات کا وفادار تھا۔ ریاست ڈوبنے سے وہ نراش رہتا کیونکہ ریاست کسی قاعدے قانون کے تحت سینکڑوں برس سے چل رہی تھی۔ جبکہ ون یونٹ کے افسر روایات سے لاعلم تھے۔ تاہم دور دراز علاقوں میں، صحراؤں میں بجلی پانی نہ ہوتے ہوئے بھی ادارے اور اسکول قائم کرتے چلے گئے۔ وہ نئی نسل تیار کر رہے تھے جو خود نظام چلانے کی اہل ہوتی۔ دالبندین، ناگ، لدگشت، کولواہ، تربت اور جانے کہاں کہاں پہنچ گئے۔ البتہ سی ائی ڈی تنگ کرتی کہ لوگ بلوچی، براہوی پشتو بول کر ملک کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ روس زبانوں کا زہر پھیلا رہا ہے۔ قومی زبانوں کو مقامی زبانیں قرار دیتے۔ بلوچستانی زبانیں بولنے والوں کو بھی غدار کہتے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ قائداعظم کی پیاری زبان جبکہ بلوچستانی زبانوں کا زہر پھیلا کر ملک توڑنا چاہتے ہیں۔ لوگ ڈر کے مارے سرکاری دفاتر میں باہم اردو میں بات کرتے، مستونگ میں سیٹھ کو عشق تھا، اگرچہ بقول اس کے شیو بھگوان کا مندر غائب کر دیا تھا۔ سولا کا مقدس درخت جلا ڈالا تھا مگر پھر بھی مستونگ تو مستونگ ہی تھا، وہ اکثر شعر دہراتا۔

بہ مثل جنت المأوی است مستونگ
مگر ایں مسکن روح الامیں است

خود تو وہ سنگر میں ہی رہتا مگر اس کی دکان مستونگ میں بھی تھی۔ کار میں چلا آتا اور سہ پہر میں اپنی حویلی میں لوٹ جاتا۔ ڈپٹی کمشنر کو ریاست قلات کے پرانے عہدے ناظم کے نام سے پکارا جاتا یوں تو وہ بے تاج بادشاہ تھا لیکن سیٹھ سے اچھے مراسم تھے۔ سرکاری افسروں کو تاکید تھی کہ علاقے اور اس کے لوگوں کو سمجھیں جس کا واحد ذریعہ وہی پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹیرز تھے جو انگریز لکھوا کر چلتے بنے تھے۔ افسروں کو تاکید تھی کہ وہ انگریزوں کے گزیٹیرز غور سے پڑھیں کہ

پانچ دس ہزار انگریزوں نے کیسے پورے برصغیر کو غلام بنا رکھا تھا۔ ہماری فوج ہماری پولیس اس نے تیار کی تھی جو اشارے کی منتظر رہتی۔ حکم ملتے ہی اپنے گھروں کو سنگینوں میں پرو ڈالتے، گولیاں برساتے اور اپنی بوٹوں والی سرکار نے پورے برصغیر کو برما سے کشمیر تک غلام بنائے رکھا۔ کئی بار ہماری موجودگی میں ہی نئے افسر چلے آتے، جو چاہتے کہ سیٹھ پل بھر میں علاقہ کنٹرول کرنے کا طریقہ سمجھا دے۔ وہ سیٹھ سے رواجی قانون کے بارے میں بھی دریافت کرتے جس کے تحت ریاست صدیوں سے کام کرتی رہی۔ یوں تو برطانوی دستور کے مطابق یہاں بھی تحریری قوانین نہ تھے، بس رواجی قوانین کا ہی احترام کیا جاتا۔ سیٹھ گھما پھرا کر ریاست قلات کے ہی گن گانے لگتا۔ اسے خوف تھا کہ سرکار لوگوں کو باہم بانٹ کے الگ الگ کر کے انہیں کمزور کر دے گی۔ مذہبی جنون اور فرقہ بندی کو پروان چڑھائے گی۔ نیا کلچر ایک سیلاب کی مانند آئے گا۔ سبھی کچھ خس وخاشاک کی مانند بہا کر لے جائے گا۔ ریاست قلات کبھی بھی انڈیا کا حصّہ نہ رہی۔ انگریزوں سے بھی آزادانہ معاہدے کیے وہ 1876ء اور 1895ء کے معاہدوں کا ذکر کرتا، پرشو بلوچ باونڈری بھی مقتدر اعلی ہونے کے ناطے خان نے خود ہی طے کی تھی کیونکہ وہ مقتدر اور آزاد حکمران تھا۔

مستونگ بہت اچھا سا قصبہ تھا۔ سویا سویا سا، باغات، کاریزیں اور پرسکون زندگی۔ کچھ کام بھی اتنا نہ تھا۔ جب ہم سنگر (پتھر کا مورچہ) جاتے سیٹھ کے ہاں تو میں بزرگوں کو محو گفتگو چھوڑ کر باغوں میں نکل جاتا۔ سیٹھ سات منہ کی رودراکش مالا گلے میں پہن کر بیٹھتا تو پوتر تا شیگو ان بھگوان کی شکتی اس پر اتر آتی۔ عجیب ہی پُر اسرار سی شخصیت تھی وہ حاضرین کو شکراج سے یسوع مسیح کی ملاقات کا واقعہ بھی سناتا باہر نکل کر والد کہتے کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے سیٹھ کی باتیں نکال دیا کرو، وگرنہ ان باتوں کو دھرانے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ سیٹھ کبھی چھا جانے کی کوشش نہ کرتا، مہمانوں کو زیادہ بولنے کا موقع دیتا۔ مجھے اس کی گفتگو بہت اچھی لگی۔ شام میں درختوں کی بہار، پرندے، لک پاس سے آ کر آماج سے ٹکرانے والی ہوائیں عجب سماں بن جاتا۔ لیکن سیٹھ کا خوف اس کی باتوں سے جھانکنے لگتا۔ وہ مستونگ کے قریبی شہر اورنگ آباد کا ذکر بھی کرتا جہاں سے ہندو نقل مکانی پہ مجبور ہوئے تھے۔ وہ ہندوؤں کو سخت غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ یوں تو بزرگوں کی محفل میں زیادہ بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر علم سمیٹنے کا ذریعہ بھی سیٹھ ہی تھا۔ ''نوکنڈی کا مطلب ہے نو کین کنڈی یعنی نو راستے، بگڑ کر نوکنڈی ہوا۔ گھاس پانی کے سبب جس شہر کی دل بندیفی پسندیدہ کہا جاتا تھا وہ دالبندین ہوا۔ کاہ یعنی گھاس اور نوش یقی پینا بگڑ کر نوشکی بن گیا۔ سیاحین بہ معنی کالا ٹیلہ پھر سیندک کا نام اختیار کر گیا۔ سفر میں نعل بدلنے کی ضرورت پڑتی جہاں نعل لگانے کا اہتمام تھا اس نعل بندیں اور پھر دالبندین کہنے لگے۔ نادر شاہ کو بھی محمد شاہ نے پیغام دیا تھا کہ جنگ نہ کرے تو دو کروڑ روپیہ بطور نعل بندی ادا کرے گا۔'' سیٹھ کی باتیں سبھی سنجیدگی سے سنتے اور احترام کرتے۔ مہمان اسے زیادہ بولنے پہ اکساتے بلکہ مجبور کرتے جبکہ میزبان ہونے کے ناطے وہ مہمانوں کو اظہار رائے کا کہتا۔ انگریزوں کا سخت مخالف تھا جو برصغیر کو لوٹ کر چلے گئے۔ ''ملک حلی نے ہمایوں کو باہوٹ بنا لیا تھا، ورنہ تو ہندوستان کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ ہمایوں نے بادشاہ بن کر سنگر اور طیری کے معززین کے لیے سو سو اشرفیاں سونے کی بھجوائیں تھیں کیونکہ غریب الوطنی کے دوران انہوں نے بہت خیال رکھا تھا'' سیٹھ نے ہی بتلایا کہ اس کا ہم نام طوطا رام 1934ء میں مستونگ سے نوشیروان نامی اخبار نکالتا تھا۔ شاید لاہور سے چھپواتا ہوگا۔ بلوچستان میں تو چھاپہ خانہ ہی نہ تھا اور جو ایک تھا بھی اس پہ پابندی تھی کہ صرف سرکاری چیزیں شائع کرے گا۔ اہل بلوچستان کی سرکار نے زبان ہی کھینچ لی تھی، لکھنے بولنے پہ شاید سزائیں دی جاتیں۔ اسی نے بتلایا تھا کہ خضدار سے ایک سڑک نکال کر اسے کراچی سے ملا دیں گے جس کے باعث سفر آسان ہو جائے گا۔ کسی سوال کے جواب میں سیٹھ نے بتلایا تھا کہ ہندو صبح اور شام کے وقت پانچ سازوں والی نوبت پنجتوری بجایا کرتے۔ قلعہ سے بلند ہونے والی پنجتوری کے باعث قلعہ کو ہی پنجتوری کا نام دیا جس نے پنج پور اور پھر پنجگور کا نام اختیار کیا۔ ہندوؤں کی ہزاروں برس قدیم روایات ختم ہو رہی تھیں۔ سرکاری دفاتر چونکہ مستونگ میں تھے اکثر لوگ اپنے کام کے لیے آیا جایا کرتے۔ مستونگ میں بڑی چہل پہل رہتی۔ نئے دفاتر بھی بن رہے تھے۔ چوہدری موہن لال کی بس غنیمت تھی۔ میں گھر سے پیدل نکل سائنس کالج کے سامنے آ کھڑا ہوتا، وہیں سے بس پہ سوار ہو جاتا۔ اگلے روز واپس اتر جایا کرتا۔ چھٹیاں زیادہ ہوں تو میں بھی والد کے ساتھ دورے پہ نکل جاتا۔ ریاست قلات بجائے خود حسین ترین اور متنوع تھی۔ پہاڑ، صحرا، گھاٹیاں کوہ ہر بوئی اور شاشان جیسے جنگلات محبت کرنے والے پر خلوص انسان۔ قدیم تہذیبوں کی امیں جہاں ہزاروں برس قبل گہر بند تعمیر کیے گئے تھے۔ آب پاشی کا جدید ترین نظام بھی متعارف کرایا گیا تھا۔ سیٹھ کے خدشات کو بابا فوبیا قرار دیتے تاسف کرتے اور سیٹھ کی ذہنی حالت پہ افسوس کرتے جو بلاسبب مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان سے خوف کھاتا۔ ریاست کے درباری کی مانند ماضی میں رہتا ہے۔ حال کو ماننے پہ آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ سیٹھ 1763ء کے جنگجوؤں کو یاد کرتا جو ریاست قلات سے نکل کر مرہٹوں کے خلاف لڑے تھے، ریاست بہاولپور کی وزارت موروثی طور پر بلوچوں کے پاس ہی رہتی۔ وہ تو خود کو بھی بلوچ ہندو قرار دیتا۔ اس پانچ سو برس قدیم ریاست کا وہ واحد قصیدہ خواں یا مرثیہ خواں تھا۔ نوشکی کے ہندو بھی اس کی بڑی عزت کرتے کیونکہ چند بار ذکر چھڑا تو سبھی اس کے معترف نکلے۔ قلات کی بہت ہی حسین اور دل ربا یادیں تھیں۔ والد نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں نے فرسٹ ڈویژن لی تو مجھے سو روپیہ انعام دیں گے۔ میٹرک کا نتیجہ آیا تو کسی کو بتلائے بغیر ہی سائیکل پر نکل پڑا، لک پاس پہ سائیکل کو گھسیٹا، بہت چڑھائی تھی۔ سہ پہر میں مستونگ پہنچ گیا۔ راہ میں بارش نے آ لیا، انعام تو ملا۔ مگر بہت ناراض ہوئے کہ بس میں آ جاتے، سیٹھ کر علم ہوا تو مجھے بلوا کر انعام دیا، بڑی محبت والا انسان تھا۔ بڑا ہی دیالو تھا۔

میں اکثر والد کے ہمراہ ان کے ہاں جایا کرتا۔ چند برس بعد والد کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا تو بھی تعلقات اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ سیٹھ ملنے چلا آتا اور کبھی ہم

اس کی دعوت پہ جاتے جہاں علم وادب کی باتیں ہوا کرتیں۔انگریز ایک سیکولر ملک چھوڑ کر گئے تھے مگر بھارت میں برہمن ازم اور ہمارے ہاں ملاازم کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔سیٹھ کی باتوں میں کہ ہم بدستور غلام ہیں پہلے تو مجھے یقین نہ ہوتا مگر جب پولیس نے ایک رات اچانک کالج ہاسٹل پہ چھاپا مارا اس قدر لاؤ لشکر تھا جیسے لال قلعہ پر حملے کی تیاری ہو۔ہاسٹل کے وراڈن یا پرنسپل کے ذریعے تلاشی لی جاسکتی تھی مگر طلبا پر حملہ عام ہوا۔ظریف خان نے غصّے میں آ کر ڈپٹی کمشنر جمشید برکی کی جانب پتھر پھینکا۔جواباً ظریف پہ گولی چلائی گئی،وہ شہید ہوا تو پولیس ہاسٹل میں گھس گئی،طلبا کیا مزاحمت کرتے کچھ کود کر پٹیل روڈ کی جانب نکل گئے۔رحمت میرے گھر دوڑا ایا چلا آیا۔جلدی سے اسے چھپایا،سپاہی نے اس کی گردن پہ بٹ مارنا چاہا تھا وہ جھکائی دے کر نکل گیا ورنہ وہیں مارا جاتا۔طلبا کو پکڑنے رگرفتار کرنے کی رسم چل نکلی تھی۔جو کوئی بولتا وہ بھارتی یا روسی ایجنٹ یا کافر قرار پاتا۔بھٹو نے لیڈروں پہ نیا قہر توڑا جنکا ذکر انگریزوں کے دور میں سنا تھا کہ طلباء کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔اسے جنرل بننے کا شوق تھا،وردی بھی ویسی ہی پہنتا،بلوچستان پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے میں بھی کامیاب ہوا لیکن اسے جرنیلی راس نہ آئی،استعفی پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو ٹھوکریں مار مار مردہ جسم تارا مسیح کے حوالے کردیا۔سیٹھ کی باتیں جسے کبھی مجذوب کی بڑ سمجھتا اب حقیقت کے قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔میرے کئی دوست قلی کیمپ لے جائے گئے،شاہی قلعہ لاہور کا عقوبیت خانہ بھی وطن دوست انسانوں کا مہمان خانہ بنا ۔ہر جانب غربت،افلاس،مایوسی،خوف اور سیاہی پھیل گئے۔قاشم کی طرح سپاہی خود ہی زمین سے اگ اگ باہر آتے چلے گئے۔سریاب پھر تھانہ سونا خان،لک پاس کی چڑھائی پھر نوشکی موڑ غرضیکہ ٹنڈی کی طرح اتنے سپاہی زمین سے نکل آئے کہ ہم انہیں برآمد کر کے زرمبادلہ بھی کما سکتے تھے۔انہی دنوں شناختی کارڈ کی باتیں ہونے لگیں کہ ہر شہری کا ایک قومی شناختی کارڈ ہوگا۔مستونگ اور سنگر نے بہت ہی تاریخ ساز شخصیات سے ملنے کا اعزاز بخشا۔سردار محمد زمان محمد شہئی،نواب عبدالقادر شہوانی، بابو عبدالرحمان کرد،میر عبدالواحد کرد،زمرد حسین قلاب پبلشر والے،سردار بہادر خان بنگلزئی،میر عبدالعزیز کرد،ملک فیض محمد یوسف زئی،ملک عبدالصمد خواجہ خیل،ملک محمد سعید دھوار اور میرے دوست ملک سیف الدین۔اس زمانے میں خبروں پہ پابندی تھی۔لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ میر عبدالواحد کرد سات برس بعد رہا ہو کر کوئٹہ میں شیر محمد مری کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ چند لوگ تپاک سے ملے اور دریافت کیا کہاں رہے بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔شیر محمد مری نے ایک آہ سرد کھینچی کہ اے قوم افسوس جو لیڈر سات برس تمہارے لیے جیل میں رہا تم کہتے ہو کہاں رہے۔سردار عطاء اللہ مینگل وزیر اعلی کا مستونگ روڈ پہ جلسہ ہوا تو مکھی سودھر اس نے تقریب کی ابتدائی تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا۔دو قومی نظریہ کا ڈھو لچی لوڑی یہاں سر نہ نکال سکا۔نومبر ۱۸۳۹ء میں جب برٹش آرمی قلات پر حملہ آور ہوئی تو ہندو بھی ہتھیار لے کر میری میں مورچہ بند ہو گئے۔خان نے روکا اور مشورہ دیا کہ کچھ دیر کے لیے قلات سے چلے جائیں مگر انہوں نے انکار کردیا کہ ہم بلوچستانی ہیں پیچھے ہٹے تو تاریخ کو کیا منہ دکھائیں گے۔دیوان بچل مل بھی اپنے بیٹوں کے ہمراہ دست بدست لڑائی میں جان پر کھیل گیا۔مگر حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔امریکہ دھڑا دھڑ ڈالر چھاپ کے پھینک رہا تھا۔کوئٹہ،سرانان میں ڈالروں کے اسٹور تھے جہاں بنڈل کے بنڈل ڈالر بانٹے جاتے۔وہ دھڑ سے کوئٹہ کے کرنسی ڈیلروں سے پاکستانی نوٹ لیتے۔ دولت کا سیلاب آ گیا۔سعودی بادشاہ روحانیت کا پیکر مجسم بھی جہاد کے نعرے لگا رہا تھا۔بلوچستان میں Mass Hysteria پھیل گیا۔کلاشنکوف پندرہ ہزار میں اور اس کی گولی ستر پیسے میں ملنے لگی۔ہر طرف جہاد کے نعرے تھے ایسے نعرے میرے دادا ابراہیم لودھی کے خلاف بابر نے بھی لگائے تھے اور دارالشکوہ کے خلاف اورنگ زیب نے بھی لگائے تھے۔سیٹھ طوطا رام کی آبائی زمینوں پہ قبضہ ہونے لگا۔ان افغان بھگوڑوں کو سرکار مجاہدین کہتی تھی۔طوطا رام کے بیٹے نے مقابلہ کیا تو اسے قتل کر ڈالا،قاتل نے گھر جا کر اپنی پچپن سالہ بیوی کو بھی قتل کر کے سیاہ کاری کا کیس بنا دیا۔سرکار بالکل ہی لاتعلق ہوگئی بلکہ جلوس نکلنے لگے کہ قاتل کی بیوی سیٹھ کے بیٹے کے سبب ماری گئی۔لہذا سیٹھ اپنی بیٹی قاتل کو دے کر اس کا نقصان پورا کرے۔بہت ہی سخت دن تھے۔ایک بار میں سیٹھ کی خیریت پوچھنے نکلا تو بلوائیوں نے روک لیا کہ میرا کیا تعلق ہے؟ میں نے بڑے ہی میلے سے جان بخشی کرائی اور پلٹ آیا۔ہندو بڑی تعداد میں نقل مکانی کر رہے تھے۔سیٹھ جو قابوس کے پنجے میں رہتا اس کے خدشات بھیانک رخ اختیار کر چکے تھے۔افغانستان میں دراندازی کے سبب ایک جنون سا پھیلا جا رہا تھا۔والد نیوٹن کے قانون سے بھی خائف تھے کہ ہر عمل کا ردعمل ہوا کرتا ہے انہیں خوف تھا کہ جو آگ ہم افغانستان میں لگا رہے ہیں،بھڑک کر ہمیں ہی لپیٹ لے گی بھسم کردے گی۔پورا ماحول تیزی سے بدل رہا تھا۔بدلا جا رہا تھا۔ہر کوئی لنکا جلا کر نکل نہیں سکتا۔

والد چاہتے تھے کہ اس آفت زدہ علاقے سے جسے بلوچستان کہا جاتا ہے میں نکل جاؤ۔انگریز بہادر اس خطّے کو Hostile Land لکھ گئے تھے۔اب تک اسے آسمانی صحیفے کی مانند سینے سے لگا رکھا تھا۔میں بھی مرکزی حکومت میں جا شامل ہوا۔پاکستان بھر میں کہیں پکڑ دھکڑ نہ تھی اور نہ ہی فورٹ منرو والی بارڈر پولیس جو بلوچستانیوں کو غیر ملکی سمجھ کر تلاشیاں لیتی۔نہ چیک پوسٹ نہ کوئی زنجیر۔ اچانک ہی میرا درجہ ایک باعزت شہری سا ہو گیا۔بلوچستان نے Semi Nomadic سوسائٹی سے کمرشل سوسائٹی میں اتنی بڑی چھلانگ ماری کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں وہ نیم جاں سا ایف سی کی گود میں جا گرا۔چوہدری موہن لال کی ریں ریں کرتی بسوں کی بجائے اب فراٹے بھرتے کوچ آ چکے تھے۔مگر میں تو جہاز میں آتا جاتا رہا کیونکہ بسوں کو روک کر شناختی کارڈ دیکھتے اور پھر ہزارہ یا آبادکاروں کو الگ کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

سرکار نے یہ لکن میٹی ختم کی۔امن کرا دیا تو لوگ باگ دوبارہ بسوں میں آنے جانے لگے۔پی آئی اے مہنگا بھی تھا اور اس کے نشئی جعلی لائنس والے پائلٹ جہاز بھی گرا دیا کرتے۔ان دنوں کراچی تعیناتی تھی سوچا کہ جب تک سرکار دوبارہ ہنگامے کرائے جیپ میں ہی نکل جاؤں۔صدیوں بعد اندرون بلوچستان کی زیارت کروں۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

کیا زندہ رہو گے۔۔؟

وحشی سعید
(سری نگر)

سارا شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ لگتا تھا ایک بار پھر سیلاب ہمارے شہر کو نگل جائے گا۔ سیلاب کی وہ یادیں ہماری تاریخ کا بھیانک حصہ ہیں جنہیں آج بھی یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بار میں غلط ثابت ہو گیا۔ بارش رُک گئی۔ مطلع صاف ہو گیا۔ ہمارے شہر کو نکھری نکھری دھوپ نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

حسب معمول، علی الصبح مَیں چہل قدمی کے لئے تیار ہو گیا۔ جب باہر نکلا، گھر کے باقی افراد سو رہے تھے۔ راستے سنسان پڑے تھے۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا جب کہ ان راستوں پر منٹوں میں سینکڑوں گاڑیاں رواں دواں ہوتی تھیں۔

چہل قدمی کے دوران میری نظر سب سے پہلے نان بائی کی دُکان پر پڑتی تھی۔ وہ اپنے تنور سے تازہ تازہ روٹیاں نکال کر اپنے گاہکوں کو دیتا رہتا تھا۔ اُس کی دُکان کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ نان بائی کی دُکان کے بعد سبزی والے کی دُکان آتی تھی۔ آج یہ دونوں دُکانیں بند تھیں اور بھیڑ بھی غائب تھی۔ میں حیرت میں پڑ گیا اور خود سے سوال کرنے لگا۔۔

''شہر کو یہ کیا ہو گیا۔۔؟ اس نکھری نکھری دھوپ میں شہر کیوں خاموش ہے۔ کیا یہ ایک اور سیلاب آنے کا پیش خیمہ تو نہیں۔۔۔؟''

میں نے گھبراہٹ میں اپنی چہل قدمی ترک کر دی اور گھر واپس آ گیا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر بستر میں گھس گیا۔ منحوس خیالوں سے بھاگنے کے لئے حتی الامکان یہ کوشش کئے جا رہا تھا کہ نیند مجھے اپنی آغوش میں لے لے۔ مجھے نیند کیسے آ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ میں نیند میں اپنے خوابوں کی دنیا سجاتا گیا۔ اچانک میری نیند میں خلل پڑ گیا، کیونکہ میرے کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ کو کسی نے آن کیا تھا۔ جب میں پوری طرح سے جاگ گیا، میں نے وہاں اپنے ملازم کو پایا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔۔

''مجھے نیند سے کیوں جگایا۔۔؟''

ملازم نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔۔

''سر جی! ہمارا شہر بھی دوسرے شہروں کی طرح وبا کی زد میں آ گیا ہے''

میں نے چیختے ہوئے کہا۔۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔۔؟''

ملازم کہنے لگا۔۔

''سر جی! مجھے معلوم تھا کہ آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آئے گا، اسی لئے میں نے ٹی وی آن کیا تا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں''

ٹی وی پر ایک دراز قد کا آدمی نظر آیا جو ناظرین سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔۔

''اپنے ہاتھوں کو دھولیا کریں اور ٹشو پیپر کا استعمال کیا کریں۔ ہاتھوں کو اپنی آنکھوں کی طرف نہ لے جائیں۔ منہ کو ماسک سے ڈھانپ لیا کریں اور ہاتھوں میں دستانے پہنا کریں۔ آپس میں کم از کم دو میٹر کی دوری بنائے رکھیں۔۔ ۔اور گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے''

دراز قد آدمی جب یہ ٹی وی پر کہہ رہا تھا، ٹھیک اُسی وقت میرے گھر کے قریب سے ایک پولیس گاڑی یہ اعلان کرتے ہوئے گزر گئی۔۔

''گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے۔۔''

میرے گھر کے سبھی افراد ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ جانے انجانے میں ایک دوسرے سے دوری بناتے گئے۔ وہ ایک دوسرے کے چہروں کو تک رہے تھے۔ دہشت کا ایک ایسا ماحول بنا ہوا تھا کہ کوئی کسی سے کچھ نہ کہہ پا رہا تھا۔ بالآخر میری بیٹی نے سوال کیا۔۔۔

''یہ کیسے ہوا۔۔؟''

میری بیٹی کے اس سوال کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے میری بیوی نے گھر کے ملازم سے کہا۔۔

''اس سے پہلے کہ دکانیں بند ہو جائیں بازار سے کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیاں لے کر آؤ۔ ماسک اور دستانے بھی لانا۔۔۔اور ہاں سینی ٹائزر بھی''

ملازم اشارہ پاتے ہی مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ اب ہم سب ماسک اور دستانوں کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ملازم سامان لے کر واپس آ گیا۔ میری بیوی نے سامان چیک کیا اور اطمینان کی سانس لی۔

ملازم میڈم کی طرف مخاطب ہوا۔۔۔

''میڈم جی! مجھے گھر جانے دیجئے''

میڈم نرم لہجے میں بولی۔۔

''اعلان نہیں سنا۔۔ گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے۔۔۔!''

ملازم نے پھر اصرار کیا۔۔۔

''میڈم مجھے جانے دیجئے''

سڑکوں پر ایمبولنس گاڑیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد شہر نہ ٹوٹنے والی خاموشی میں ڈوب گیا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ اچانک پولیس جیپ کے اس اعلان نے ہم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔۔

''گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے۔۔۔!''

''چہارسُو''

اس بار یہ اعلان کچھ طویل تھا کیونکہ اس میں مزید جملے بھی سننے کو مل رہے تھے۔۔

''مسجدوں میں نمازیں پڑھنا ممنوع ہے''

ملازم نے میری طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا۔۔۔

''سر جی! مسجدوں میں تالے چڑھ گئے اب تو مجھے گھر جانے دیجئے''

میں نے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر ملازم سے مخاطب ہو گیا۔۔

''جاؤ بھئی جاؤ''

ملازم چلا گیا۔ گھر کا سارا کام اب ہم کو خود کرنا پڑا۔ پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہماری مشینی طرز کی زندگی میں گھریلو ملازم کی کتنی اہمیت ہے۔

دو ماہ گزر گئے۔ اب ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ قید و بند کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم دو مہینے سے نہیں بلکہ دو سال سے قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اب گھر کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ بازار جانے کی نوبت پھر سے آ گئی۔ بازار میں جو بھی ملا، وہ اپنے چہرے کو ماسک سے ڈھکے ہوئے تھا۔ ہر ایک مشینوں جیسی حرکتوں میں مصروف تھا۔ میرا شہر روبوٹوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کرانہ اور سبزی کی دکانوں کے ساتھ ساتھ میڈیکل شاپ بھی کھلے ملے۔ ہر جگہ روبورٹوں نے دو میٹر کی دوری بنائے رکھی تھی۔ زندگی کے نئے ضوابط و قوائد لاگو ہو گئے تھے۔ ذہنی تناؤ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اب ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے رہے تھے کہ ہمارے پاس کھانا ہے، دوائیاں ہیں، زندہ رہنے کے لئے سب کچھ دستیاب ہے۔ لیکن وہ لوگ جو شدید گرمیوں میں گھر جانے کے لئے تڑپ رہے ہیں، اُن کے پاس کھانا ہے اور نہ پانی، نہ گھر جانے کے لئے سواری ہے۔ بے کسی کے اس عالم میں وہ سب آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

سیلاب نے اس شہر کو زندہ چھوڑا۔ لیکن اب لگتا ہے اس شہر کو یہ آفت تتر بتر کر کے چھوڑے گی۔ اس شہر کی آبادی روبوٹوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور یہ روبوٹ اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر لئے ہوئے نامعلوم منزل کی طرف جا رہے تھے۔

جب سیلاب کا پانی اُتر گیا تھا تو اس نے اپنے ساتھ تباہ کاریاں بھی لائی تھیں۔ اس میں لوگ بہہ گئے تھے ہزاروں کی تعداد میں مویشی ڈوب گئے تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں سیلاب کی نذر ہو گئی تھیں۔ ہمارا شہر اُجڑ گیا تھا لیکن ہماری ہمت نہیں ٹوٹی تھی۔ ہمارا جذبہ سلامت تھا۔ چند مہینوں بعد ہمارا شہر پھر سے زندگی کی طرف رواں دواں ہوا تھا۔ لیکن اس بار ہماری ہمت جواب دے رہی تھی۔ ہمارا جذبہ مفلوج ہو رہا تھا۔ اس آفت کے سامنے لاکھوں دم توڑ رہے ہیں۔

پولیس کی جیپ پھر ایک بار اعلان کر رہی تھی۔۔۔

''گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے۔۔!''

پولیس جیپ کے جاتے ہی چوک کی مغرب سے موٹر سائیکل پر سوار تین نوجوان نمودار ہو گئے۔ اُن کی موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ چوک میں کھڑے وردی والوں پر گولیاں چلاتے ہوئے وہ آناً فاناً غائب ہو گئے۔ کئی وردی والوں کو گولیاں لگیں۔ ان میں سے کئی دم توڑ گئے اور کچھ زخمی ہو گئے۔ اُس وقت مخالف سمت سے ایک چھوٹی سی سفید گاڑی کو آتے ہوئے وردی والوں نے روکا۔ اُس میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو اپنے پانچ سالہ پوتے سمیت گاڑی سے باہر آنے کے لئے کہا۔ وردی والے جوان نے اپنے آفیسر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔۔

''سر! یہ روبورٹ نہیں ہے۔ نہ اس کے چہرے پر ماسک ہے اور نہ ہاتھوں میں دستانے''

آفیسر نے اشاروں کی زبان استعمال کی۔ جوان نے بندوق سنبھالی اور ادھیڑ عمر کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ روتا ہوا پانچ سال کا بچہ لاش کے ساتھ لپٹ گیا۔ بچہ لاش سے کہہ رہا تھا۔۔

''دادو!۔۔ اُٹھو، گھر جانا ہے''

اور ٹھیک اُسی لمحے وہاں سے پولیس کی جیپ ایک بار پھر یہ اعلان کرتی ہوئی گزری۔۔۔

''گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے۔۔۔!!''

- بقیہ -

''شوم کا مال''

سڑکوں پہ جگہ جگہ ایف سی کے جوان چیک پوسٹ سجائے اسپیڈ بریکر لگائے کھڑے تھے۔ یہ بڑے بڑے سے اسپیڈ بریکر تھے۔ امن کی بڑی بڑی قبریں جن کے سجادہ نشین اور متولی سپاہی تھے۔ چراگی بھی وصول کرتے۔ تلاشیاں بھی لیتے پکڑ دھکڑ بھی ہوتی مگر امن ہو گیا تھا۔ سڑکیں محفوظ تھیں۔ کھڈ کوچہ کے آتے ہی دل میں سیٹھ کی یاد ابھر آئی۔ اب میں افسر تھا، باوردی ڈرائیور اور گارڈ والا۔ سنگر کے پاس سیٹھ کی حویلی کی جانب جیپ موڑ دی۔ حویلی شکستہ حال تھی، ہریالی ختم ہو چکی تھی باغ اجڑ چکا تھا۔ جیپ رکتے ہی مسلح افراد باہر نکل آئے اور مجھ سے تعارف چاہا۔ میں نے بتلایا کہ سیٹھ کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ سیٹھ غدار تھا چھپ چھپاتے ہی جانے کہاں کھسک گیا۔ صبح ہوئی تو حویلی خالی تھی۔ برسوں گزر گئے وہ کبھی کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔ وقت سائیں سائیں کرنے لگا۔ ''اب یہ حویلی کس کی ہے'' انہوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ایک بزرگ مسکرایا ''آپ افسر ہو کر بھی نہیں جانتے کہ شوم کا مال غازی کھاتا ہے۔''

"دستِ کرم"

علامہ طالب جوہری

(●)

جہت کو بے جہتی کے ہنر نے چھین لیا
مری نگاہ کو میرے ہی سر نے چھین لیا

ہے کس کے دست کرم میں مہار ناقۂ جاں
سفر کا لطف غم ہم سفر نے چھین لیا

میں اپنی روح کے ذرے سمیٹتا کیوں کر
یہ خاک وہ تھی جسے کوزہ گر نے چھین لیا

بھٹک رہے ہیں جوانی کے نارسا لمحات
بہت سے گھر تھے جنہیں ایک گھر نے چھین لیا

بقول غالبؔ دانا گزر ہی جاتی یہ عمر
مگر اسے بھی ترے رہ گزر نے چھین لیا

شکارگاہ شکاری کے خوں سے رنگیں ہے
زمیں کا رزق کسی جانور نے چھین لیا

سفر کی روح تھا وہ ذوق جستجو طالبؔ
جسے چراغ سر رہ گزر نے چھین لیا

○

احمد مشتاق

(ویسٹ ورجینا)

آج رو کر تو دکھائے کوئی ویسا رونا
یاد کرائے دلِ خاموش وہ اپنا رونا

رقص کرنا کبھی خوابوں کے شبستانوں میں
کبھی ماضی کے ستونوں سے لپٹنا رونا

کس سے سیکھا ہے یہ رونے کا طریقہ اے ابر
کہیں قطرہ نہ گرانا ، کہیں دریا رونا

رسم دنیا بھی وہی، راہِ تمنا بھی وہی
وہی مل بیٹھ کے ہنسنا، وہی تنہا رونا

تیرا یہ طور سمجھ میں نہیں آیا مشتاقؔ
کبھی ہنستے چلے جانا، کبھی اتنا رونا

○

یونس شرر (نیویارک)

(اوپن ہارٹ سرجری کے بعد کمرۂ ہسپتال سے)

کوئی موسم نہ معتبر دیکھا
ساری دنیا میں شور و شر دیکھا
حادثوں کی خبر یہ دیتا ہے
اک ستارہ جو بام پر دیکھا
یہ ہی احوالِ زندگانی ہے
دوش پر ہوا کے گھر دیکھا
خوں کہاں سے آیا شیشے میں
خشک آنکھوں کو تر دیکھا
جان لے کر چلے ہتھیلی پر
فاصلہ دیکھا نہ رہگزر دیکھا
کشتیاں جلا دیں ساحل پر
حوصلوں میں عجب اثر دیکھا
آج کا غم ہے کل کے اندیشے
ایک دنیا کو نوحہ گر دیکھا
لوگ سہمے سہمے کھڑے ہیں گلیوں میں
خوف سا خوف ڈر سا ڈر دیکھا
جل گئے پرند شاخوں پر
ہم نے ایسا بھی اک شجر دیکھا
موجِ خوں شہر کر گئی ویراں
شہر یاروں کو بے ہنر دیکھا
واہمہ ہے کہ یہ حقیقت ہے
اُس کے شانوں پہ اپنا سر دیکھا
جس کی شاخوں پہ پھول کھلتے تھے
آج لٹکا وہیں پہ سر دیکھا
کسی صورت قرار آ جائے
میں نے اس کو بھی بھول کر دیکھا
جان آتی ہے اُس کے چھونے سے
اُس کے ہاتھوں میں یہ اثر دیکھا
عمر کاٹی جہاں کی لذت میں
شہرِ جاناں کو منتشر دیکھا
اک ہجوم ساتھ تھا اُس کے
آج گلیوں میں پھر شرر دیکھا

منظر بھوپالی

(بھارت)

آنکھ بھر آئی کسی سے جو ملاقات ہوئی
خشک موسم تھا مگر ٹوٹ کے برسات ہوئی

دن بھی ڈوبا کہ نہیں یہ مجھے معلوم نہیں
جس جگہ بجھ گئے آنکھوں کے دیئے رات ہوئی

کوئی حسرت کوئی ارماں کوئی خواہش ہی نہ تھی
ایسے عالم میں مری خود سے ملاقات ہوئی

ہو گیا اپنے پڑوسی کا پڑوسی دشمن
آدمیت بھی یہاں نذر فسادات ہوئی

اسی ہونی کو تو قسمت کا لکھا کہتے ہیں
جیتنے کا جہاں موقع تھا وہیں مات ہوئی

اس طرح گزرا ہے بچپن کہ کھلونے نہ ملے
اور جوانی میں بڑھاپے سے ملاقات ہوئی

حمیرا رحمان
(نیویارک)

بہت دن ہو گئے ہیں غار سے باہر نکلنا ہے
ہمیں خود اپنے استفسار سے باہر نکلنا ہے

صداؤں کا تعاقب کرتے کرتے سُن ہوئی آنکھیں
انہیں اب روزنِ دیوار سے باہر نکلنا ہے

ہوا اور روشنی سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں
اور اپنے گرد کے انکار سے باہر نکلنا ہے

مہینوں سے کوئی اچھی خبر چھو کر نہیں گزری
ہمیں ہر روز کے اخبار سے باہر نکلنا ہے

یہ کشتی کھینچتی ہے اپنی ہمت کے بھروسے پر
کچھ احسانات کے انبار سے باہر نکلنا ہے

جو ضائع ہو رہا ہوں اپنے ہونے کی گواہی میں
کہانی کے اسی کردار سے باہر نکلنا ہے

حمیرا جس میں رہ کر خواب سے رشتہ نہیں رہتا
ہمیں اس لمحہ بیدار سے باہر نکلنا ہے

○

پریمی رومانی
(پونے)

زندگی بھر حادثے پر حادثہ ہوتا رہا
میں سمندر میں بھی رہ کر آج تک پیاسا رہا

خواب ہر اک رات کے بکھرے پڑے تھے راہ میں
ٹوٹ کر کچھ رہ گیا خاموشیوں کا سلسلہ

جس کسی نے بھی کنواں کھولا تھا میری راہ میں
سر کے بل وہ خود بہ خود جا کے کنویں میں گر گیا

آسمانوں سے پرے کیسے اڑوں گا عمر بھر
آسمانوں کی وسعتوں سے ہوں میں نا آشنا

ایک دن راز نہاں میرا بھی ہو گا آشکار
رات کے آنچل میں چھپ جاوں کہاں تک میں بھلا

ملتی جلتی اس سے اک صورت تھی شاید وہ نہ تھا
ایسا لگتا ہے سراسر مجھ کو یہ دھوکا ہوا

عمر بھر پریمی ہوا ہوں سازشوں کا میں شکار
صورت حالات سے بھی نہ سمجھوتہ کیا

○

مشیر طالب
(نیویارک)

میرے ہمدم قصۂ دار و رسن، جانے بھی دے
دردِ پیہم کا ہے باعث یہ سخن، جانے بھی دے

گلشنِ امید کی شاخوں پہ کلیاں جل گئیں
حاصلِ بے کار ہے اب یہ لحن، جانے بھی دے

بادۂ بے اختیاری کے نشہ میں چور لوگ
آگ میں نہ جھونک دیں سارا وطن، جانے بھی دے

عدل کے ظالم خداؤں کی رعونت، کیا کہیں
اپنی مرضی کے یہ مالک جانِ من، جانے بھی دے

کتنی فریادوں نے حق طلبی میں جاں ہاری یہاں
کتنی پوشاکیں ہوئی ہیں بے بدن، جانے بھی دے

چلمنوں کے اُس طرف بھی اک سکوتِ مرگ ہے
اس طرف بھی خوف میں ہے جان و تن، جانے بھی دے

منصفانِ بے عمل پے انصرامِ مال و زر
ہو گیا انصاف بھی مرہونِ دھن، جانے بھی دے

عدل کی اس چشم نم سے کرتے کرتے انحراف
یہ ترازو بھی پہن لے گا کفن، جانے بھی دے

○

افق فریدی
(میرٹھ)

شہر میں کوئی نہیں ہے میرا چہرا آشنا
ایسا لگتا ہے کہ میں ہوں خود سے تنہا آشنا

اک صدا مانوس سی ٹکرا رہی ہے بار بار
اس بیاباں میں ہے شاید کوئی میرا آشنا

تجھ میں ہمنے پائی ہیں ساری روایاتِ کہن
دل ترا بابِ وفا اور تو غزل کا آشنا

اب کہاں مجنوں کو ہے صحرانوردی سے شغف
اور اب خوئے وفا بھی کب ہے لیلیٰ آشنا

کاش تجھ پر بھی گزرتی وہ جو گزرے ہے یہاں
کاش تو ہوتا مرا امروز و فردا آشنا

کیا خبر تمکو کہ کیا ہے حق نوائی کا صلہ
کاش تم میں ہوتا کوئی کربلہ کا آشنا

کلمہ حق سے کیا مانوس ہمنے دشت کو
اور دریا کو کیا جلتا سفینہ آشنا

عقل بیچاری ہمیشہ ہوش مندی کا شکار
اور سینے میں دھڑکتا دل تمنا آشنا

○

ڈاکٹر قطب سرشار

(محبوب نگر)

ہوا کی سانس رُکی نبضِ موجِ بحر تھمی
حصارِ شہر میں ویران ہے ہر ایک گلی

یہ ساز و نغمہ و رقص جنون و بے خبری
فسادِ فکر و عمل ہے نشاطِ تیرہ شبی

زمین جب کہ ہے مِلکِ خدا فساد ہے کیوں؟
مسافروں میں زمین و مکان کی دُھن کیسی

کسی کی سوچ ہوئی اختراعِ جہلِ مبیں
کسی کا طرز ادا ہے تمام خوش طبعی

جبیں نوشتہ حرفِ گماں نہ ہو ورنہ
سکون چھین ہی لے گا نصیبِ تشنہ لبی

خدا کے دین پہ ہی انحصار کرتے رہیں
ہوس کی گود میں ہے عارضی ہر ایک خوشی

ہے التہاب نفس نکتہ چینی و شکوہ
قتیلِ حظِّ انا ہے شعار خود نگہی

○

اشرف جاوید

(لاہور)

آسماں سے فرار ہوتا ہوا
اک ستارہ غبار ہوتا ہوا

ایک آنسو نکل کے ساحل سے
چل پڑا بے کنار ہوتا ہوا

اُس نے ہجرت کی ٹھان لی ہوئی ہے
میں بھی رستے میں غار ہوتا ہوا

دستِ قاتل میں خم نہیں آیا
سر بھی شانوں پہ بار ہوتا ہوا

کرتا رہتا ہے رات دن سے الگ
کوئی اوقاتِ کار ہوتا ہوا

میں نے دیکھا ہے پیٹ کی خاطر
اک پرندہ شکار ہوتا ہوا

قاش در قاش کٹتا جاتا ہے!
گل ہوا پر سوار ہوتا ہوا

آئنہ بار بار ٹوٹ گیا!
سانحہ بار بار ہوتا ہوا

سانس چلتی ہے یا کوئی مجھ میں
تیر ہے آر پار ہوتا ہوا

○

احمد سوز

(ممبئی)

جب کھلی آنکھ خوش ہوا تھا میں
اک برے خواب میں پھنسا تھا میں

پیار بھی کچھ دنوں کا ہوتا ہے
کچھ دنوں تک تو دلربا تھا میں

کردیا ڈھیر خواہشوں نے مجھے
خواہشوں سے بہت بڑا تھا میں

مجھ میں بھی خو ہے عیب جوئی کی
خامیاں ڈھونڈ نے لگا تھا میں

خود کو پہچاننا ہے نا ممکن
صرف اک نام تھا پتا تھا میں

حسن نے اس کے کردیا مسحور
جب ملا اس سے دوسرا تھا میں

میں ہوں کیا شاعری ہے کیا میری
کہیں اک کونے میں پڑا تھا میں

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

رات بھر نیند اب تو آتی نہیں
یاد ان کی تو دل سے جاتی نہیں

ان کی یادوں کی برق گرتی ہے
روشنی تب بھی دل میں آتی نہیں

فصل گل چھا چکی چمن میں مگر
اس کی خوشبو ادھر کو آتی نہیں

ایک پل میں ہی جل گیا خرمن
کس خطا پہ سمجھ یہ آتی نہیں

ہم نے چاہا تھا جن کو جی بھر کر
صورت ان کی نظر سے جاتی نہیں

کیا سے تھے وہ کسی شامیں تھیں
اب کوئی شام مسکراتی نہیں

کیسے گزریں گے دن بغیر ان کے
ان کی آہٹ بھی اب تو آتی نہیں

مل گئے خاک میں حسیں چہرے
روح کبھی ان کی لوٹ آتی نہیں

چھت۔۔۔چھت کے اوپر چھت

غزالہ قمر اعجاز
(نوئیڈا)

برسات کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔امس بھری گرمی اپنے شباب پر تھی۔۔۔گھرے بادل آتے۔۔۔لوگ آس بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتے۔۔۔مگر پھر جلد ہی بادل چھٹ جاتے۔۔۔اور تیز دھوپ بکھر جاتی۔۔۔اور سب کو جھلسا کر رکھ دیتی۔۔۔کئی دنوں سے یہی کھیل ہو رہا تھا۔ایک دو بار ہلکی بوندا بادی ہی۔۔۔مگر وہ بھی ایسی کی زمیں بھی ٹھیک طرح سے نہی بھیگی۔

"اماں بارش کب ہوگی"

راجو نے کاپی کا بیکار صف؟ پھاڑ کر ناؤ بنائی اور زمیں پر چلانے لگا۔

" کیا پتہ "انوری نے آٹا گوندھتے ہوئے بیزاری سے کھا۔کتنی کوشش کی تھی دونوں میاں بیوی نے کی برسات سے پہلے چھت پکی ہو جائے۔۔۔مگر ممکن ہی نہی ہوا۔بڑی مشکلوں سے کچھ پیسے جمع بھی ہوئے مگر آچانک چھوٹی لڑکی کو دو مہنے تک بخار نے ایسا گھیرا کی ساری جمع پونجی ختم ہوگئی۔کتنے ٹسٹ کرائے تھے ڈاکٹر نے۔۔۔مگر کوئی بیماری نہیں نکلی۔

"لونڈیا ہے۔۔۔لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو جائیگی۔"بڑی نند نے کھا تھا۔

مگر اسکا دل نہی مانا۔۔۔اور ساری پونجی بکسے سے نکل کر ڈاکٹر کے کھاتے میں جمع ہوتی گئی۔اب تو برسات سر پر تھی۔دیواریں کچی تھیں۔۔۔مستری نے چھت ڈالنے اور فرش پر اینٹیں بچھانے کا چالس ہزار بتایا تھا۔۔۔وہ بھی پڑوسی ہونے کے ناطے اپنی مزدوری کاٹ کر۔۔۔مگر اتنے پیسوں کا انتظام ہو بھی تو کیسے اور کہاں سے۔دونوں میاں بیوی گھنٹوں سر جوڑ کر بیٹھے سوچتے رہتے۔

"اماں ہم ان گھروں میں کیوں نہی رہ سکتے۔۔بنا تو ابا ہی رہے ہیں"

دونوں کو سوچ میں گم دیکھ کر راجو نے معصومیت سے کہا۔

"ہم "انوری نے ہم کو لمبا کھیچا اور پھر سب ہنس پڑے۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں"

"نصیب کیا ہوتا ہے اماں"

راجو تو جیسے پیچھے ہی پڑ گیا۔

"چل کتاب نکال اور پڑھ"۔وہ جھنجھلاتے ہوئے اٹھ گئی۔راجو کا دماغ نصیب میں الجھ کر رہ گیا۔وہ کچھ زیادہ ہی غصہ کرنے لگی ہے۔۔۔پہلے ایسا نہیں تھا۔نجیب سے شادی کے بعد وہ بہت خوش تھی۔۔۔وہ شہر میں کام کرتا تھا۔۔۔اور اسکو پورا یقین تھا کی شادی کے بعد وہ بھی شہر آجائیگی اور میم بنکر رہے گی۔مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔۔۔دو سال تک وہ ساس کی نگرانی میں رہی۔پہلے پہل خاموشی سے گھر کا کام کرتی رہتی اور ساس کی باتوں کو سہتی رہی۔۔۔پھر بولنا شروع کیا۔۔۔اور دیکھتے ہی دیکھتے بات چیت لڑائی جھگڑے میں تبدیل ہوگئی۔نجیب علی کے ساتھ رہنے کی ضد رنگ لائی اور وہ روزمرہ کے ضروری سامان کے ساتھ شہر آگئی۔کچھ دن اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ رہی۔پھر اسکے پاس ہی ایک کمرہ لے لیا۔نجیب علی ہوٹل میں ملازم تھا محنتی انسان تھا انوری سلیقے مند تھی جلد ہی دونوں نے ایک پلاٹ لے لیا۔۔۔اور خود ہی محنت مزدوری کر کے ایک جھوپڑی ڈال کر رہنے لگے۔۔۔بچوں کے ساتھ بچت کرنا آسان نہیں تھا کسی طرح کچھ پیسہ جمع بھی کر لیتے تو کچھ نا کچھ خرچہ نکل آتا۔۔۔کبھی کوئی بیماری تو کبھی رشتے داری میں شادی۔کئی سال اسی طرح گزر گئے۔انکے گھر سے کچھ دور پر ہائی رایز بلڈنگ کا کام شروع ہوا۔نجیب علی کو اپنے تجربے کی بنیاد پر وہاں دیکھ ریکھ کرنے جیسا ذمہ داری کا کام مل گیا۔۔۔اور اسکے ساتھ ہی انوری نے بھی وہاں کام کرنا شروع کر دیا۔۔۔حالانکہ پہلے کبھی اسنے اتنی محنت والا کام نہی کیا تھا۔۔۔اسلئے تھک بھی جاتی۔۔۔مگر ہمت نا ہارتی۔۔۔گھر کی چھت پکی کرنیکی دھن سوار تھی۔۔۔بچوں کو اسکول بھیجنے کا ارمان تھا اور بڑھاپے میں سکھی جیون گزارنے کا سپنا آنکھوں میں بسا تھا۔بلڈنگ کا پہلا حصہ مکمل ہوا تو لوگ دھیرے دھیرے آنے لگے۔گھروں میں کام ملنے لگا۔انوری نے مزدوری چھوڑ کر گھر کا کام پکڑ لیا۔جو مزدوری کی بہ نسبت آسان تھا۔۔۔اور یہ بھی اسکی قسمت ہی تھی کی جہاں اسکو کام ملا وہ مالکن سوشل ورکر تھیں اور غریبوں کی باز آبادکاری کے کام سے جڑی تھیں۔لوگ انھیں میڈم کہکر بلاتے تھے۔انھوں نے انوری کے دونوں بچوں کا داخلہ کروا دیا اور کتابوں کے ساتھ ڈریس بھی مل گیا۔۔۔یہی تو اسکی تمنا تھی۔۔۔کیا پتہ ایک دن بچے پڑھ لکھ کر کچھ بن جائیں تو اسے بھی ایسے ہی گھر میں رہنا نصیب ہو جائے۔۔۔اونچی بلڈنگ کی بالکونی سے باہر دیکھو تو لگتا ہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔۔۔کیسا چمچماتا ہوا فلیٹ ہے۔۔۔فرش پر ذرا سا بھی داغ رہ جائے تو دوبارہ پونچھا مارو۔۔۔کیسے کیسے برتن اور سامان۔ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے،اس نے بجلی لگوالی تھی۔۔۔ایک پنکھا بھی لے لیا مگر اس پنکھے کی ہوا اسے کبھی نہیں لگی۔۔۔اگر چھت پکی ہوتی تو پنکھا وہاں لگ جاتا اور سبکو برابر کی ہوا لگتی۔۔۔مگر یہ پنکھا آٹے کے ڈبے پر رکھا گیا جسکے سامنے دونوں لڑکے سوتے پھر نجیب۔۔۔اسکے بعد ننھی عالیہ پھر وہ۔اس تک ہوا کبھی پہنچی ہی نہیں۔مگر جب سے راجو اور گڈو اسکول جانے لگے تھے اسکے خوابوں کو بھی جیسے پر لگ گئے تھے۔شام کو دونوں لڑکے بستہ نکل کر سبق یاد کرتے تو وہ انھیں دیکھکر دل ہی دل میں مسکراتی اور نظروں ہی نظروں میں انکو بڑا ہوتے دیکھتی۔گاؤں میں نا کچھ کام کاج تھا اور نا ہی کوئی سہولت۔۔۔یہاں پر ہر آسانی تھی۔۔۔بس کچھ پیسہ جمع ہو جائے تو چھت پکی کروالے۔اس پاس اونچے اونچے مکان بن رہے تھے سڑک بھی اونچی ہوگئی تھی۔۔۔تیز بارش میں پانی بھرنے کا خطرہ بھی تھا اور پھر کمزور دیواریں۔۔۔رات برات کوئی حادثہ ہو گیا تو۔۔۔اسکا دل دہل گیا۔۔۔تیز گرمی کی شدت کے باوجود وہ دل ہی دل میں بارش نا ہونے کی دعا

''چہارسُو''

کرتی رہی۔فلیٹ تیزی سے بنکر تیار ہورہے تھے۔صاف صفائی کا کام رات دیر تک چلتا۔شیشوں کی صفائی ٹائل اور باتھروم کو چمکانے کا کام زیادہ بھاری نہیں تھا اسلئے دونوں میاں بیوی بہت سے لوگوں کی طرح رات کی ڈیوٹی بھی کرنے لگے۔۔۔بس کسی طرح چھت پکی ہوجائے اور زمیں پر اینٹیں بچھ جائیں۔۔۔ورنہ برسات میں بچوں کی کتابیں بھیگ گئیں تو پڑھیں گے کیسے۔۔۔ایسے ہی راج مزدوری کرتے زندگی گزر جائیگی۔۔۔اس نے ساری طاقت فلیٹ چمکانے میں لگادی۔

"ایسے چکنے فرش پر چلس ے سے تو ہم گر ہی جائینگے."۔۔وہ نجیب سے کہ ہی رہی تھی کی سچ مچ پھسل گئی اسنے دوڑ کر اسے پکڑا۔

''نا بابا اینٹوں کا فرش ہی اچھا ہے اپنے لئے''اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ مگر ہونی کا کسے پتہ۔پیچھے کی بلڈنگ میں کام ہورہا تھا بارہویں منزل کی باہری دیوار پر پلاسٹر کا کام چل رہا تھا۔تین مزدوروں کے ساتھ نجیب علی بھی تھا اور کام کی نگرانی کررہا تھا۔پتہ نہیں کیا ہوا بالکونی کا پچھلا حصہ ٹوٹ گیا اور وہ چاروں دیکھتے ہی دیکھتے بارہویں منزل سے سیدھے پتھریلی زمیں پر ڈھیر ہوگئے۔دوپہر کا وقت تھا ہر طرف کام چل رہا تھا۔شور وغل سے ہڑ کمپ مچ گیا۔چاروں کو اسپتال پہنچایا گیا۔میڈم کے گھر وہ برتن دھورہی تھی جب انکے پاس کسی کا فون آیا تھا۔اسنے بھی سنا۔وہ مزدوروں کو انصاف دلانے کی بات کررہی تھیں۔''یا اللہ خیر''جلدی جلدی کام ختم کرکے وہ گھر کی طرف دوڑی۔اسکی گلی کے زیادہ تر لوگ یہیں کام کرتے تھے۔اسوقت وہاں کافی بھیڑ تھی۔''کہیں کوئی اس گلی کا تو نہیں''اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور تبھی اسکی پڑوسن جمیلہ نے اسے کس کر گلے سے لگالیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"کا۔۔۔کیا ہوا"۔

وہ علی بھائی نہیں رہے"

اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں۔پتہ نہی وہ کون سا وقت تھا جب سفید کفن میں لپٹا شوہر کا چہرہ اسے دکھایا گیا۔۔۔اور پھر وہ انھیں انکی خواہشوں امیدوں اور خوابوں کے بیچ تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ابھی تو وہ اس غم کو محسوس بھی نہی کرسکی تھی کی میڈیا والوں نے اسے گھر لیا اور اپنے کیمروں کے ساتھ ایک کے بعد ایک کرکے آنے لگے۔تخت پر بچوں کے ساتھ اسکو بٹھاتے اور طرح طرح کے سوال کرتے۔

''اب آپ کیا چاہتی ہیں''وہ اسے بولنے پر اکساتے اور بار بار یہ سوال دہراتے۔اب وہ ان سے کیا کہے۔وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہتی۔ٹی وی پر خبر آتے ہی آس پاس لوگوں کا تانتا لگ گیا۔کبھی پولیس والے آتے تو کبھی کوئی اور۔۔۔سب انصاف دلانے کی بات کرتے۔۔۔ٹی وی پر بھی بار بار یہی دہرایا جارہا تھا۔بلڈر کی خامیاں گنوائی جارہی تھیں اور اسے جیل بھیجنے کی بات ہورہی تھی۔میڈم سوسائیٹی والوں کے ساتھ ملکر دھرنے کا پروگرام بنارہی تھیں۔۔۔اور جب تک انصاف نا ملے کام بند رکھنے کی مانگ کررہی تھیں۔ مزدور اس بات پر راضی نہیں تھے۔۔۔کام بند ہوگیا تو انکا گھر کیسے چلے گا۔۔۔یہ بڑا سوال تھا اور اس سے جڑے انگنت سوال سامنے تھے۔اس دن میڈم کے ساتھ کئی لوگ بھی آئے تھے۔سب نے اسکی مدد کا وعدہ کیا اسے تسلی دی۔''ہر طرح سے تمھاری مدد ہوگی۔چاروں مزدوروں کو انصاف ملے گا"۔اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے یقین دلایا۔دھیرے دھیرے سب چلے گئے۔وہ لیٹی ہی تھی کی دروازے کی کنڈی بجی۔۔۔اب کون آیا وہ اٹھی۔شکل نئی تھی۔۔۔پتہ نہیں کون ہیں۔ٹی وی سے آئے ہیں کی سرکار نے بھیجا ہے۔وہ کچھ سمجھ نہی پارہی تھی اور بچوں کے ساتھ کونے میں کھڑی رہی۔وہ لوگ اندر آئے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولے۔

"برسات آنے والی ہے۔۔۔چھت کچی ہے"۔

"جی صاحب"

"باہر چاروں طرف گڈھا ہے سڑک بھی اونچی ہے۔پانی بھر گیا تو یہاں سے نکلنا مشکل ہوجائیگا۔"

پتہ نہی وہ کون تھا۔۔۔وہ کیا کہے۔۔۔اسکے دل کی ہر بات وہ اپنی زبان سے کہہ رہا تھا۔کچھ پیسے اکھٹا کئے ہیں۔۔۔اب تو کمانے والا ہی نہی رہا۔۔۔تو وہ سب کھانے میں چلا جائیگا۔آگے کا پتہ نہی. وہ خاموش رہی۔

" کل سے تمھارے گھر کا کام شروع ہوجائیگا۔پکی چھت۔۔۔پکا آنگن ۔۔۔سب بن جائیگا۔بجلی کے ساتھ پانی کا موٹر بھی لگے گا۔اسکے علاوہ تینوں بچوں کے نام بیس ک میں الگ سے پیسہ اور دو لاکھ روپیہ تمھارے لئے"

اس نے حیرانی سے سبکو دیکھا۔۔۔وہ کچھ لمحے خاموش رہے پھر اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس کچھ دنوں کے لئے تمہلوگوں کو کہیں اور رہنا ہوگا۔۔۔اسکا انتظام ہم کردیں گے۔گھر بنتے ہی ادھر آجانا۔پوری رات ہے سوچنے کے لئے۔صبح ہم پھر آئیں گے۔جانے والا لوٹ کر نہی آتا۔انصاف لیکر کیا کروگی تم۔۔۔اسے کھاؤ گی یا پھر اس سے گھر بناؤ گی۔۔۔ان بچوں کا کیا ہوگا یہ سوچو۔"

بچوں کے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے وہ چلے گئے۔انوری سکتے کے عالم میں کھڑی سوچ رہی تھی کی پتہ نہیں یہ فرشتہ صفت انسان کون تھے کہاں سے آئے تھے۔اس نے تو پوچھا ہی نہیں۔تبھی راجو نے اسے جھنجوڑا۔

"اماں انصاف کیا ہوتا ہے۔اس سے کیا ہوگا۔"

یہ تو اسے بھی نہی معلوم تھا۔چھت زمین آنگن خالی ڈبے سب اسکی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔وہ کیا بتائے۔

اماں پکی چھت بن جائیگی تو پھر اسکے اوپر ایک اور چھت۔۔۔پھر اسکے اوپر چھت ۔۔۔پھر اسکے اوپر۔۔۔خوب اونچی۔بچوں کی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن ہوگئے۔

چھت کے اوپر چھت۔۔۔اسکے اوپر چھت اور اوپر۔۔۔بالکل اس بلڈنگ کی طرح جہاں وہ دونوں دن رات کام کرتے تھے۔۔۔ایک پکی چھت کا سپنا آنکھوں میں بسائے۔اور اب۔۔۔وہ سپنا ایک حقیقت بنکر سامنے کھڑا تھا۔۔۔وہ سب اچانک اونچائی بہت اونچائی پر پہونچ گئے تھے۔۔۔جہاں سے زمین بہت دور نظر آرہی تھی۔ہاتھ پھیلائے وہ چاروں ہوا میں اڑنے لگے۔

ناک پر بیٹھی بیٹی

اشتیاق سعید
(ڈسٹرکٹ تھانے)

کیولہ دیوی کے پاؤں بھاری تھے۔ وہ پورے دنوں سے تھی، بس جان لو کہ معاملہ بالکل اب تب کا تھا۔ کیولہ پہلوٹھی کی اولاد بیٹی چاہتی تھی جبکہ اُس کا شوہر رام دین من میں بیٹے کی تمنّا لیے بیٹھا تھا۔ اس بات کو لے کر اکثر دونوں میاں بیوی میں کھٹی میٹھی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی ناشتے کی میز پر دونوں کے درمیان بحث کا سلسلہ دراز ہو گیا تھا اور دورانِ بحث رام دین کیولہ سے پوچھ بیٹھا تھا کہ آخر اُسے بیٹی ہی کیوں چاہیے؟ کیولہ بجائے اس سوال کا جواب دینے کے اُلٹے رام دین ہی سے پوچھ بیٹھی تھی۔ ''پہلے آپ بتائیے کہ آپ کو بیٹی سے بیر کیوں ہے؟ کیولہ کے اس سوال پر رام دین چوبڑ ہو گیا''۔

''ارے بھاگیہ وان، میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے بیٹی سے بیر ہے، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اپنے پیار کا پہلا تحفہ تم مجھے بیٹا دو''۔

''یہی خواہش تو میری بھی ہے کہ ایشور مجھے پہلوٹھی کی اولاد بیٹی ہی دیں''۔

''لیکن کیوں؟؟''

''کیونکہ بیٹی لکشمی کا روپ ہوتی ہے، جس کے آگمن سے گھر جگمگ جگمگ کر اُٹھتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی جاتی ہے اور اُس کا وِویک جاگرت ہونے لگتا ہے تو وہ اپنا سارا دھیان ماں باپ پر لگا دیتی ہے، اُن کی چنتا سے چنتت ہوتی ہے اور اُن کے دُکھ کو اپنا دُکھ بنا لیتی ہے، یہی نہیں بلکہ اس دُکھ کے نِوارن کی اُپائے میں کھانا پینا تک تج دیتی ہے''۔ کیولہ رام دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرفر ایسے بولتی گئی جیسے یہ جملے اُسے ازبر ہوں۔

''اور بیٹا؟؟''۔ رام دین کیولہ کی جانب چبھتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''بیٹا پنچھی کی بھانتی ہوتا ہے، جب تک پنکھ نہیں نکلتے تب تک ماں باپ کے آسرے رہتا ہے، پنکھ نکلتے ہی آسمانوں میں اُڑنے لگتا ہے، پھر یوں ہی اُڑتے اُڑتے ایک دِن پھرّ ہو جاتا ہے''۔

''چلو مان لیا کہ بیٹا پنکھ نکلتے ہی یعنی جوان ہونے پر پھُرّ ہو جاتا ہے، لیکن وہ اکیلے تو پھُرّ نہیں ہوتا بلکہ اُس کے ساتھ کسی نہ کسی گھر کی لکشمی جی بھی پنچھی کا روپ دھار کر پھُرّ ہوتی ہیں۔۔۔ اور یہ جان لو، بیٹے کے پھُرّ ہونے سے گھر پر یوار پر کسی پرکار کی آنچ نہیں آتی مگر بیٹی کے پھُرّ ہوتے ہی بدنامی کی کٹار پہلے ماں باپ کی ہی ناک پر گرتی ہے۔ پھر سماج، پریوار پر تھوتھو کرتا ہے''۔

''اچھا!! تو آپ اسی کارن بیٹی نہیں چاہتے؟'' کیولہ رام دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر متعجب لہجہ میں استفسار کی۔

''دیکھو بھاگیہ وان، چہرے کی شوبھا ناک ہی سے ہے۔۔۔'' وہ ابھی کچھ اور کہتا اس سے پہلے ہی کیولہ بول پڑی۔

''اگر یہی وِچار آپ کے نانا جی کے بھی ہوتے تو آپ کی ماتا جی کا اس سنسار میں آگمن نہ ہوتا، جب آپ کی ماتا جی ہی نہ آتیں تو آپ کی اُتپتی کہاں سے ہوتی؟''۔

''سچ! اگر میری اُتپتی نہ ہوتی تو تم کنواری ہی رہ جاتیں''۔ رام دین ٹی پاٹ سے چائے کپ میں اُنڈیلتے ہوئے مزاحیہ لہجے میں بولا۔

''کنواری رہتی یا نہ رہتی یہ تو بعد کی بات ہے، پہلے اس پر غور کرو کہ اگر میرے پِتا بھی آپ کی وچار دھارا کے ہوتے تو۔۔۔؟

''تو۔۔۔ تو۔۔ تو میں ہی بیچارا کنوارا رہ جاتا'' کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

دونوں میاں بیوی میں اس قبیل کی بحثیں اکثر ہوا کرتیں۔ کبھی کبھی تو یہ بحث بڑھتے بڑھتے تُو تُو مَیں مَیں تک پہنچ جاتی، دونوں میں روٹھا روٹھی نیز آپس میں بول چال بند ہو جاتی اور وہ ایک ہی گھر میں، ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی اجنبی سے ہو جاتے یا یوں معلوم ہوتا گویا دونوں نے مون برت رکھ لیا ہو، اگر دونوں میں سے کسی کو کوئی اہم یا ضروری بات کرنی ہوتی تو ماں کے توسط سے ہوتی، یعنی ماں دونوں کے درمیان ثالث بن جاتی۔۔۔ آئے دن کی بم چخ سے تنگ آ کر ایک روز ماں نے دونوں کو پاس بیٹھا کے سمجھایا کہ من موافق بیٹا یا بیٹی پیدا کرنا ہم عورتوں کے بس میں نہیں، اولاد کا اختیار تو ایشور کے ہاتھ ہے، اُس کے آگے کس کا کون بس! وہ چاہے جو دے، بیٹی یا بیٹا! ہمیں چاہئے کہ خوش دلی سے اُسے قبول کر لیں اور اُس کا شُکر ادا کریں۔ ماں کی نصیحت پر دونوں نے لبیک کہا اور اپنی اپنی خواہشات کی گٹھری ایشور کو سونپ کر مطمئن ہو گئے۔

اس بات کو ہوئے ابھی دس ہی روز گزرے تھے کہ اچانک کیولہ کو دردِ زہ اُٹھا، آناً فاناً میں دھنوتی دائی بُلوائی گئی۔ آدھ پون گھنٹہ بعد خوشخبری آئی کہ رام دین باپ بن گیا، چاند سا بیٹا ہوا ہے۔ یہ سُن کر رام دین کا سینہ مارے خوشی کے گز بھر کا ہو گیا اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے قدم دھرتی پر نہیں چاند پر ہوں اور وہاں سے وہ ایشور کا شُکر ادا کر رہا ہو کہ اُس نے اُسے بیٹا دے کر اُس کی خواہش کی تکمیل ہی نہیں کی بلکہ اُسے کیولہ کی خواہش پر فتح بھی دے دی۔

پھر کیا تھا، آن کی آن سارے میں رام دین کے یہاں بیٹے کے جنم کی خبر پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازے پہ پرجاؤں یعنی نائی، دھوبی، کہار، مالی، تیلی، تنبولی، گُرمی، پاسی اور نٹوں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔ نٹ بدھائی گانے لگے۔ گھر کے بھیتر محلے کی عورتیں جُٹ کر سوہر گا رہی تھیں۔ پھر رام دین کی ماتا جی دادی بننے کی خوشی میں ایک ایک پرجا کو نیگ کے طور پر سوپ بھر چاول اور اکیاون روپے نقد دے رہی تھیں۔ غرض کہ گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔ ہر کوئی خوش تھا سوائے کیولہ کے، وہ زچہ خانے میں تنہا پڑی سوچ رہی تھی۔ ''بیٹی ہوتی تو کیا سب اتنا ہی خوش ہوتے؟''۔

اس کے بعد کیولہ جب بھی حاملہ ہوتی رام دین کو بیٹی کا خوف ستانے لگتا، اُسے رہ رہ کے یوں محسوس ہوتا جیسے کیولہ کی کوکھ میں پل رہی بیٹی چپکے سے

اُس کی ناک پر آبیٹھی ہو اور آہستہ آہستہ ناک کُتر رہی ہو۔ وہ ایک انجانے خوف سے کانپ اُٹھتا۔ بہرحال! کیولہ کے دو حمل ضائع ہونے کے باوجود رام دین کے یہاں تلے اوپر تین بیٹے ہوئے۔ ہر بار وہ پھولے نہ سماتا تھا کہ ایشور نے اُسے بیٹی کے بھوگ سے قدرے محفوظ رکھا۔ جبکہ کیولہ ہر بار بیٹی کی اُمید رکھتی لیکن بیٹے کی ولادت پر اپنی اس اُمید اور خواہش کا گلا گھونٹ دیتی یا من مسوس کر رہ جاتی اور سوچتی بیٹی نہیں بیٹے ہی سہی، یہ بھی تو اُسی کی کوکھ کے جنمے اور اسی کے جگر گوشے ہیں، ہر چند اُس کی ممتا اُبل پڑتی اور وہ پورے جی جان سے بچّوں کی پرورش میں جُٹ جاتی، پل پل اُنہیں اپنی نگاہوں کے حِصار میں رکھتی۔ خیر! بیٹے باپ کی آنکھوں کے تارے تو تھے ہی لہٰذا وہ بھی کسی قسم کی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے سے لے کر پڑھائی لکھائی تک ہر بات کا خیال رکھتا۔

پہلوٹھی کا بیٹا راجیش ابتدائی تعلیم میں تو ٹھیک ٹھاک تھا لیکن ثانوی تعلیم میں پھسڈّی ثابت ہونے لگا، پھر کسی طرح گِرتے پڑتے انٹرمیڈیٹ تک پہنچا اور تعلیم کا سلسلہ یکسر موقوف کر کے باپ کے کاروبار میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس کے اس عمل سے باپ کو قدرے راحت میسّر آنے لگی لہٰذا وہ آہستہ آہستہ کاروبار کی جانب سے لاپروا ہونے لگا۔ حالانکہ اُس کی اس کوتاہی پر کیولہ اُسے اکثر ٹوکتی بھی کہ ابھی سے بیٹے پر اتنا اعتماد مناسب نہیں، ابھی وہ ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہے، اُسے آپ کے سہیوگ کی ضرورت ہے۔ اس پر وہ ہنس کر کہتا۔

''ارے بھاگیہ وان، وہ بیٹا ہے بیٹا! وہ بھی میرا بیٹا، اسے کسی تجربہ اور سہیوگ کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں! اگر بیٹی ہوتی تو اُسے قدم قدم پر سہیوگ اور سہارے کی ضرورت پڑتی بلکہ سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہنا پڑتا وہ بھی اس بھئے کے ساتھ کہ نہ جانے کون سا پل ہماری ناک کا دشمن بن جائے''۔

''آپ کو تو بس لے دے کے اپنی ناک کی پڑی رہتی ہے، یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بیٹی صرف بیٹی ہی نہیں ماں باپ کا ابھیمان بھی ہوتی ہے اور۔۔۔''

''بس بھاگیہ وان بس!'' آگے وہ کچھ اور کہتی اس سے پہلے ہی رام دین بول پڑا۔ ''میں سمجھ گیا، تمھارے بھیتر بیٹی کی منو کامنا اب بھی سانسیں لے رہی ہے، ویسے بہو بھی بیٹی ہی کا روپ ہے، ہم راجیش کا بیاہ کر دیتے ہیں، گھر میں چاندسی بہو آجائے گی، پھر تم جی بھر کے اپنا بیٹی والا ارمان پورا کر لینا''۔

یہ سُن کر کیولہ خوشی سے کِھل اُٹھی اور رام دین کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈال اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھی۔ ''سچ!''۔

رام دین بھی اُس کے گال کو چٹکی سے پکڑتے ہوئے شرارتی لہجے میں بولا۔ ''مُچ!'' اور دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔

پھر تو پورے جوش و خروش کے ساتھ راجیش کے لیے دُلہن کی تلاش جاری ہو گئی، کئی لڑکیاں دیکھی گئیں اور مسترد ہوئیں جن میں کسی کا رنگ پھیکا ہوتا تو کسی کا ناک نقشہ، کسی کا چہرہ لمبوترا ہوتا تو کوئی اختی گھوڑی لگتی غرض یہ کہ بہتیری لڑکیاں ماں بیٹے دونوں کی پسند کے فریم سے باہر ہو گئیں، ایک آدھ پسند آئی بھی تو کیولہ کو وہ بیٹی نہیں سراپا بہو معلوم ہوئی۔ تلاشِ بسیار کے بعد راگنی بہ یک وقت ماں بیٹے دونوں کو پہلی ہی نظر میں بھا گئی۔ چونکہ وہ محض حسین ہی نہیں بلا کی ذہین بھی تھی، آج کے جدید دور میں جہاں دوسری لڑکیاں ہمہ وقت چہرے پر میک اَپ کے نام پر فاؤنڈیشن، کریم، روز اور طرح طرح کے کاسمٹکس تھوپے رکھتی ہیں علاوہ ازیں پلکیں، آنکھیں، ہونٹ اور ناخنوں تک کو سنوارنے سے نہیں چوکتیں، وہیں راگنی اس خُرافات سے قطعی مبرّا سادگی و پُرکاری کا پیکر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں قدرتی طور پر ہی کجراری تھیں، ہونٹ سُرخ اور رسیلے تھے اور رُخسار کشمیری سیب کو مات دیتے تھے۔ خیر! کیولہ نے راگنی سے چند رسمی سوالات کئے جو ظاہر ہے اُس کی تعلیم اور اُمورِ خانہ داری کے تجربات کے تعلق ہی سے رہے ہوں گے۔ راگنی نے خوش دلی سے جواب دیے۔ کیولہ اُس کے جواب سے خوش ہو کر اُس کی بلائیں لی، پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے گلے میں پڑی سونے کی چین جس میں ہیرا جڑا لاکٹ آویزاں تھا نکال کر راگنی کے گلے میں ڈالتی ہوئی بولی۔

''میرے کُل تین بیٹے ہیں، بیٹی نہیں ہے، میں ہمیشہ بیٹی کو ترستی رہی ہوں، اس لیے میں تمھیں سدا بیٹی ہی کا مان سمّان دوں گی، باقی تم پر ہے کہ تم مجھے ماں کا درجہ دو یا ساس کا''۔

''ماں جی! ساس بھی تو ماں ہی ہوتی ہیں، ویسے بھی پرمیشور نے بیٹیوں کو دو ماؤں کا وردان دے رکھا ہے، ایک جنم کی دوسری کرم کی''۔ راگنی گلے میں پڑے ہار کا جائزہ لیتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ راگنی کے مُنہ سے یہ بات سُن کر کیولہ کا جی گدگد ہو گیا۔

پھر کیا تھا، بات چیت آگے بڑھی، منگنی سگائی، تِلک بریکشا کی ابتدائی رسمیں ادا کی گئیں، پنڈت الوپی ناتھ نے پترا بانچ کر لگن کا شُبھ مہورت نکالا اسی حساب سے دِن تاریخ مقرر کیا گیا اور راجیش کا بیاہ خوب دھوم دھام سے انجام پذیر ہوا، رام دین نے کسی قسم کی کسر نہ رکھ چھوڑی، آرائش زیبائش، باجا گاجا، ناچ رنگ، گاڑی گھوڑا سب اعلیٰ معیار کا تھا۔ سمدھی نے بھی برات سے کہیں زیادہ براتیوں کے استقبال کا انتظام و انصرام کر رکھا تھا۔ جنواسے ہی میں کھانے پینے کے پچاسوں اِسٹالس لگوا دیے تھے۔ جہاں چائے کافی، دودھ لسّی، تازہ پھلوں کے رس، طرح طرح کے شربت، ٹھنڈے مشروبات، مٹھائیاں، پکوڑے اور سموسے، چھولا چاٹ، گول گپّے، چائنیز نوڈلز، پان، بیڑی، سگریٹ، گُٹکا کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں تھیں۔ براتیوں نے ان سے خوب لُطف اُٹھایا۔ اُدھر راگنی اور راجیش اگنی کے گِرد سات پھیرے لے کر ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ پھر راگنی بابل کا گھر چھوڑ پی کے نگر آ گئی۔ کیولہ اُسے دُلہن کے روپ میں دیکھ دیکھ پھولے نہ سماتی تھی اور سارے میں اِتراتی، اِٹھلاتی یہ کہتے پھرتی تھی کہ اُس کے گھر ساکچھات لکشمی کا باس ہوا ہے۔

بیاہ کے چوتھے روز دولھا دُلہن ہنی مون کے لیے نینی تال چلے گئے۔ گھر جیسے ایکدم سُونا ہو گیا، راگنی کی غیر موجودگی میں کیولہ کو ایک ایک دِن کاٹنا محال ہو رہا تھا۔ حالانکہ اِن کا ہنی مون ٹور محض ہفتہ بھر کا تھا، لیکن ایک ایک دن اُسے ہفتہ کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ غضب تو تب ہوا جب ہفتہ گُزر گیا اور بیٹا بہو نہیں

باقی صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ کیجیے

قربانی آن لائن

رومانہ رومی
(کراچی)

گھر میں صبح سے افراتفری کا عالم تھا ہر کوئی ابّا جان کے ڈر سے جلدی جلدی تیار ہو کر مسجد جانے کی تیاری میں مصروف تھا گھر کی عورتیں نماز کے لیے ساتھ جانے والے بچوں کو تیار کر رہی تھیں رات میں استری کر کے رکھے ہوئے کپڑوں جوتوں اور جائے نماز کے بعد بھی ہر کوئی بھاگم ڈور میں لگا ہوا تھا۔۔۔امّاں جی صحن میں رکھے تخت پر فجر کی نماز کے بعد ہی نئی سفید چادر اور گاؤ تکیوں پر ہاتھ کی نقیس کڑھائی کئے ہوئے غلاف چڑھا کر سکون سے ٹیک لگائے بیٹھی مسلسل بہوؤں کو ہدایت نامہ جاری کرنے میں مصروف تھیں۔۔۔سب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ابّا جان کے کمرے سے باہر آنے تک اُن سب کو مکمل تیار ہو جانا ہے کیوں کہ وہ اس کے بعد کسی کو بھی ایک لمحہ کا وقت دینے کو تیار نہ ہوتے تھے اور اکیلے ہی عیدگاہ کی طرف روانہ ہو جاتے تھے اور ایسی صورتِ حال کے بعد اُن کو منانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔۔۔سو یہ ہنگامہ اُن کے کمرے سے باہر آتے ہی رک گیا اور سب ایک صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ وبا کی صورتِ حال کے پیشِ نظر چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک نے ہاتھوں میں دستانے اور چہروں پر ماسک لگایا ہوا تھا۔۔۔ابّا جی نے سب پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے عیدگاہ کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔۔۔

وہ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے اگرچہ یہاں آ تو گئے تھے مگر اُن کا خاندانی وقار اور تہذیبی رکھ رکھاؤ پر آج تک انہوں نے آنچ نہ آنے دی تھی وہ اب بھی اپنی لکھنوی تہذیب پر فخر کرتے تھے اور آج بھی اُن کے گھر میں یہی تہذیب اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ موجود تھی۔۔۔چھوٹے سے بڑوں تک کا پہناوا ہو یا آدابِ گفتگو، رسم ورواج ہو یا زبان و پکوان، گھر کی آرائش ہو یا کھانے پینے کے انداز سب کے سب ابھی تک ویسی ہی آن بان کے ساتھ موجود تھے لوگ اُن کے گھرانے کو ابھی بھی اصلی لکھنوی تہذیب کا گہوارہ مانتے تھے۔۔۔

عیدگاہ کی طرف سب کو روانہ کرتے ہی بڑی بی نے بہوؤں کو دوسرے کاموں کے لیے ہدایت جاری کی جس میں بڑی بہو کو کلیجی کے لیے مصالحہ تیار کرنے کی ذمہ داری لگائی گئی کیوں کہ عید کے دن ابّا جان اس وقت تک حلق سے پانی بھی نیچے نہ اتارتے جب تک بھونی ہوئی مصالحے دار خوش رنگ وخوش ذائقہ کلیجی ان کو نہ پیش کی جائے۔۔۔ویسے تو آج تک ہمیشہ قربانی کا جانور باقاعدہ ایک ماہ پہلے ہی گھر آ جاتا تھا اور پھر پورا گھر مل کر اُس جانور کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا تھا کہ بقول ابّا جی قربانی کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے سب سے پہلے اُس چیز سے آپ کی دلی الفت کا ہونا لازمی ہے اور اکثر ایسا ہوتا کہ قربانی کے وقت بچے ہی کیا بڑوں کی آنکھوں میں بھی اپنے لاڈ سے پالے ہوئے جانور پر چھری پھیرتے دیکھ کر آنسو آ جاتے۔۔۔تو ابّا جی کہتے یہی تو قربانی کی اصل روح ہے کہ اللہ کی راہ میں وہ چیز قربان کرو جس سے تمھیں لگاؤ ہو جائے۔۔۔مگر اس بار معاملہ ذرا مختلف تھا وبا نے اچھے اچھوں کے خیالات بدل ڈالے تھے۔۔۔کیوں کہ ابّا جی کو بھی دمے کا عارضہ لاحق تھا اس لیے بڑی بہو نے مشورہ دیا کہ اس سال قربانی کا جانور لانے کی بجائے ہم آن لائن جانور بک کروا لیتے ہیں جو وہ خود عید کے دن قربانی کر کے اور گوشت بنوا کر ہمیں گھر بیٹھے سکون سے پہنچا دیں گے۔۔۔اور چوں کہ اس بار شہر میں اس وبا کی وجہ سے تقریباً سب ہی اس طرح کا پلان کر رہے ہیں اور یہ کام شہر میں موجود بڑے بڑے فوڈ چین انجام دے رہے ہیں تو اس میں بے ایمان کا کوئی امکان بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔اس تجویز پر پورے گھر کی رضامندی کے بعد فیصلہ ہوا کہ بہو بیگم درست کہہ رہی ہیں گو کے ابّا جی ابھی بھی اس کے حق میں نہ تھے کہ اپنے آنگن میں قربانی کے ہونے کی رونق ہی الگ ہوتی ہے مگر گھر والوں کی ضد اور وبائی صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے حامی بھر لی مگر یہ شرط بھی ساتھ رکھی گئی کہ قربانی کا گوشت صبح ۱۰ بجے کے اندر اندر ان کے گھر پہنچا دیا جائے تا کہ وہ اپنی روایت کے حساب سے کلیجی کے ساتھ اپنے عید کے دن کا روایتی ناشتہ کر سکیں۔۔۔بیٹوں نے بھی اس بات کا خاص خیال رکھا اور آن لائن بکنگ کرواتے ہوئے صرف اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ چارجز زیادہ ادا کئے کہ کہیں ابّا جی ناراض نا ہو جائیں۔۔۔

نماز سے واپس آنے کے بعد بہوؤں نے سب کو شیر خورمہ دیا ساتھ ہی بچے ناشتے کے لیے مچلنے لگے ساس کے اشارے پر بچوں کو ناشتہ کروا دیا گیا مگر ابّا جی تو پانی بھی پینے کے روادار نہ تھے۔۔۔ابھی گھڑی صرف صبح کے نو بجا رہی تھی۔۔۔وبا کے باعث گھر میں کوئی مہمان تو نہیں آیا تھا مگر ٹیلی فون اور موبائل پر مسلسل عید کی مبارک باد اور قربانی میں ان کا حصہ محفوظ رکھنے کے لیے کال پر کال آ رہی تھیں۔۔۔گرمی کی شدت کے باعث ابّا جی کمرے میں دوبارہ آرام کرنے جا چکے تھے اور باقی سب گوشت کے انتظار میں دروازے کو پُر اُمید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔۔۔گلی میں جانوروں کی قربانی اور قصائیوں کے چیخنے چلّانے کی آوازوں نے گھر کے ماحول کو اور زیادہ ویران کر دیا تھا کہ بعض لوگوں نے حالات کی خراب صورتِ حال کے بعد بھی جانور اپنے گھروں کے سامنے ہی لا کر ذبح کئے تھے۔۔۔بڑی بہو پچھلے دس سالوں سے اس گھر میں بیاہ کر آنے کے بعد ہر سال عیدِ قرباں پر یہ سارا شور و ہنگامہ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرتی آئیں تھی مگر اس بار اپنے بچوں کی جان اور پورے گھر والوں کی حفاظت کے پیشِ نظر اُس نے اپنے میاں کو بھی جانور لانے سے منع کیا اور سمجھایا تھا۔۔۔مگر اب گھڑی کی سوئیاں دس بجے سے آگے بڑھ چکی تھیں۔۔۔

ویسے دس پندرہ منٹ کی دیر سویر ہونا اتنے بڑے شہر میں اور وہ بھی عید کے دن کوئی خاص بات نہ تھی۔۔۔ ہر چیز کی تیاری مکمل تھی بس گوشت آنے کے ساتھ ہی کام شروع ہو جانا تھا۔۔۔ گوشت کے حصہ بنانے والے اور دیگر دوسرے کام سمیٹنے والے سب کے لیے ابّا جان نے الگ سے لباس، دستانوں اور ماسک کا پورا ڈبہ لا کر رکھا دیا تھا تا کہ کوئی بے احتیاطی نہ ہو۔۔۔ کیوں کہ یہ سارا انتظام حفاظت کے پیشِ نظر ہی تو کیا گیا تھا۔۔۔ مگر گھڑی کی سوئیاں نجانے کیوں آج بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔۔۔ گیارہ بجنے پر ابّا جان کمرے سے باہر آئے اور سوالیہ نظروں سے بیٹوں کی جانب دیکھا آج عید کے دن پہلی بار گھر میں شور و ہنگامے کی جگہ سوگ اور خاموشی کا راج تھا۔۔۔ بڑا بیٹا بار بار اس فرنچائز پر فون کر رہا تھا جہاں اُس نے پوری گائے کی بکنگ کروائی تھی مگر آج اس نمبر پر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔۔۔ ابّا کی شکل دیکھتے ہی اُس نے دوبارہ کال لگائی۔۔۔ قسمت کی خرابی تھی کہ کال لگی تو اُس کا ہاتھ بے دھیانی میں اسپیکر پر جا لگا اور سامنے والے کی جھنجلاہٹ بھری آواز پورے گھر میں گونج اُٹھی۔۔۔

''جی فرمائے! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں''۔۔۔ بڑے بیٹے نے کال لگ جانے پر دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا اور بولا ''جی ہم نے گائے کی قربانی کا آڈر دیا تھا جس کا گوشت آج کے دن آپ لوگوں نے صبح دس بجے ہمارے گھر پہنچانا تھا مگر اب دن کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں ہمارا گوشت ابھی تک نہیں پہنچا''۔۔۔ سامنے والے نے پرچی نمبر پوچھا اور ایک منٹ کے وقفہ کے بعد بولا ''جی گوشت نکل چکا ہے گاڑی راستے میں ہے بس آتی ہوگی۔۔۔ جناب عید کا دن ہے دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے آپ ذرا انتظار کر لیں''۔۔۔ ابّا جی یہ گفتگو سن کر خاموشی سے دوبارہ کمرے میں جا لیٹے اور پھر بارہ سے ایک، ایک سے دو اور دو سے چار بج گئے مگر نہ کوئی گاڑی آئی اور نہ ہی گوشت۔۔۔۔ بچوں نے ابّا جی سے بہت ضد کی کہ وہ ناشتہ کر لیں مگر ان کی نہ، ہاں میں نہ بدلی۔۔۔ چھوٹے بیٹے نے فرنچائز پر بھی کئی بار چکر لگائے مگر وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔۔۔ رشتے داروں اور محلے والوں نے بھی پوچھ پوچھ کر سب کا حال برا کر دیا۔۔۔ آج زندگی میں پہلی بار اللہ کی راہ میں قربانی سے محروم رہ جانے پر شدید غصے اور بے عزتی کے احساس کے ساتھ ابّا جی کی طبعیت بگڑتی چلی گئی۔۔۔ گھر میں موت کا سناٹا تھا۔۔۔ بڑی بہو کمرے میں بیٹھی روئے چلی جا رہی تھی۔۔۔ امّاں جی شوہر کو منانے کی کوشش میں مصروف تھی۔۔۔ پورا دن گزر چکا تھا مگر گوشت کا کوئی پتا نہ تھا۔۔۔ ابّا جی نے صدمے کو دِل سے لگا لیا آج تک اُن کے گھر کی اس روایت پر کبھی کوئی سمجھوتا نہ کرنے والے ابّا جی اپنی اس خاندانی آن بان کو یوں مسمار ہوتے دیکھ کر صدمے سے بے ہوش ہو چکے تھے۔۔۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باجود اس صدمے نے ان کی جان لے لی۔۔۔

عید کے چھٹے روز بڑے بیٹے کے موبائل پر فرنچائز والوں کا میسج آیا'' ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو وقت پر آڈر نہیں پہنچا سکیں، برائے مہربانی آپ ہم سے اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں۔۔۔ ہمیں اُمید ہے کہ انشاء اللہ اگلے سال ہم اپنی سروس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔۔۔ ہم آپ سب کے تعاون کے بے حد شکر گزار ہیں۔''

بقیہ : ناک پر بیٹھی مکھی

لوٹے۔ رام دین یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ممکن ہے انہوں نے سات دنوں والے پیکیج کی مدّت دو ایک دِن بڑھوالی ہو۔ جبکہ کیولہ کسی انہونی کے خوف میں مبتلا دِن رات ان کی سلامتی کی دعائیں کرتی رہتی تھی اور بار بار شوہر سے اصرار کرتی کہ وہ بیٹے کے موبائل پر رابطہ کر کے معلوم کرے کہ اُسے لوٹنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ وہ بجائے رابطہ کرنے کہ کیولہ کو یہ کہہ کر خاموش کر دیتا کہ ''بیٹا اور بہو یکسوئی ہی کی خاطر گھر سے دور گئے ہیں، ایسے میں اُنہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں، جوان بچے ہیں موج مستی میں دِن گزرنے کا احساس نہیں رہتا، دو ایک روز میں آ ہی جائیں گے''۔

جب وہ دونوں پندھرویں دن بھی گھر نہ لوٹے تو رام دین کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے فوراً بیٹے کے موبائل پر کال کیا۔ موبائل سوچڈ آف تھا۔ پھر بہو کے موبائل پر رابطہ کرنا چاہا تو گھنٹی مسلسل بجتی رہی کال ریسیو نہیں کیا گیا۔ وہ بار بار یہ عمل دہراتا رہا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! کیولہ نے سمدھیانے جا کر پتہ لگانے کا مشورہ دیا۔ رام دین کو اُس کا مشورہ مناسب لگا اور وہ فوراً سمدھیانے جانے کے لیے نکل پڑا۔

شام کو جب وہ سمدھیانے سے لوٹا تو اُس کے چہرے پر ایک انجانی سی تکان چھائی ہوئی تھی اور قدم بے جان سے تھے۔ کیولہ دروازے پر ہی بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی تھی، اُسے دیکھتے ہی لپک کر قریب گئی اور قدرے لگاوٹ سے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا۔۔۔ کچھ پتہ چلا؟''

وہ اثبات میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے پژمردہ لہجہ بولا۔ ''ہاں!''

''کیا پتہ چلا؟'' کیولہ سراپا سوال بن گئی۔

''یہی کہ بیٹیوں ہی سے نہیں، بیٹوں سے بھی ناک کٹتی ہے''۔ کہتے ہوئے رام دین چکرا کر وہیں گر پڑا۔

قربِ قیامت

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

''جنٹلمین....! آپ لوگ' بہتر طور پر جانتے ہیں کہ آج! اتنی بڑی تعداد میں' ہمارا یہاں جمع ہونا' مقدس مِشن کی تکمیل اور اُس کی منصوبہ بندی کو آخری شکل دینے کے لئے ہے.... آپ کے علم میں ہے کہ ہم نے اور ہمارے آباء نے اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ' بڑے تحمّل' صبر' بردباری' مہارت اور دانشمندی سے لڑی ہے.... ہم نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کیا ہے.... بارہا! ظالم' جابر' سفاک اور بھیڑیئے تک کے لقب سے ہمیں نوازا گیا مگر ہم نے! جہالت اور کم علمی سے منسوب ان القابات پر جذبات کی بجائے عقل و شعور کو غالب رکھا.... بہت سے عاقبت نااندیش' بزدل اور کم ہمت ''تجارت سے توپ'' کی حکمتِ عملی کو تنقید کا نشانہ بنا کر' ہماری انسان دوستی کو مشکوک کرنے کی کوشش کرتے رہے....! کیا وہ نہیں جانتے؟ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے....! جنگ بھی وہ جو نسل در نسل اور صدیوں پر محیط ہے....! ہم پر' ناواجب تنقید کرنے والے اور ہماری دُور اندیشی کو انسانیت کے لئے مضر گردانے والے' اِس بات کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر ہماری جانب سے ذرا بھی سستی' غفلت یا لاپرواہی کا مظاہرہ ہوتا تو کیا آج! ہم اُن کی اور وہ ہماری پوزیشن پر نہ ہوتے....؟ ہم نے اپنی تعلیمات کی پیروی میں' انسانیت کی فلاح کے لئے جتنے منصوبے' وسائل اور توانائی اپنے دشمن پر صَرف کی ہے اُس کا ہم پر تنقید کرنے والوں کے ہاں تصور بھی نہیں پایا جاتا....! اپنی رگوں سے خون نچوڑنے کا الزام لگانے والے' وقت پڑنے پر اپنوں کا گوشت بلکہ ہڈیاں تک چبانے سے دریغ نہیں کرتے....!

ہماری تقلید' ہماری زبان' ہماری ثقافت سے روشن دماغی کا لیبل چُرانے والے نام نہاد دانشور' سیاستدان' بیوروکریٹ' اساتذہ اور ٹیکنو کریٹ کبھی ٹھنڈے دل سے غور کیوں نہیں کرتے کہ اُنھیں ہم سے گِلہ کس چیز کا ہے....؟ کون سی عنایت' کون سی مہربانی اور کون سی نعمت ہے جس سے ہم نے اُنھیں نہیں نوازا....! بیل گاڑی کے سست رفتار سفر سے جہاز کی برق رفتاری کس کی مرہُون منت ہے....؟ مٹی کی ہانڈی کو مائیکرو ویو اوون میں کس نے تبدیل کیا....؟ سرکنڈے کے قلم سے' کمپیوٹر تک ترقی کا سفر کس کے خون جگر کا ثمر ہے....؟ کس کے طفیل چیچک' ہیضہ' پلیگ اور ٹی بی جیسی بے ضرر بیماریوں سے' کیڑے مکوڑوں کی طرح' مرنے والے' بلڈ پریشر' شوگر' ہارٹ اٹیک اور ایڈز جیسی مہلک بیماریوں سے سروائیو کر رہے ہیں.....؟ وہ یہ کیوں فراموش کرتے ہیں کہ آزاد قوموں میں اُن کا شمار.... ہماری دریا دلی کی دین ہے....! ہم چاہتے تو چوہوں کے پلّوں کو غلام رکھنا ہمارے لئے قطعی مشکل نہ تھا.... ہم! اُن پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم لوگ جن کو مسیحا جان کر ہم سے چھٹکارا حاصل کر رہے ہو وہ نہ صرف تمہارے دشمن' جھوٹے' مکار' فریبی اور مجمع باز ہیں بلکہ دلی اور دماغی طور پر بھی قطعی بونے ہیں....! اُن کے دلوں اور دماغوں پر' ہماری نقالی کا بھوت سوار ہے.... وہ ہر قیمت پر اقتدار حاصل کر کے ظلِ سبحانی اور عالم پناہ بن کر اپنی حیثیت' مرتبہ اور مال و دولت میں اضافہ چاہتے ہیں.... بیشک! اُن کو غلام بنا کر حکمرانی کرنے میں ہمارا بھی مفاد پوشیدہ تھا مگر انفرادی نہیں اجتماعی' عارضی نہیں دائمی' بے مقصد نہیں مقصدی.... اُن کے دیسی حکمرانوں کا تمام تر زور ذاتی مفاد اور عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جس کا ثبوت اُن کے ہاں تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی' بے روزگاری' بدامنی' رشوت اور طرح طرح کے جرائم ہیں جس میں انسان تو کیا ایمان بھی بِک رہے ہیں....!

ایک الزام ہم پر دخل اندازی اور معاشی جکڑ بندی کا لگایا جاتا ہے....! آپ کو اجازت ہے چاہیں تو اس نانسنس اپروچ پر دل کھول کر ہنس سکتے ہیں....! ہنسنے کے بعد اس امر پر غور ضرور کیجئے کہ احمقانہ الزام میں حقیقت کا شائبہ کس قدر ہے....! کبھی دنیا میں وہ چیز بھی خریدی گئی ہے جو برائے فروخت نہ ہو....؟ ہم اپنی محنت' لگن اور عزم سے طاقت حاصل کر کے پوری دنیا کو ماچس کی ڈبی میں بند کر سکتے ہیں تو ہمیں کیا غرض تھی ان نام نہاد بونوں کو خریدتے اور ان کی قوموں کا حکمراں بناتے....؟ دیکھئے آپ لوگ پھر ہنس رہے ہیں حالانکہ مقام غور و فکر کا ہے....! یہ لوگ ہماری دہلیز پر اقتدار کے ساتھ اُس کے بعد کے لوازمات کے لئے بھی اِس رِقت اور عاجزی سے جبیں رگڑتے ہیں کہ ہم جیسے عمل پسند لوگ بھی سہل پسندی کا شکار ہو کر ان کو آلۂ کار بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نتائج خود بخود ہماری جھولی میں آن گرتے ہیں۔

مجھے احساس ہے' میں شرمندہ بھی ہوں....! عمل پسند قوم کا نمائندہ ہونے کے باوجود کسی کسی لمحے' جذبات مجھ پر غالب آتے رہے....! مجھے معاف فرمایئے اور باقاعدہ طور پر کام کا آغاز کیجئے....! آپ لوگوں نے تمام تحریری مواد کا بغور مطالعہ فرمایا' کیمرے اور تیکنیک کی مدد سے پردہ سیمیں پر عکسی مناظر ملاحظہ فرمائے ازاں بعد گروپس کی شکل میں مباحثوں میں حصّہ لیا۔ جن کی رپورٹس ہماری میزوں پر دستیاب ہے۔ اُسی کی روشنی میں ہمارے ماہرین آپ کے تمام سوالات' خدشات اور اندیشوں کے تسلی بخش جوابات دیں گے اور آپ کی تجاویز و آراء کو خوش آمدید کہیں گے....! طریقۂ کار اِس طرح ہے کہ آج کے اِس اجتماع کا نہ کوئی صدر ہے' نہ چیئرمین ہم سب برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے پروگرام کی حتمی منظوری تک شریک گفتگو رہیں گے....! تمام نشستوں کے سامنے برقی بلب لگا ہوا ہے جس کا بٹن آپ کے ہاتھ کی دسترس میں ہے اُسے دبا کر آپ اپنا بلب روشن کر دیں گے جس کے بعد آپ کو باقاعدہ گفتگو کی دعوت دی جائے گی....! ایک کے بعد ایک کے اصول پر یہ سلسلہ کُلّی اتفاق تک

جاری رہے گا....! کام کے باقاعدہ آغاز سے قبل' ایک معذرت! سوری آئی ایم ایکسٹریملی ویری سوری' پہلی معذرت میری ذات کی نسبت سے تھی جب کہ دوسری معذرت اجتماعی ہے....! آپ کی تواضع کے لئے تمام تر تکلفات کے باوجود ''مشروبِ مسرُور'' سے قطعی طور پر پرہیز کیا گیا ہے....! ہم تاریخ کے سب سے نازک دور سے گزر رہے ہیں جس کے ایک ایک لمحے کے لئے ہم سب کو اپنے نامور اور محترم بزرگوں کی ارواح کے علاوہ مستقبل کے مورّخ کے روبرو جواب دہ ہونا ہے لہٰذا اپنی بقا کی جنگ کے اہم فیصلوں میں کسی بھی طور پر اپنی ذات کو مدہوشی کے الزام سے محفوظ رکھنا ہم سب کا فرض ہے....! مجھے اُمید ہے آپ کا تعاون اور قربانی آنے والی نسلوں کے لئے سنگِ میل ثابت ہوگا!!''

''جی محترم....! آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے میں اپنی خوشی بیان نہیں کرسکتا....! کیسا حُسنِ اتفاق ہے؟ حق بحق دار رسید کے مطابق آپ کی ٹیبل کا بلب سب سے پہلے روشن ہوا یہ نہ صرف ہم سب کے لئے نیک شگون بلکہ خوش قسمتی اور برکت کا باعث ہے....!''

''آپ کے بلکہ ہم سب کے مرتب کردہ پروگرام کی کامیابی یا خدانخواستہ ناکامی کی بابت دوستوں کے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے....! میرے ذہن میں بھی کچھ تحفظات ہیں جن کا ذکر میں بعد میں کرنا چاہوں گا....! سب سے پہلے جس سوال نے مجھے مضطرب کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگ آج کے اس اکٹھ کی بابت' میڈیا کو کس طرح جسٹی فائی کریں گے اور آج کے اجلاس کو کیا عنوان دیں گے....؟''

''سوال یقیناً اہم ہے اگر آپ کے علاوہ کوئی اور محترم دوست اٹھاتے تب....؟ حضورِ والا! ہمارا میڈیا ہم سے الگ نہیں ہے جس طرح ماضی میں ہمارے میڈیا نے' ہماری کامیابی اور کامرانی میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اسی طرح وہ اس مہم اور منصوبہ بندی میں بھی ہر طرح سے ہمارے شریک ہیں....! آپ بخوبی جانتے ہیں ہمیں ہزاروں یا لاکھوں میڈیا منیجروں کی قطعاً پروا نہیں ہے۔ ہاتھوں کی انگلیوں پر گِنے جانے والے نشر واشاعت کے چند بڑے ادارے عین اِسی طرح اپنی برادری کے رہبر و رہنما ہیں جس طرح ہم اور آپ کرّہ ارض کی قسمت کے مالک....! کون سی بات خبر ہے یا کس بات کو خبر بنانا ہے اس کا فیصلہ کرنے میں وہ لوگ پوری ذمہ داری کو ملحوظ رکھتے ہیں....! مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی توقف نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے میڈیائی دوستوں نے تمام وسائل اپنی ذات کے بجائے مقدّس نصب العین کے لئے وقف کیے ہوئے ہیں۔ ہماری کامیابی میں اُن کی کاوشوں اور قربانیوں کا بیان مشکل ہے....! آپ کو' ہم سب کو بہت سے اہم واقعات اچھی طرح یاد ہونا چاہئے جب ان لوگوں نے بڑی سے بڑی خبر کو' غیر اہم بنا کر میڈیا تک پھٹکنے بھی نہیں دیا اور کبھی کبھی رائی کا پہاڑ بنا کر آسمان سر پر اٹھا لیا....! زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ہم سب کو سرکش خاتون کا انجام اور اُس کا دُھند میں غائب ہونا اچھی طرح یاد ہونا چاہئے جس نے بچگانہ حرکتوں سے ہمارے وقار کو بٹّہ لگانے کی کوشش کی تھی....!''

''جی بندہ پرور ارشاد....! نا' نا آپ کو زحمت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں' اطمینان سے نشست پر تشریف رکھتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بیان کیجئے....!''

''میرے لئے یہ امر حیرانی کا باعث ہے کہ تمام محترم دوستوں نے اس منصوبے پر غور فرماتے ہوئے اتنے بڑے جانی اور مالی نقصان سے کس طرح صرفِ نظر کرلیا....؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ اکیلے یا ہم سب مل کر اتنے خوفناک جانی و مالی نقصان کو برداشت کرسکیں گے....؟ میری درخواست ہے کہ ہم سب کو تحمل مزاجی سے' اس ایک نکتہ پر غور و فکر کرنا چاہئے اور بار بار کرنا چاہئے....!''

''آپ کا فرمان بجا اور صائب ہے....! ہمیں ایک ایک شِق اور ایک ایک نکتہ پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کر کے عمل کی جانب قدم بڑھانا چاہئے....! جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے واقعی نقصان کی مالیت اور تلف ہونے والی جانوں کی تعداد کافی زیادہ ہے مگر اُس سے کم ہے جتنی کاغذ پر نظر آرہی ہے....! سب سے پہلے میں انسانی جانوں کی بابت عرض کروں گا کیوں کہ انسان سے مقدّس اِس سرزمین پر کوئی شے نہیں....! اِس باب میں ہماری حکمتِ عملی یہ ہے کہ ہم' زیادہ سے زیادہ بلکہ قریب قریب اپنے تمام کارکنان کو' اُس دن کام سے غیر حاضر رہنے کی ہدایت کردیں گے۔ اِس طرح ہمارا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا....! باقی جتنا بھی جانی نقصان ہو چونکہ وہ ہمارا نہیں ہوگا لہٰذا ہمیں اُس سے کیا سروکار....! ہمارے میڈیا نے طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت اِس واقعے کو اپنے انداز میں پروجیکٹ کرنا ہے (معاف کیجئے میں ابھی واقعہ ہی کہوں گا) لہٰذا مرنے والوں کی تعداد وغیرہ بڑا مسئلہ نہیں....!''

''مجھے آپ کے استدلال سے اتفاق نہیں ہے....! اِس ہدایت کو خفیہ رکھنا قطعی ناممکن ہے....! بات دو چار' دس بیس' سو پچاس تک محدود نہیں ہزاروں کا معاملہ ہے....؟''

''آپ کا کیا خیال ہے....؟ ہم تیسری دنیا کے ممالک کی طرح تحریری ایڈوائز اور ہینڈ آؤٹ کے ذریعے اتنی اہم اور خفیہ ہدایت جاری کریں گے....؟ نہیں صاحب ہرگز نہیں اس طرح جاری ہونے والی ایڈوائز اور ہینڈ آؤٹ وقت سے پہلے طشت از بام ہوجایا کرتے ہیں۔ اس بار ہم نے یہ مہم ''سینہ گزٹ'' کے ذریعے نشر کرنے کا پروگرام بنایا ہے....! سینہ گزٹ سے مراد آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ایک شخص دوسرے کو زبانی اور خفیہ ہدایت کے ذریعے اس دن کام پر آنے سے متنبہ کرے گا....؟ ہماری رازداری اور برداشت تو پوری دنیا میں مثال کے طور پر استعمال ہوتی ہے....!''

''سوال کا دوسرا حصہ....! مالی نقصان کی بابت ابھی تک تشنہ طلب ہے اگر ایک بار ہم لوگ مالی طور پر عدم توازن کا شکار ہوگئے تو ہمارے دشمن کو ہمیں زیر کرنا مشکل نہ ہوگا....! اتنے بڑے پیمانے پر فضائی کمپنیوں کا خسارہ اور اُس کے

ردِعمل میں انشورنس کمپنیوں پر مالی بوجھ' بینکنگ کے شعبہ کو ڈھانہیں تو ڈانواں ڈول ضرور کردے گا....؟''

''میں آپ کی تشویش میں برابر کا شریک ہوں....! واقعی معاملہ بہت حساس اور سنگین ہے۔ ہمارا ماضی اس طرح کے خطرات سے گزر کر ہی اس مقام پر پہنچا ہے لہٰذا ہمیں بھی اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے....! آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ کسی تاریخی عمارت' جگہ یا کسی چیز کی تباہی کے بعد ہمارے عوام کا تجسّس اور اشتیاق انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے....! بھاری سے بھاری قیمت دے کر بھی ہم لوگ اُس یادگار کو محفوظ کرنے کے جنون میں مبتلا ہوجاتے ہیں....!''

''آپ کی بیان کردہ طویل تمہید کے باوجود' شرکائے محفل یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں....؟''

''جنابِ والا....! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس ابھی سے تباشدہ بلڈنگ کا میٹریل خریدنے کی پیشکش آنا شروع ہوگئی ہیں جو کسی طرح بھی بلڈنگ کی مالیت سے کم نہیں ہیں....!''

''خوب ....بہت خوب....! کیا کہنے....! بڑی یونیک پلاننگ ہے....! مگر ہوائی کمپنیوں اور مالیاتی اداروں کی بابت بھی کچھ روشنی ڈالئے نا....؟''

''میں آپ تمام حضرات کی سنجیدہ توجہ کا طالب ہوں....! صفحہ نمبر تین سو چوالیس پر پیراگراف اے۔بی آپ کی توجہ کا طالب ہے.....! ہم لوگ جتنے مہذب' اصول پرست اور قوانین کے پابند ہیں اتنے ہی کمزور دل بھی واقع ہوئے ہیں....! دنیا کا ہر مہذب اور پڑھا لکھا آدمی کسی قدر کمزور اور بزدل بھی ہوا کرتا ہے....! اس سلسلے میں بھی ہمارے میڈیا کا اہم کردار ہے....! متذکرہ بالا صفحے پر بیان کردہ بیماری کا ہوّا کھڑا کر کے ہمارا میڈیا خوف و ہراس کی ایک فضا قائم کردے گا....! آپ تو جانتے ہیں ہمارے عوام کسی بھی طرح کا ناواجب ٹیکس دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی مگر میڈیا کے زیرِ اثر پھیلائے ہوئے خوف کے ردِعمل میں مذکورہ بالا بیماری کے سدِ باب کے لئے منہ مانگی قیمت پر اُس کے بچاؤ کی تدابیر ہر حال میں کرے گی.....لہٰذا.....! مالیاتی اداروں نے ایک کنسورشیم بنا کر تمام دوائی کمپنیوں کو اُس مہلک بیماری سے بچاؤ کی دوائی کے بڑے پیمانے پر آرڈر دے کر نہ صرف گودام بھر لئے ہیں بلکہ تمام ادویہ ساز اداروں کو اس امر کا پابند کرلیا ہے کہ وہ یہ خاص دوائی صرف مذکورہ مالیاتی اداروں کی ہدایت پر تیار کریں گے اور جس کی مارکیٹنگ سے نہ صرف مالیاتی ادارے اپنا خسارہ پورا کریں گے بلکہ بھاری منافع بھی کمائیں گے....؟''

''مسٹر....؟ ہمیں آپ کی سالہا سال کی ریسرچ' منصوبہ بندی اور قوت ارادی پر پختہ اعتماد ہے....؟ آپ یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر' ماہر و مشّاق اور خود کُش رضا کار' اُنھیں مہیا ہوجائیں گے اور وہ سب کے سب' آپ کی خواہش کے مطابق تمام اہداف حاصل کرلیں گے....؟ کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ تمام کارروائی فرضی طور پر اُن کے کھاتے میں ڈالی جائے گی....؟

''جناب والا....! مَیں خود پر قابو رکھتے ہوئے بہت احترام کے ساتھ عرض کروں گا بلکہ آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا....! ہمارے' آپ کے یا کسی بھی محترم شرکاء کے یہاں' اس قدر جاہل اور عقل کے اندھے دستیاب ہیں....؟ ہرگز نہیں....! جدید علم کی روشنی سے مالا مال کر کے اپنے نوجوانوں کے جذبات پر' ہم نے عقل کا غلاف چڑھا دیا ہے....! اندھے کنوئیں تو کجا' عام سادہ گڑھے میں چھلانگ لگانے سے پہلے' ہمارے نوجوان اپنا اور اپنی قوم کے نفع نقصان پر سو بار نہیں' ہزار بار غور کرتے ہیں....؟''

''بہتر نہ ہوگا کہ آپ تبلیغ کا شوق پورا کرنے کی بجائے اصل منصوبے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں....!''

''آپ بخوبی جانتے ہیں....! ہم نے نہایت محنت اور جانفشانی سے' اپنی اُمیدوں کی فصل' اندھے عقیدے کی سرزمین پر بوئی ہے....! اُن کی اُمیدوں' آرزوؤں اور تمناؤں کا تناور درخت' ہمارے ہی ہاتھوں کاشت ہوا اور ہماری پائپ لائن کی زرخیزی سے پھل پھول کر مزید چھوٹے بڑے درختوں کی آبیاری کررہا ہے....! بظاہر وہ اُن کے لئے' چھتر چھاں کیے ہوئے ہے مگر اُس کی جڑوں میں ہماری سپلائی کردہ خوراک' عنقریب اُن کے لئے خوفناک شعلوں کی بارش برسانے والی ہے....!''

''اُن لوگوں کے بار بار ذکر سے آپ پر بھی اُنھیں کی مانند جذباتی کیفیت طاری ہورہی ہے....! سوال یہ ہے کہ آپ کس اُمید' وثوق اور یقین کے ساتھ منصوبے کی کامیابی پر زور دے رہے ہیں....!''

کبھی کبھی منزل تک پہنچنے کے لئے' ٹیڑھی راہ کا انتخاب بھی ضروری ہوتا ہے....! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اُن کی آرزوؤں اور عقیدت کے مرکز کو پہلے پالا' پوسا اور طاقتور بنایا پھر اُس کے کاروبار کو وسعت دے کر دولت کے ڈھیر پر کھڑا کردیا اور سب سے آخر میں اُس کے ذہن میں طاقت کا زہریلا نقطہ بھر کے اپنی دشمنی کا لاوا بھڑکا دیا....! وہ جب جب جہاں جہاں اپنی خود ساختہ طاقت' سرمائے اور ذہانت کے برتے پر جتنے منصوبے بھی بنائے گا در پردہ ہماری معاونت اور مہارت اُن میں شامل رہے گی.....! ہمیں علم ہے کہاں کہاں کتنی تعداد میں' ہماری آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں....! ہمارے مشّاق کارندے قدم قدم پر اُنھیں اپنی مرضی کا دودھ پلا کر اور اپنے مطلب کے گُر سکھا کر اُن کے نام نہاد مقاصد کی جانب دھکیلتے جائیں گے....! بظاہر وہ اپنے مقدّس مِشن کی جانب گامزن ہوں گے مگر تکمیل ہمارے مقاصد کی کررہے ہوں گے....!

''یعنی آپ....؟ خود کُش رضا کاروں کی تربیت اور پلاننگ میں در پردہ طور پر معاونت کررہے ہیں....؟ یہ تو بہت خطرناک کھیل ہے....! کرّہِ ارض کی تاریخ میں کسی قوم نے اتنی بھاری قیمت دے کر شاید ہی اپنے مقاصد

حاصل کیے ہوں....؟ سوچیے....! غور کیجئے....! ذرا سی غفلت اور لاپرواہی' آسمان سے دھکیل کر ہمیں کھجور میں نہ اٹکا دے....؟''

''بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو قربان کرنا ہی پڑتا ہے....! آپ اطمینان کے ساتھ ہمیشہ کی مانند حوصلے جواں رکھئے' خدا ہمارے ساتھ ہے....!''

''آپ نے اس امر پر غور کیا ہے....! تھوڑے سے وقت میں اُن لوگوں کی کتنی بڑی تعداد ہم خیال و یکجا ہوگئی ہے....! میرے خیال میں آپ کے اِس عمل کے بعد اُن کی صفوں میں نفرت کی نہ ختم ہونے والی لہر' آپ کے اور آپ کی مسلح افواج کے خلاف بھڑک اٹھے گی جس سے بڑے پیمانے پر احتجاج اور بغاوت یقینی ہے....!''

''بلاشُبہ....! آپ نے انتہائی اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے' آپ سب کی روشن آنکھیں اور تابدار چہرے اس اہم سوال میں آپ کی دلچسپی کو عیاں کر رہے ہیں مگر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بھی ہمیں ماضی کی جانب تھوڑا سا سفر پھر سے کرنا ہوگا....! زیادہ پرانی بات نہیں صرف ڈیڑھ دہائی قبل تک سفید ریچھ نے ہمارا ناطقہ ہر شعبہ زندگی میں بند کیا ہوا تھا....! ایک دو نہیں مسلسل سات دہائیوں تک اُس نے ہماری برابری اور ہم عصری کی اندھی دوڑ دوڑ کر' دنیا کے ایک معقول حصّے کو اپنی طاقت سے مرعوب کر لیا تھا۔ آپ کو یاد ہے....؟ کتنی بڑی تعداد میں لوگ اُس کے نعروں کی گھن گرج کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے....! ہم بھی' دنیا دکھاوے کو قدم سے قدم ملا کر اُس کے ساتھ دوڑتے رہے مگر اُس کے فرشتوں کو بھی یہ بھنک نہ لگنے دی کہ جس ٹریک پر وہ ہمارے ساتھ دوڑ رہا تھا اُسی ٹریک کے نیچے ہمارے بچھائے گئے جالوں کی سرنگ اُس سے بھی تیزی سے کھودی جا رہی تھی۔ جو ایک دن اُن کے اقتدارِ اعلیٰ پر جا کر اس شکل میں نمودار ہو ئی کہ اُن کا وجود کرچی کرچی ہو گیا....!''

''کیا اُس وقت کے حالات کو آج کے تطابق میں درست قرار دیا جا سکتا ہے....؟ جس ریچھ کی آپ بات کر رہے ہیں وہ تنہا تھا اور ہمارے اعلیٰ ذہنوں نے اُسے بتدریج دیوار سے لگانے کی تدبیریں کی تھیں جب کہ ہمارا موجودہ دشمن جا بجا ٹکڑیوں کی شکل میں بٹا ہوا ہے اور اب' اُن کی مدد کے لئے ایک نیولا بھی بِل سے باہر آ کر پھنکارنے لگا ہے....! خدانخواستہ! اُن کے ساتھ وہ بھی میدان میں کود گیا تو آپ کیا کریں گے....؟''

''نہیں صاحب ہرگز نہیں....! مجھے آپ سے اختلاف ہے اور اس اختلاف کی وجوہات بھی انتہائی ٹھوس ہیں.... دیکھئے! ہم ایک عرصے سے عالمی تجارت پر قابض ہیں اور بعض شعبوں میں ایک کے عوض ایک ہزار تک منافع کما رہے ہیں دیکھا جائے تو یہ نظریئے وغیرہ کی لڑائی اوپری باتیں ہیں اصل جنگ معاش کی ہے اور ہم نے اُسے نناوے کے پھیر میں الجھا دیا ہے....!''

''آپ کی گفتگو پھر ابہام پیدا کر رہی ہے....؟''

''قطعی نہیں ہر....! آپ جس ہوّے کی نشاندہی کر رہے ہیں ہم نے اُسے جوتے' موزے' تیل' پھلیل' بینڈ' باجا اور سوئی دھاگے کی معمولی تجارت میں الجھا کر' پوری دنیا میں اس کے مفادات کی فصل لہلہا دی ہے اور بدلے میں اُس کے ہاں کُھل کھیلنے کی آزادی حاصل کر لی ہے.....! آپ بتایئے....! آپ میں سے کس کے ہاں وہ ٹکے ماری کرتا نظر نہیں آتا....؟ کیا اُس کے دماغ میں پھوڑا نکل آیا ہے کہ وہ ایک طبقے کی حمایت حاصل کرنے کے لئے دنیا کی سب سے بڑی آبادی کو نانِ جویں کے لئے ترسائے اور خود اپنی تباہی کا سامان کرے....؟''

''ہمارے اور اُن کے زمینی فاصلے پر آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا اگر ہم وہاں اُبلنے والے نفرت کے لاوے سے صرفِ نظر بھی کر لیں تو اتنی بڑی تعداد میں بلا اُن کے زمینی تعاون کے اپنی فوج اور سامانِ حرب کو وہاں پہنچانا کس طرح ممکن ہے....؟''

''مجھے سب سے پہلے آپ کی نکتہ آفرینی پر داد دینا چاہئے.... حضور والا! اگر ہم صفحہ چار سو بیس کا بغور مطالعہ کریں تو اُس کے بعد اس سوال کی سنگینی کسی قدر کم ہو سکتی ہے....! ہم نے یہ کب کہا....؟ ہماری مسلح افواج تن تنہا یہ معرکہ سرانجام دیں گی اور ان کے عملی تعاون کے بغیر دیں گی....؟ جنابِ والا! ہماری افواج کے شانہ بشانہ نہ صرف ہم سب کی مسلح فورسز بلکہ تمام متاثرین (جہاں آپ کے خیال میں ہنگاموں اور ہڑتالوں کا خدشہ ہے) کی مسلح طاقتیں بھی اس مہم جوئی میں ہراول دستے کا کام دیں گی....!''

''یہ اگر ممکن ہے تو....! آپ معجزوں پر قادر ہو چکے ہیں....! میں چاہوں گا کہ آپ تفصیل سے اپنے منصوبے پر اظہارِ خیال کریں....!''

''میرے محترم....! ایک عشرہ قبل ریتلے علاقے میں سَر کیے گئے معرکہ پر توجہ مرکوز کریں تو آج کی صورتحال بخوبی سمجھ آ سکتی ہے....! کیا اُس وقت اُن کی برادری میں ہلچل اور ہیجان نہ تھا....؟ کیا اُس وقت ہمارے خلاف جلسے' جلوس' گھیراؤ' جلاؤ کی تحریکیں نہ چلی تھیں....؟ ایسے مواقعوں پر ہمارا طریقۂ کار یہ ہے کہ ہم انتہا پسندوں کے میدان میں آنے سے قبل اپنے تنخواہ داروں کے ذریعے ہنگاموں اور ہڑتالوں کو ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ جس کے ردِعمل میں ہونے والے ہنگامے اور ہڑتالیں' ہمارے مکمل کنٹرول میں بھی ہوتے ہیں اور وہاں کے اُجڈ اور جذباتی عوام کا کتھارسس بھی ہو جاتا ہے....!''

''جنابِ والا....! جہاں تک سوال ریگستانی علاقوں کا ہے وہاں تک تو ہم آپ کے طریقہ کار کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتے....! کسی کو آپ نے ملکِ عدم روانہ کر کے نجات پائی' کسی کو اقتدار کا لولی پوپ تھما دیا' کسی کے عقد میں حسینۂ شاطر دے کر ہمیشہ کی نگرانی کا بندوبست کر لیا' کسی کو ایک صدی کی خریداری کے شکنجے میں کس لیا' کسی کو حفاظتی ہوّے میں مقیّد کر لیا' کسی کو بے مقصد مہم جوئی پر لگا دیا....! باقی بچنے والوں کو جوئے' شرب اور کسینو کے طواف میں مُبتلا کر دیا.... البتہ! مہلک کھلونوں کے عاشقوں سے آپ کا عمل' کسی قدر مبہم اور ناعاقبت اندیشی

پر بیس کرتا ہے....؟ وہاں پر ہماری حکمتِ عملی کی کمزوری کے اسباب کیا ہیں....؟ نصف صدی سے ہم نے انہیں جاہل رکھ کر کیا حاصل کیا....؟ کیوں ہم وہاں نت نئے گھوڑوں کی تیاری پر توانائی صرف کرتے اور پھر اُسے سرپٹ دوڑنے سے پہلے ہی ناکارہ سمجھ کر دوسرے گھوڑے پر داؤ لگانا شروع کر دیتے ہیں....؟ اکثر اوقات ایک وقت میں ایک سے زائد گھوڑوں کی افزائش بھی کی جاتی ہے....! اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ نے خود ہی وہاں جنونیت کی تمام اقسام کے پودے کاشت کر کے' نفرت کی گرم ہواؤں کا رخ اپنی جانب کر لیا اور اب آپ انہیں کی بیخ کُنی کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر خطرات سے کھیلنے کا عزم رکھتے ہیں....!''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اِس موضوع پر کُھل کر روشنی ڈالی....! آپ کے دائیں' بائیں اور پُشت والے بھی آپ کے خیال کی تائید میں ہاتھ بلند کر کے ہم آہنگی کا ثبوت دے رہے ہیں....! ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ گاہے بگاہے ہماری کارکردگی کو اسی طرح جانچتے پرکھتے رہا کریں اس طرح ہمیں اپنی اصلاح کا موقع میسر رہے گا....! میں آپ کے سوال کی جانب آتا ہوں....! یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری دوستی اور دشمنی' ذاتی بنیادوں کے بجائے مفادات کے تحت ہوا کرتی ہے۔ مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ منہ دیکھ کر تھپڑ مارنا چاہئے سو ہم اُن لوگوں کے ساتھ اُن کے مزاج' نفسیات اور اوقات کے مطابق ڈیل کر رہے ہیں جس کے ثمرات مستقبل میں بھی ہماری مرضی کے مطابق رہے ہیں اور آئندہ بھی ہماری منشاء کے مطابق ہی ہوں گے....! جہاں تک سوال جنونیت کی فصل بونے کا ہے تو یہ کام ہم نے سالہا سال کی تحقیق اور اُن لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کیا ہے....! آپ کو علم ہے کہ وہ لوگ انتہائی کچے عقیدے اور اندھی تقلید کے قائل ہونے کی وجہ سے دماغ کے بجائے دل سے سوچتے ہیں۔ ہم نے اسی سوفٹ کارنر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے' وہاں جنونیت پھیلا کر اُن کے عقائد اور نظریئے سے عام آدمی کو پوری طرح بیزار کر دیا....! آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کا عام آدمی (مراد نیم خواندہ سے ہے) کچھ عرصہ پہلے تک مولوی' مُلّا' پیر' فقیر اور حاجی' نمازی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اب تحقیر آمیز الفاظ سے یاد کرتا ہے اور جب ہم اسی تحقیر آمیز طبقے پر ضرب کاری لگائیں گے تو تمام خواندہ و نیم خواندہ افراد کے ساتھ ان پڑھ لوگوں کی معقول تعداد بھی ہماری ہمنوا بن جائے گی....! اب میں آتا ہوں گھوڑوں کی افزائش کی جانب....! یقیناً آپ کا سوال گزشتہ دنوں' ایک ہی وقت میں سفید گھوڑے اور خا کی گھوڑے کی پُشت تھپتھپانے کے ردِعمل میں ہوا ہے....! یقین مانیے! ہمارا طرزِ عمل' اچانک یا کسی جذباتی سوچ کا نتیجہ ہرگز نہیں....! ماضی میں بھی ہم ایک ہی وقت میں کئی کئی گھوڑوں کو بیک وقت دانہ دنکا ڈالتے رہے ہیں....! پُشت ہا پُشت سے غلام ذہنیت رکھنے والے حکمران بنتے ہی پاگلوں کا سا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کے بدبودار ذہن میں ہیرو بننے کا خناّس سر اُبھارنے لگتا ہے۔ ایک طرف وہ ہم سے وعدے وعید کر رہے ہوتے ہیں دوسری طرف ہماری تباہی کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے شعلوں سے کھیلنے لگتے ہیں لہٰذا ہمیں تازہ دم گھوڑا ہر وقت تیار رکھنا ہوتا ہے تا کہ منہ زور گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر اپنی پسند کے گھوڑے کے لئے میدان فراہم کیا جائے....! اس بار ہم نے دانستہ سفید اور خا کی گھوڑے کو ایک ساتھ اس لئے ہشکارا دیا کہ کہیں سفید گھوڑے زیادہ وزن کے باعث پدک نہ جائیں اور اُن کے پدکنے کی صورت میں خا کی گھوڑے سے اُن کا شیر و شکر ہونا بھی یقینی تھا.... لہٰذا! ہم نے جو کام ماضی کے لئے اٹھا رکھا تھا اُسے بھی لگے ہاتھوں نمٹا دیا یعنی خا کی گھوڑے کی تیز رفتاری اور صحت مندی کے میدان میں نوک دار کیلوں کا جال بچھا دیا اب اُس کی پیٹھ پر بھی استعداد سے زیادہ وزن ہے اور پیروں کے نیچے نوکدار کیلیں ہیں۔ وہ جتنا دوڑنے کی کوشش کرے گا اتنا لہولہان ہوگا۔ اس طرح ہلدی اور پھٹکری کے بغیر ہمارے خوابوں کی تکمیل ہوگی.....!''

''میرے دوست....! اس طویل تمہید کے باوجود آپ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ ہماری افواج کو اُن کا زمینی اور تکنیکی تعاون کس طرح حاصل ہوگا....! بھلا کبھی کسی نے قربان ہونے کے لئے اپنی شہ رگ پر خود چھری چلائی ہے....؟''

''اس بار یہ معجزہ بھی آپ بچشم خود دیکھیں گے....! اِس کے علاوہ اُن کے لئے ہم نے کوئی راستہ باقی ہی نہیں چھوڑا....! پہلی بات تو یہ کہ ہم نے اُن کی معاشی مُشکیں کسنے کے ساتھ حربی طور پر بھی اُنھیں زیر کرنے کی پوری منصوبہ بندی کر لی ہے جس کے ردِعمل میں اُن کی کئی دہائی کی تعمیر و ترقی پچاس منٹوں میں ملیامیٹ ہو جائے گی اور اُن کے جاہ طلب لوگ یہ سودا آسانی سے قبول نہیں کریں گے....!''

''یعنی آپ ایک وقت میں ایک سے زائد محاذ کھولنے کی تیاری کئے بیٹھے ہیں....؟''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ہم سے پہلے ہمارا پردھان جو کئی دہائی سے اُن پر دانت تیز کیے بیٹھا ہے' ہمارے ایک اشارے پر اپنے سارے حساب چُکانے کے ساتھ ہمارا راستہ بھی آسانی سے صاف کر دے گا۔ اب اِن کے ایک طرف کنواں ہے اور دوسری طرف کھائی یعنی ایک طرف اُن کا ازلی دشمن اور دوسری طرف اُن کے رضاعی ماں باپ....! فیصلہ یقیناً ہمارے حق میں ہوگا کیوں کہ ہم نہ صرف اُن کی سلامتی کے ضامن بلکہ اُن کے اَن داتا بھی ہیں....!''

''تمام شرکا کی گفتگو سے محظوظ اور متفق ہونے کے باوجود میرے ذہن میں یہ سوال کافی دیر سے دستک دے رہا ہے کہ تمام کارروائی اور کامیابی اُس وقت کیوں حاصل نہ کی گئی جب نشانِ زد سرزمین پر ہمارے تنخواہ دار حکمران موجود تھے۔ اس طرح خون خرابہ بھی کم ہوتا اور مقصد بھی آسانی سے ہاتھ آجاتا....!''

''یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے....! ہم نے کبھی کسی ایک مقصد کے لئے ناک کی سیدھ میں چل کر قطعاً کوئی کام نہیں کیا....! ہمارا ہر قدم اور ہر عمل کثیر المقاصد ہوتا ہے....! لہٰذا یہ مہم جوئی بھی بہت سے مقاصد کی براری کے لئے

کی جارہی ہے....! اوّل ان کے عقیدے اور نظریئے کو ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو ایک صدی کے لئے ضرور پچھاڑ دیا جائے....! دوم پوری دنیا میں اپنی طاقت کی دھاک اس طرح بٹھادی جائے کہ آئندہ کوئی ہمارے خلاف سوچنے کی جرأت بھی نہ کرے....! سوم ہماری اسلحہ ساز فیکٹریاں ایک عرصے سے تجارت کی کساد بازاری کے باعث بند پڑی ہیں اور اُن کے گوداموں میں بے پناہ مالیت کا اسلحہ زنگ آلود ہورہا ہے۔ اُس کا استعمال....! چہارم اب تک ہم نے ہتھیاروں کے باب میں جتنی ترقی کی ہے اُتنی استعمال نہیں ہوئی.... لہٰذا! اس بار پہاڑوں کی سرزمین کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ ہم اپنے ترکش کے تمام تیروں کی استعداد اور کارگزاری جانچیں، پرکھیں اور اُن کی مزید بہتری کے لئے نئے سرے سے تحقیق کا اہتمام کرکے، اُنھیں زیادہ مہلک اور کارآمد بنائیں اور زیادہ سے زیادہ نئے آرڈر لے کر اپنی اسلحہ ساز فیکٹریوں کو کام میں مصروف کرکے دنیا کی دولت سے اپنا حصّہ پوری طرح وصول کریں....!

''جناب والا....! آپ نے جس چابکدستی سے اپنے مفادات کا درخت کاشت کیا ہے اُس کی جڑیں بہت دُور تک پھیل چُکی ہیں....! خدانخواستہ اس ساری کارروائی میں اصل ٹارگٹ اور اُس کا دست راست آپ کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ آگ کے شعلوں کو اس قدر ہوا دے سکتے ہیں کہ جس کا بیان بس سے باہر ہے....!''

''آپ نے یہ سوال کرکے میرے تنے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کردیا... بندہ پرور! اُن کا کردار ہمارے اسکرپٹ میں ابھی ختم نہیں ہوا....! اُن کی زندگی اور اُن کی موجودگی ہماری اُس خطّے میں مصروفیت کا جواز ہے جسے ہم ہرگز ضائع کرنا نہیں چاہتے....! ہم نے خاص طور پر یہ ہدایات جاری کردی ہیں کہ پرائم سسپیکٹس کو کسی قیمت پر گزند نہ پہنچائی جائے....! اُن کی سلامتی، ہماری بقا کی ضامن ہے....!

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں....! تمام شرکائے محفل آج کی بریفنگ سے متفق اور مطمئن ہونے کے ساتھ مسرور بھی ہوں گے....! واقعی آپ کی پلاننگ بہت دُوراندیشی اور ہنرمندی سے عبارت ہے۔ البتہ....! ایک نکتہ اب بھی وضاحت طلب ہے....! آپ نے یہ ہی قوم، یہ ہی خطّہ اور یہ ہی وقت اِس مہم جوئی کے لئے کیوں منتخب کیا....؟''

''اس برمحل اور بروقت سوال کا جواب انتہائی سادہ ہے....! ہم نے اُنھیں کی مقدّس کتاب کے ایک قول کو مشعل راہ بنایا ہے....! ''خُدا نے اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلی جو خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہتی ہو۔'' ہم حرکت کے قائل ہیں اور وقت کے ساتھ چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہر فیصلے اور عمل میں، عقل و شعور کارفرما ہوتا ہے.... لہٰذا! ہم نے یہ وقت بہت سوچ سمجھ اور غور وفکر کے بعد منتخب کیا ہے....! یہ لوگ عقل کے اندھے اور جذبات کے غلام ہیں.... عقائد کی لکیر پیٹ کر معجزوں کو پکارنے کے عادی ہیں....! بہت دیر پہلے، محترم دوست نے سوال کیا تھا کہ ہماری مرضی ومنشا کے مطابق خودکُش رضا کار، کس طرح اہداف پورے کریں گے....؟ دوستو....! میری دھیمی آواز پر پوری توجہ کرتے ہوئے، میرے الفاظ نہایت غور سے سنیئے....! عقیدے کے مطابق اُن کی کامیابی اور کامرانی کا وقت آن پہنچا ہے........ لہٰذا! ہم نے بیتابی کی سان پر، عجلت کی دھار لگاتے ہوئے اُن کے اذہان میں یہ چیز راسخ کردی...... کہ تم چاہو تو طاقت کے بَل پر، اپنے عقیدے کے مطابق معجزہ کرکے دنیا کی حکمرانی حاصل کرسکتے ہو.... ہاہاہا.... بیچارے کہیں کے.... دن رات رٹتے نہیں تھکتے....!

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری

نفرت ہوتے ہوئے بھی مجھے اُن پر ترس آرہا ہے....! مقاصد کی تکمیل کے لئے، عمل کے بجائے، عقیدے کے اندھے کنویں سے معجزوں کی اُمید میں.... بے موت مارے گئے.... ہاہاہا.... بے موت مارے گئے....!!!

سائیکل معیشت کی دشمن ہے

ایک ملٹی نیشنل بینک کے سی ای او نے معاشی ماہرین کو اس وقت سوچ میں ڈال دیا جب اس نے کہا کہ: سائیکل ملکی معیشت کیلئے تباہی کا باعث ہے۔ اس لئے کہ سائیکل چلانے والا کار نہیں خریدتا، وہ کار خریدنے کے لئے قرض بھی نہیں لیتا۔ انشورنس نہیں کرواتا۔ پیٹرول بھی نہیں خریدتا۔ اپنی گاڑی سروس اور مرمت کے لئے نہیں بھیجتا۔ کار پارکنگ کی فیس ادا نہیں کرتا۔ وہ ٹال پلازوں پر ٹیکس بھی ادا نہیں کرتا۔ سائیکل چلانے کی وجہ سے صحت مند رہتا ہے موٹا نہیں ہوتا!! صحت مند رہنے کے باعث وہ دوائیں نہیں خریدتا۔ ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے پاس نہیں جاتا۔ حتیٰ کہ ملک کے جی ڈی پی میں کچھ بھی شامل نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ہر نیا فاسٹ فوڈ آؤٹ لیٹ اپنے ملازمین کے علاوہ کم ازکم 30 طرح کے لوگوں کے لئے روزگار کا سبب بنتا ہے۔ جن میں ڈاکٹر، امراض قلب کے ماہر، ماہرِ معدہ وجگر، ماہر ناک کان گلہ، دندان ساز، کینسر سپیشلسٹ، حکیم اور میڈیکل سٹور مالکان وغیرہ شامل ہیں۔ چنانچہ یہ بات ثابت ہوئی کہ سائیکل معیشت کی دشمن ہے اور مضبوط معیشت کے لئے صحت مند افراد سخت نقصان دہ ہیں۔

نوٹ:- پیدل چلنے والے معیشت کیلئے اور بھی خطرناک ہیں۔ کیونکہ وہ سائیکل بھی نہیں خریدتے۔

" نشاطِ روح "

واصف حسین واصف (نیویارک)

ہائے یہ کیسا ظلم بنایا ہے جسم سے
آواز دے کے مجھ کو بلایا ہے جسم سے

اس کو حیا کا پاس تھا، کتنا حیا کا پاس
چادر بنا کے مجھ کو لپیٹا ہے جسم سے

شائد مجھے خیال ترے جسم سے ملا
جیسے خیال میں نے تراشا ہے جسم سے

صوفی سنے تو ہاتھ سے تسبیح گر پڑے
اک روح کا نشاط سمیٹا ہے جسم سے

اس میں کمال نور کا کوئی نہیں میاں
سایہ تو روشنی نے بنایا ہے جسم سے

شازیہ اکبر (اسلام آباد)

رات بھر جانے کہاں گم تھیں مگر وقتِ سحر
آ گئیں آنکھوں کو ملتی ہوئی یادیں تیری

سرد شاموں میں چلی آتی ہیں اکثر ملنے
کاسنی شال میں لپٹی ہوئی یادیں تیری

راکھ اڑتی ہے زمانے میں مگر میرے صنم
صاف دکھتی ہیں مجھے آتی ہوئی یادیں تیری

ہجر کو کس کی دعا ہے کہ کبھی مرتا نہیں
اور ملتی ہیں اسے مہکی ہوئی یادیں تیری

اوڑھ لی برف بھی دیکھے ہوئے انگاروں نے
راکھ میں سوئیں نہ سلگی ہوئی یادیں تیری

یار! تم کتنے مہذب تھے مگر کس پہ گئیں
کاٹ کھاتی یوں جھگڑتی ہوئی یادیں تیری

تصور اقبال (اٹک)

کوئی بھی شے ضرورت سے زیادہ ہو نہیں اچھا
ہماری اس محبت کا اعادہ ہو نہیں اچھا

دیارِ شوق کا رستہ کشادہ ہو نہیں اچھا
حیاتِ پُر خطر کا "بخت" سادہ ہو نہیں اچھا

طبیعت میں ظرافت کا بھی کچھ حصہ ضروری ہے
شرافت کا ہمیشہ اک لبادہ ہو نہیں اچھا

شریعت پر اگر میں بھی نہیں چلتا تو مجرم ہوں
مگر وہ اک ولی کا خانوادہ ہو نہیں اچھا

سدا پیروں میں چبھ جائے اگر کانٹا نہیں اچھا
مسافر کوئی بھی اب پا پیادہ ہو نہیں اچھا

گھٹا کو آج خشکی پر برسنا چاہیے کھل کر
جہاں پہلے ہی پانی یہ زیادہ ہو نہیں اچھا

منانے میں تجھے ہر بار کتنی دیر لگتی ہے
ترا پھر روٹھنے کا گر ارادہ ہو نہیں اچھا

نیا اسلوب پیدا کر اگر دل میں اُترنا ہے
کسی کی شاعری سے استفادہ ہو نہیں اچھا

ترا جھکنا کسی مُودی کے آگے "باعثِ عزت"
مگر وہ اک سعودی شاہزادہ ہو نہیں اچھا

کسی صورت بھی پورا ہو نہیں سکتا تصور جو
ترا ایسا کسی سے کوئی وعدہ ہو نہیں اچھا

سُنا تھا پیار کے بارے میں جو کچھ اک حقیقت ہے
تصور گر ضرورت سے زیادہ ہو نہیں اچھا

شگفتہ نازلی

(لاہور)

ہو رنگ و نور کا منظر فِضا میں ایسے گھُلے — کہ جیسے خوشبو ہر اک راہرو سے جا کے ملے
کسی بھی منزل کا مجھ کو نہ انتظار رہے — کچھ ایسا ہو کہ سفر میرے ساتھ ساتھ چلے
زمیں زماں کا تصرف نہ مجھ کو یاد رہے — جہاں بھی جاؤں وہاں شام میرے ساتھ ڈھلے
جو دل پہ ہاتھ رکھے، دلجوئی بھی کرتا رہے — اُمید و آس کا کوئی باب تو ہر گام کھُلے
وہ جس کی چاہ میں رستے سنورتے سجتے ہیں — قدم۔۔قدم پہ رہے ساتھ بن کے دیپ جلے
جہاں جہاں بھی ہوں رہ میں کرے ہیں آسودہ — اے کاش! اُن کا وہ سایہ بھی ساتھ ساتھ چلے
کبھی وہ دوشِ ہوا پر شگفتہ، ساتھ رہے — کبھی وہ بن کے کوئی پھول کیاریوں میں کِھلے!

○

خلیق الزماں نصرت

(ممبئی)

آدمی انسان سے حیوان کیسے ہو گیا — ایک زندہ ملک قبرستان کیسے ہو گیا
آگ دینے والے ہی آئے ہیں مجھ سے پوچھنے — ایک پل میں شہر یہ ویران کیسے ہو گیا
کون ہے وہ میرے حق میں جو دعائیں کرتا ہے — سخت مشکل مرحلہ آسان کیسے ہو گیا
اس نے سچ کہنے کی کھائی تھی قسم ہر حال میں — دن کا سورج رات کا مہمان کیسے ہو گیا
یوں تو کہنے کو یہاں گنگا بھی ہے جمنا بھی ہے — نذرِ آتش پھر یہ ہندوستان کیسے ہو گیا
ذہن میں جو ناچتی ہے ایک کرن بے نام سی — بند کمرے میں یہ روشن دان کیسے ہو گیا
ویسے نصرت پائی تھی ورثے میں تیغ بے نیام — خوف ایسی قوم کا عنوان کیسے ہو گیا

○

جنید آزر

(اسلام آباد)

سر اٹھاتی فنا کی بے چینی — اُف یہ خلقِ خدا کی بے چینی
لحظہ لحظہ دہل رہی ہے بقا — بڑھ رہی ہے قضا کی بے چینی
چین پاتی نہیں کسی لمحے — اِس دلِ مبتلا کی بے چینی
کوئی طوفان آنے والا ہے — کہہ رہی ہے فضا کی بے چینی
تھرتھراتی لویں چراغوں کی — اُس پہ اندھی ہوا کی بے چینی
میری پوروں میں آگ بھرتی ہے — تیرے بندِ قبا کی بے چینی
پائے درویش سے لپٹتی ہوئی — دیکھ حیرت سرا کی بے چینی
بارہا لب سے آ کے لپٹی ہے — ایک حرفِ صدا کی بے چینی
ابتدائے سفر میں بھی آزر — ساتھ ہے انتہا کی بے چینی

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

مدتوں کوچۂ ہنر میں رہا — کون کہتا ہے میں سفر میں رہا
میری تنہائی مجھ کو ڈسنے لگی — ایک آسیب، میرے گھر میں رہا
قلتِ آب سے پریشاں ہوں — کوئی آنسو، نہ چشمِ تر میں رہا
وہ چھپاتا رہا، مجھے لیکن — اور میں ہر گھڑی، خبر میں رہا
مجھ کو دیتا ہے، زندگی کی نوید — ایک سودا، جو میرے سر میں رہا

○

سیفی سرونجی
(بھارت)

جب سے ہوا ہے قتل وہ رستہ نہیں جاتا — اب تیری گلی میں کوئی لڑکا نہیں جاتا
ملتے ہیں مقدر سے وفادار جہاں میں — کپڑوں کی طرح دوست تو بدلا نہیں جاتا
سجدہ میں کروں گا تو فقط ایک خدا کو — سر تو ہر اک در پہ جھکایا نہیں جاتا
دنیا کی نہیں کوئی حقیقت یہاں لیکن — پانے کا اسے پھر بھی ارادہ نہیں جاتا
اترا ہو ہمیشہ ہی کسوٹی پہ کھرا جو — اس کو تو کسی حال میں پرکھا نہیں جاتا
کتنا ہی اُڑیں آپ زمیں پر ہی گریں گے — اونچائی کی جانب کبھی دریا نہیں جاتا
نفرت کے دریچوں سے نکلنا بہت مشکل — اِک بار جو پھنس جائے تو نکلا نہیں جاتا

○

رفیع الدین ذکی قریشی
(لاہور)

سرسبز گلستاں کو نظر کس کی کھا گئی — فصلِ بہار ہی میں خزاں کیسے آ گئی
دیوارِ ضبطِ غم کو بھی اشکوں نے ڈھا دیا — کیسی یہ موج آئی جو ساحل کو کھا گئی
اس چشمِ حرص و آز کا دستور دیکھیے — جس دل پہ پڑی گئی اُسے پتھر بنا گئی
طوفاں کا راز، راز ہی رہتا تو کس طرح — ساحل پہ موج موج فسانہ سُنا گئی
جس سمت دیکھتے ہیں شفق رنگ ہے فضا — گردش یہ آسماں کی ستم کیسا ڈھا گئی
اب ماند پڑ رہا ہے محبت کا آفتاب — اک روشنی تھی وہ بھی اندھیرے میں آ گئی
اس بےخودی نے کر دیا دنیا سے بے نیاز — یاد آئی اُن کی اور مری دنیا بنا گئی
اہلِ چمن کو دردِ گلستاں نہیں رہا — رخصت ہوئی بہار تو یہ گل کھِلا گئی
ماضی کی یاد آئی تو آئی ہے یُوں ذکی! — پلکوں پہ میری سلک جواہر سجا گئی

رابعہ گیلانی

(لاہور)

عہدِ رفتہ کی غلطیوں سے سیکھا ہوتا، تو بات ہوتی
صحنِ چمن کی رعنائی کا، نہ رنگ پھیکا ہوتا، تو بات ہوتی

خواب نگر کی رنگینی میں، حقیقتوں کا رنگ بھرتی
تلخ ایام کے آبلوں پر کوئی مرہم ہوتا، تو بات ہوتی

اپنے دکھ پہ دل لہولہو، اوروں کا درد بنا تماشہ
دیارِ دل کو نفرتوں سے پاک کیا ہوتا، تو بات ہوتی

خود ساختہ انا کے زعم میں، اڑ رہا تھا اڑان اونچی
عاجزانہ روش پہ چل کر مجھے بلاتا، تو بات ہوتی

سنا ہے اجاڑ رستوں کی خاک چھانتا ہے وہ اکیلا
بزم میں آ کر سر جھکا کر بیٹھا جاتا، تو بات ہوتی

○

نیاز جیراجپوری

(اعظم گڑھ)

بُھلانے والے کو خود کو بُھلا کر یاد کرتے ہیں
سُنا ہے ایسا بھی اہلِ دِل برباد کرتے ہیں

بطورِ پیروئ شیوۂ اجداد کرتے ہیں
نہیں ہم بُھولتے انکو جو ہمکو یاد کرتے ہیں

ہماری تشنگی پر بھی اَنا کی حکمرانی ہے
کِسی کی جی حضوری اور نہ ہی فریاد کرتے ہیں

تھما دیتے ہیں غالبؔ کا قلم یہ ایروں غیروں کو
یہ کام ادبی سیاست میں کئی نقّاد کرتے ہیں

سیاست میں اُنہیں بھی تازہ دم رکھنا ضروری ہے
جو زِندہ باد مُردہ باد زِندہ باد کرتے ہیں

خُدا رکھ دیتا ہے سب کچھ ہماری بند مٹّھی میں
ضرورت مندوں کی دِل کھول کر اِمداد کرتے ہیں

وہ اِک چہرہ ضرورت بنتا جاتا ہے جو آنکھوں کی
تصوُّر سے اُسی کی ذہن و دِل آباد کرتے ہیں

اِرادہ ہے ترا تو جا بسا لے تُو نئی دُنیا
ترے قول و قسم سے ہم تجھے آزاد کرتے ہیں

نیازؔ اُنکے لئے بے ساختہ دِل سے دُعا نکلے
جو بچّے جستجوئے تیشۂ فرہاد کرتے ہیں

○

سبھاش کپتا شفیق

(ہوشیار پور)

ہر حال میں ہر عہد میں نادان رہا ہوں
میں عشق ہوں اور بے سروسامان رہا ہوں

باہر سے شگفتہ ہوں تر و تازہ ہوں لیکن
اندر سے میں ویران پریشان رہا ہوں

یہ ماں کی دعاؤں کا اثر ہی ہے کہ اب تک
ہر ایک بلا سے جو میں انجان رہا ہوں

اس زندگی نے مجھکو کء رنگ دکھائے
سائل رہا ہوں میں کبھی سلطان رہا ہوں

کچھ دیر میں بے پردہ کرونگا میں کسی کو
قاتل کو ابھی بھیڑ میں پہچان رہا ہوں

سکھ دکھ کو جہاں میں کبھی اپنا نہیں سمجھا
جب تک میں رہا صورتِ مہمان رہا ہوں

○

ڈاکٹر زہت شاہ

(نیویارک)

پھر وقت گزرتے دیکھو گے — حالات ۔۔۔ بدلتے دیکھو گے
وہ وقت بھی ۔۔۔ آخر آئے گا — کہ عمر کو ڈھلتے دیکھو گے
یہ لمحے ریت ۔۔۔ کی مانند ہیں — انہیں ہاتھ سے گرتے دیکھو گے
کبھی خود کو گرتے دیکھو گے — پھر ۔۔۔ آپ سنبھلتے دیکھو گے
یاں روح و حیات و حسرت کو — اک موت سے لڑتے دیکھو گے

○

آفتاب خان

(لاہور)

کچھ اور وبائیں ابھی آئیں گی زمیں پر — سجدوں کے نشانات نہیں سب کی جبیں پر
جب ظلم کا سکّہ چلے بازار ہوس میں — پاتے ہیں نمو دکھ کے جراثیم کہیں پر
آتے ہوئے طوفاں کا کسی کو بھی نہیں خوف — خوش خواب ہیں سب آج کے لمحات حسیں پر
ہر دور کا انسان عذابوں میں گھرے گا — ہونا ہے حساب اُس کے گناہوں کا یہیں پر
توبہ کی رِدا تان کے روتا ہے بشر جب — ہوتا ہے بہت شاد خدا عرش بریں پر
پہنا ہے یہاں جس نے شریعت کا لبادہ — کب تیر چلاتا ہے کسی قلب حزیں پر
ہر فرد کہاں جان سکے رمزِ محبت — کھُلتے ہیں یہ اسرار کسی خاک نشیں پر

○

وشال کھٹکر

(لدھیانہ)

اک اکیلا، کہاں کہاں ہوتا — بن کے سورج کہیں عیاں ہوتا
بادلوں سا، ہواؤں کی زد پر — کاش! میں بھی یہاں وہاں ہوتا
کون جانے کہ دل پہ کیا گزری — آگ لگتی، نہ یہ دھواں ہوتا
ہر کہانی بہ اعتبار سنی — ہر کہانی میں تُو نہاں ہوتا
ایک تصویر سے اُبھر آتی — لفظ، ماتنِ حق بیاں ہوتا
عادتاً خود کی میں کہوں کھٹکر — فطرتاً جان کا زیاں ہوتا

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (ایم اے)

آخری قسط

میں روتا رہا اور باپو مجھے سینے سے لگائے میری پیٹھ سہلاتے رہے۔ میری آنکھیں خشک ہوئیں تو میں نے ان کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا تو باپو مجھے خاصے عمر رسیدہ اور لاغر نظر آئے۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے باپو؟ آپ اتنے کمزور کیوں لگ رہے ہیں اور آپ اچانک اتنے بوڑھے کیوں لگنے لگے ہیں؟ میں نے کئی سوال ایک سانس میں کر ڈالے تو وہ بولے۔ تمہیں دیکھے دس برس ہونے کو آئے ہیں رامو بیٹے۔ دس برس؟ میں نے باپو کی بات پر حیران ہو کر کہا۔ ہاں! پورے دس برس، باپو اپنی سانس درست کرتے ہوئے بولے۔ پچھلے دس برس سے دیوتا تیرا امتحان لے رہے تھے۔ میرا امتحان؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو باپو بولے، ہاں! تمہارا امتحان۔ مگر کیوں؟ میں نے پوچھا۔ اس لیے کہ جتنا کڑا امتحان ہوتا ہے اتنی لمبی تیاری ہوتی ہے اور اُتنا ہی بڑا اجر ہوتا ہے، باپو بولے تو میں نے کہا، مجھے کسی سے کوئی اجر نہیں چاہیے، باپو۔ دیوتاؤں نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا ہے۔ تمہاری یہی باتیں تمہارے امتحان میں پورا اترنے کی دلیل ہیں بیٹے، باپو اُکھڑی سانس لے کر بولے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے باپو۔ آپ ایسے سانس کیوں لے رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ اب اپنے چل چلاؤ کا سمے بھی آ گیا ہے نا۔ اس لیے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ اب تم آ گئے ہو تو مجھے جانے میں آسانی ہوگی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، آپ کو کیسے معلوم تھا کہ میں آنے والا ہوں؟ اوپر والا آنکھوں اور دل کے دروازے کھول دے تو پھر سنسار کا کچھ چھپا نہیں رہتا۔ جو فیصلہ تم نے لڑکی کے سامنے کیا ہے اس پر دونوں دیویاں تم سے خوش ہوئی ہیں۔ تم نے اپنے لیے ٹھیک راہ چنی ہے اور تمہیں اپنی آگاہی بھی ٹھیک سے ہوئی ہے۔ تمہارے جیون کا مقصد واقعی دوسروں کی سیوا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس بار نہ تم نے مجھ سے کوئی شکوہ کیا ہے اور نہ ہی تمہیں مجھے کھونے کے خدشے کا دکھ ہوا ہے۔ تمہارا یہ رویہ انسان کی ذہنی پختگی کی معراج ہے۔ آج تم وہ سب کچھ سننے اور اس کو برداشت کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو جس کے لیے تمہیں پچھلے دس برس سے تیار کیا جا رہا تھا اور میں تمہیں اب سے پہلے بتانے کی سکت نہیں رکھتا تھا، باپو نے مجھے اپنے پاس زمین پر بٹھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا، کیا سننے اور برداشت کرنے کی سکت باپو؟ وکیلنی کے گھر تمہارے بے ہوش ہونے بعد سے یہاں یعنی بنوں بی بی کے ڈیرے میں جاگنے کے درمیانی وقفے کے واقعات، باپو نے کہا۔ میں نے پوچھا، کیا آپ ماریہ کے گھر میرے بے ہوش ہونے کا سبب جانتے تھے باپو؟ تم نے ہی تو مجھے کلکتہ فون کر کے بتایا تھا۔ باپو مسکرا کر بولے اور پھر کہا، اچھا اب تم تفصیل سے سنو۔

پطرس میاں نے تمہارے نانا کو فون کر کے بتایا تھا کہ تم ان کی بیٹی کی میت پر ان کے گھر اچانک بے ہوش ہو گئے ہو۔ چند منٹوں بعد تمہیں ہوش آ گیا تھا اور گھر پہنچ کر تم نے سب سے پہلے مجھے کلکتہ فون کر کے اپنے زہریلے ہونے کے ساتھ ساتھ نیتو سے شادی نہ کرنے کی بات کی تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ نیتو کے علاوہ تم ہر عورت کے لیے زہریلے ہو۔ نیتو کے علاوہ کیوں؟ میں نے باپو کو بیچ میں ٹوکا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے، تم نے فون پر میرا جواب سن کر بالکل ایسے انداز میں مجھ پر سوال کیا تھا۔ ہاں نیتو کے علاوہ، باپو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، نیتو کی رگوں میں تمہارا خون دوڑ رہا تھا نا اس لیے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ میں خون دینے کے بعد کسی بھی عورت کو اپنا سکتا ہوں؟ میں نے پوچھا تو باپو نے جواب دیا، ہاں۔ میں نے ایک اور سوال داغ دیا، کیا آپ بھی میری طرح زہریلے ہیں باپو۔ ہاں رامو بیٹے! ہر شمان ایک زہریلا انسان ہوتا ہے۔ شمان ہونے کی پہلی شرط ہی زہریلا پن ہے، باپو کے جواب پر میں نے ایک اور سوال کر دیا، تو کیا آپ بھی اپنے زہریلے پن کی وجہ سے برہمچاری ہیں باپو؟ نہیں! میں برہمچاری پہلے تھا زہریلا بعد میں ہوا ہوں۔ تمہارے اور میرے زہریلے پن میں صرف ایک فرق ہے کہ میں نے اپنے لیے خود ہی یہ راستہ چنا تھا اور دیوتاؤں نے تمہارے لیے یہ راستہ چنا ہے۔ میں نے برجستہ کہا، لیکن دیوتاؤں نے میرے لیے یہ راستہ کاہے کو چنا ہے؟ میرے خیال کے مطابق تو دیوتاؤں نے ہمیں اس جیون مین خود مختار بنا کر راہ چننے کی آزادی دی ہے۔ باپو بولے، عوام کو اپنی راہ چننے کی آزادی ہے خواص کو نہیں ہے۔ خواص کو اوپر والا چنتا ہے۔ موسیٰ کو وہِ طور پر آگ لینے گیا تھا لیکن اسے پیغمبری دے بھیجا اور پیغمبری دیتے وقت اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آیا وہ لینا چاہتا ہے یا نہیں۔ بس اسے کہا تھا کہ میں نے تمہیں چنا ہے اور اب تم بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی دلواؤ۔ باپو کی دلیل سن کر میں نے کہا، اگر یہ بات ہے تو پھر، آپ نے نیتو سے میری سگائی کیوں کی تھی اور آپ میرے بیاہ کی تیاری کرنے نیتو کے ہاں کلکتہ کیوں گئے تھے؟ اس وقت تک مجھے تمہارے انت (انجام) کا علم نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تمہاری شادی کے بعد ہوا تھا۔ میری شادی؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری شادی کب اور کس سے ہوئی تھی باپو؟ باپو بولے، ایک شادی نہیں دو! تمہاری شادی نیتو اور روپا سے ایک ساتھ ہوئی تھی۔ کیا؟ میرے منہ سے اتنی لمبی ''کیا'' سن کر باپو بولے، نیتو سے تمہاری بات پہلے سے طے تھی۔ جب میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا کہ نیتو کے علاوہ تم ہر عورت کے لیے زہریلے ہو تو تمہیں اطمینان ہو گیا تھا۔ تم خوش بھی تھے اور اندر سے خوفزدہ بھی تھے۔ تم بار بار کلکتہ فون کر کے اپنے زہریلے پن کا ذکر کرتے اور میں ہر بار تمہیں یقین دلاتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہوگا۔ تم فکر مت کرو۔ لیکن مجھے یہ سب یاد کیوں نہیں ہے باپو؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بولے، اس کی وجہ میں تمہیں آگے چل کر بتاتا ہوں۔ اچھا اب تم مجھے درمیان میں مت ٹوکو تا کہ میں تمہیں سب کچھ ایک سانس

میں بتا سکوں۔تمہارے ٹوکنے سے میری سانس ٹوٹتی ہے تو تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔دُور سے آنے والے مہمان شادی سے چند روز پہلے پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ پاکستان سے تمہاری دو پھوپھیاں بھی شادی میں شرکت کرنے آئی تھیں۔افریقہ سے تمہاری دادی بنوں بی بی اپنے پریوار کے ساتھ کلکتہ آئیں تو میں نے اپنا سران کے قدموں میں رکھ کر انہیں بتایا تھا کہ وہ میری دیوی ہیں۔ پھر ہم نے ان سب کو شادی سے ایک ہفتہ پہلے اکرام اور جینا کے ساتھ کانپور بھجوا دیا تھا۔

روپا نے اپنی ماتا کو افریقہ میں تمہارے جانے کے بعد بتایا تھا کہ وہ تمہیں پیار کرتی ہے اور وہ تمہاری پتنی بننا چاہتی ہے تو رانی نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے پتی رامو کے مسئلے پر روپا کے لیے ہندوستان جا کر بات کرے گی۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہیں ارمہ کے بیٹے صیام کے ملنے اور اس کے بیاہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے بات کو شادی کے بعد تک ملتوی کر دیا۔راجہ امرناتھ اپنے پریوار کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے اسی دن کانپور پہنچے تھے جس دن تمہارے دادکے کلکتہ سے پہنچے تھے۔روپا اور اس کے گھر والے تمہیں یعنی رامو کو وہاں دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔جب انہیں تمہاری حقیقت معلوم ہوئی کہ تم ہی ارمہ کے کھوئے ہوئے بیٹے صیام ہو تو انہوں نے سب کو بتایا کہ تمہاری ماتا جی انیس ورش پہلے تمہاری سگائی روپا سے کر گئی تھی۔

باپو کو درمیان میں ٹوک کر ان کی سانسوں کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے بڑی مشکل سے اپنی حیرت زدہ چیخ روکی۔اس کوشش میں اپنے منہ ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گیا۔باپو کہہ رہے تھے، لانی پارو تمہاری ماتا کی عزیز ترین شریکِ راز سہیلی تھی۔اسی رانی پارو نے تمہارے نانا کو سب سے پہلے اس کی شادی کی خبر بھی سنائی تھی۔پارو نے تمہیں ماتا جی کا وہ خط بھی دکھایا تھا جو اس نے روپا کی پیدائش پر پارو کو لکھا تھا۔خط میں ارمہ نے روپا کی پیدائش کی مبارک باد دیتے ہوئے پارو سے روپا کو تمہارے لیے مانگا تھا اور رانی اور راجہ دونوں نے اس رشتے پر ہاں کر دی تھی۔ارمہ کی جوڈائری تمہاری بہن جینا کے پاس تھی اس کے آخری صفحے پر اس سگائی کے بارے میں تمہاری ماں کے ہاتھوں کا اندراج موجود تھا۔اس کے بعد اس ڈائری میں کچھ درج نہیں تھا۔جس کا مطلب تھا کہ ڈائری پر آخری اندراج کرنے کے بعد وہ ہندوستان آ گئی تھی۔ جہاں اس کے ساتھ کیلاش والا حادثہ پیش آیا تھا۔ڈائری پر اندراج کے مطابق روپا سے تمہاری سگائی تمہاری ماں کی آخری وصیت تھی۔تم ایک جانب سے نیتو کے پیار اور دوسری طرف سے اپنی ماں کی آخری وصیت کے ساتھ روپا کے پیار سے بٹنے لگے تھے۔

شادی سے چھ روز پہلے تم نے مجھے کلکتہ فون کر کے نئی تفصیل بتائی تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ راجے ایک سے زیادہ پتنیاں کرتے ہیں۔تم دونوں سے بیاہ کر لو۔اس سلسلے میں تم نیتو اور روپا کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع دو۔ اگر دونوں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ بانٹنے پر راضی ہو جائیں تو تم روپا کو اپنا خون زہر کے تریاق کے طور پر دو گے۔ان میں سے جو تمہیں بانٹنے کو تیار نہ ہو تم اس سے شادی نہ کرنا۔تم نے روپا اور اس کی ماتا کو میرا پیغام دیا تھا۔روپا کے والد مہاراج امرناتھ کی اپنی بھی پانچ پتنیاں تھیں اس لیے روپا اور اس کے والدین نے اسی وقت ہاں کر دی تھی۔میں نے نیتو اور اس کے والدین کو کلکتہ میں پہلے سے تیار کر لیا تھا۔تم نے روپا کے والدین کو نیتو کے ہاں کلکتہ بھجوایا تھا۔ جہاں میری موجودگی میں روپا اور نیتو نے ایک گھنٹے تک باتیں کیں اور دونوں نے ایک ساتھ تمہاری پتنیاں بننا منظور کیا تھا۔مجھے نیتو کے وہ الفاظ آج بھی یاد ہیں جو اس نے تمہارے بارے میں روپا سے کہے تھے۔اس نے کہا تھا کہ صیام کی ماتا کی آخری وصیت ضرور پوری ہو گی اور تم بھی میری طرح اس کی پتنی بنو گی۔اُس نے افریقہ سے واپسی پر مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔صیام ایک چھتنار پیڑ کی طرح ہم دونوں پر اپنے پیار کا سایہ کرے گا۔

لیکن مجھے یہ سب یاد کیوں نہیں ہے باپو، صبر کا دامن چھوٹا تو میں نے حیرت سے ایک بار پھر پوچھا تو وہ بولے، ذرا صبر کرو، تمہیں کہا ہے نا کہ اس کی وجہ تمہیں آگے چل کر بتاتا ہوں۔اچھا اب درمیان میں نہیں بولوں گا۔میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔باپو نے اپنی بات آگے بڑھائی، ہم سب کلکتہ سے تمہارے لیے ایک کی بجائے دو دلہنیں لے کر شادی سے دو روز پہلے کانپور پہنچے تھے۔طے پایا تھا کہ دونوں شادیوں کو دو دن کے وقفے سے بھگتایا جائے گا۔ پہلے تمہارا بیاہ نیتو سے ہو گا پھر دو دن بعد روپا سے۔نیتو سے تمہاری شادی کے دن ہم نے روپا کو تمہارا خون یہ بہانہ بنا کر دیا تھا کہ پتنی کو پتی کا خون دینا شانوں کی ریت ہے۔نواب ادریس خان اپنے گھر والوں کے ساتھ آئے تھے اور ہاں تمہاری شادی میں گوبیندر جی کا پریوار بھی شامل تھا۔تمہارے نانا نے شادی کے روز کانپور کا سارا شہر کسی دلہن کی طرح سجایا تھا۔انہوں نے تمام شہر کے باسیوں کو شادی کے کپڑے بھی بنوا کر دیئے تھے۔شادی کی رات تو دُولہا کے روپ میں شہزادے لگ رہے تھے اور کیا بتاؤں کہ نیتو کیسی دلہن بنی تھی۔تمہاری جوڑی ایک عجیب جوڑی تھی جس پر سارا کانپور صدقے اور واری جا رہا تھا۔ پہلے تمہارا مسلمانوں والا نکاح ہوا تھا پھر برہمنوں والے ساتھ پھیرے ہوئے تھے۔ دلہن کے پاس جانے سے پہلے تم ایک بار پھر میرے پاس تنہائی میں آئے تھے تو میں نے تمہیں پیار سے ڈپٹ کر کہا تھا، تم اچھے وقت کو بُری سوچ میں کاہے کو برباد کر رہے ہو۔دلہن تمہاری راہ تک رہی ہے اور تم ہو کہ ابھی تک باہر پھر رہے ہو۔ چلو اندر جاؤ۔پھر میں خود ہی تمہیں دلہن کے کمرے میں دھکیل آیا تھا۔

دوسری صبح تم اور نیتو جب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناشتا کرنے کے لیے اپنے کمرے سے نکلے تو تم بار بار نیتو سے پوچھتے رہے کہ آیا اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے اور وہ تمہیں مذاق مذاق میں جواب دے رہی تھی، ساری رات جگا کر اب میری طبیعت کا پوچھتے ہو۔تمہاری دادی نے تم دونوں کی نظر اتاری تھی۔تم دونوں کی باچھیں کھلی تھیں اور تم ایک دوسرے کو دیکھ کر بار بار مسکراتے تھے۔پھر تم

نے مجھے بتایا تھا،تم ٹھیک کہتے تھے باپو، نیتو کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور ٹھیک ہی رہے گی رے، میں نے جواب دیا تھا۔ وہ دن تم نے خوشی اور اندرونی ڈر کے تذبذب کی کیفیت میں گزارا تھا۔ سہ پہر کو جب نیتو عورتوں کے درمیان دلہن بن کر بیٹھی تو تم ہر پانچ دس منٹ بعد کسی بہانے جا کر دیکھ آتے تھے کہ وہ خیریت سے تو ہے۔ اس حرکت پر تمہاری دونوں بہنیں تمہیں آتے جاتے چھیڑتی تھیں۔ ایک بار جینا نے کہا تھا، اتنی بے صبری اچھی نہیں ہوتی بھیا۔ اب ہمیں جی بھر کر دیکھنے دو۔ بھابھی ساری رات کے لیے تمہارے پاس ہوگی۔ تم نے ہنس کر اسے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی تم اسے بتا سکتے تھے کہ تم کس لیے بار بار اسے دیکھنے آتے ہو۔ ایک بار سارہ نے کہا تھا، اگر اب کی بار عورتوں میں آئے تو میں بھابھی کو رات دیر سے کمرے میں بھیجوں گی۔ تم نے کہا تھا، اچھا بابا اچھا، اب نہیں آؤں گا۔ میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ نیتو ٹھیک تو ہے۔ بھابھی ابھی تک تو ٹھیک ہے۔ اگر تم پھر آئے تو میں اسے خراب کر دوں گی۔ اس نے ہنس کر کہا تھا اور تم ہنستے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ نیتو کے سنگ دوسری رات گزارنے کے بعد تم اندر سے بھی مطمئن ہو گئے تھے اس لیے پہلی رات سے بھی زیادہ خوش تھے۔ دوسرے دن نیتو، جینا اور سارہ نے روپا کو تمہارے لیے سجایا تھا۔ اس دن مہاراج نے کانپور کے تمام شہر کو دعوتِ ولیمہ پر بلایا گیا تھا۔ تمہاری اور روپا کی جوڑی نے سارے شہر کا دل موہ لیا تھا۔ رات تم پہلی شادی والی رات کی طرح نروس نہیں تھے اور مجھے بھی بار بار پریشان نہیں کر رہے تھے۔ تیسرے دن تمہارے نانا نے پھولوں میں سجی ہوئی ایک بگھی پر تم تینوں کو سارے شہر میں ایک جلوس کی صورت تین گھنٹوں تک پھرایا تھا۔ بگھی میں تمہارے داہنے ہاتھ کی جانب روپا اور باہنے ہاتھ کی جانب نیتو بیٹھی تھی۔ کوچوان ہولے ہولے بگھی چلا رہا تھا اور لوگ اپنے گھر کی چھتوں سے اور کھڑکیوں سے تم پر پھول برسا رہے تھے۔ نیتو اور روپا ایک دوسرے سے بہنوں کی اور سہیلیوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیسرے دن سارے بھون میں ایسے پھر رہی تھیں کہ انکی ایک دوسرے سے محبت دیکھ کر مجھے تمہاری تقدیر پر ناز ہوتا تھا کہ بھگوان نے تمہیں کیا سے کیا دیا ہے۔ چوتھے دن مہمان جانا شروع ہو گئے تھے۔ وکرم بابو نے مہاراج سے جارے کی آ گیا چاہی تو مہاراج نے سب سے کہا تھا، میں نے بنوں بی بی کے دُوارے سُکھ (منّت) مانی تھی کہ اپنے نواسے کی جج (بارات) لے کر بنوں بی بی کے ڈیرے پر آؤں گا۔ اس لیے ہم تمام لوگ کل ایک بس میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر جا کر سُکھ پوری کریں گے۔ اس کے بعد آپ لوگ چلے جائیں۔ ٹام نے تم تینوں کے ہنی مون کا انتظام پیرس میں کیا تھا۔ طے پایا تھا کہ سُکھ کے دو ہفتے بعد تم لوگ ہنی مون کے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔

چوتھے دن ہم چنیدہ باراتیوں اور اپنے پریوار کو لے کر ایک بس میں بیٹھ کر بنوں بی بی کے ڈیرے کو روانہ ہوئے تھے اور دوسری بس میں پرشاد پکانے والے تھے۔ ڈیرے پر دس دیگوں کی پرشاد پکا کر تمام شمانوں اور یاتریوں کو دو دن تک کھلائی گئی تھی۔ تیسرے روز آنند جی نے تمہیں اور مجھے رُکنے کو کہا تھا اور ہم دونوں کے علاوہ باقی باراتیوں کو جانے کی آ گیا دے دی تھی۔ آنند جی نے تمہیں بتایا تھا کہ بنوں بی بی اور مناسہ نے تمہیں ڈیرے پر ساتا (سات روز کا مراقبہ) کاٹنے کی ہدایت دی ہے۔ تم نے خوشی خوشی سب کو بھجوا دیا تھا۔ وکرم نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد گاڑی بھجوا کر تمہیں بلوا لے گا۔ باپو نے یہاں آ کر ایک گہری سانس لی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کہنے لگے، تمہارے رُکنے کی اصل وجہ ہمیں ان کے جانے کے تین روز بعد سمجھ میں آئی۔ کیا وجہ تھی باپو؟ میں نے باپو کی کیفیت دیکھتے ہوئے حیرت سے سوال کیا تو وہ بولے۔ وہ بس جس میں تمہارے پریوار کے تمام لوگ سوار تھے واپس جاتے ہوئے ایک اندھے نالے میں طغیانی کی نظر ہو گئی تھی۔ مرنے والوں میں تمہاری دو پتنیاں اور ان کے پریوار کے تمام لوگ، تمہارے نانا، تمہارے دادا کا سارا خاندان، تمہاری بہنیں اور ٹام کے علاوہ کئی اور لوگ تھے۔ بس کے پدھاریوں (سواریوں) کی تعداد پینتیس سے اوپر تھی۔ مرنے والوں میں سے کسی کی لاش نہیں ملی تھی۔ قیاس ہے کہ پانی کا ریلہ انہیں سمندر (خلیج بنگال) میں بہا کر لے گیا تھا۔ (سندر بن کے علاقے میں کئی کلو میٹرز چوڑے اور سیکڑوں کلو میٹرز لمبے کئی بارانی نالے اندھے نالے کہلاتے ہیں۔ یہ نالے سردیوں کے دنوں میں تقریباً خشک رہتے ہیں لیکن مون سون کی بارش اور دریا کی طغیانی کیدنوں یہ پانی سے بھر کر ایک سونامی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان نالوں کا پانی سو کلو میٹر سے اوپر کی رفتار سے بہتا ہوا اور اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو ملیامیٹ کرتا ہوا خلیج بنگال میں جا کر گرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس علاقے میں پکی سڑکیں اور پُل نہیں بنائے جا سکتے۔ عام طور پر بسیں اور گاڑیاں ان نالوں میں کچے راستوں سے ہو کر جاتی ہیں جو کبھی کبھی اچانک سامنے آنے والے پانی کے ریلے میں بہہ کر سواریوں کے ساتھ گم ہو جاتی ہیں۔ ہر سال سندر بن کے ان علاقوں میں سیکڑوں لوگ بسوں میں سفر کرتے ہوئے اندھے نالوں کی طغیانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہہ جانے والے لوگوں کی لاشیں تک نہیں ملتیں۔ کبھی کبھار بسوں، گاڑیوں یا سامان کی باقیات پانی کے اُتار کے بعد کہیں کہیں گری پڑی اور بکھری نظر آتی ہیں۔

چند لمحوں کے لیے میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا اور مجھے رگوں میں خون کی بجائے تپتا ہوا سیسہ گردش کرتا ہوا محسوس ہوا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر باپو کو دیکھا تو ان کی سانسیں بھی غیر متوازن تھیں۔ باپو نے بھی میری کیفیت محسوس کی لیکن میں خاموش رہا تو انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی، یہ خبر اتنی ہیبت ناک تھی کہ عام حالات میں تمہاری برداشت سے باہر ہوتی۔ آنند جی اور میں نے بنوں بی بی کے مشورے سے فیصلہ کیا تھا کہ یہ خبر تم سے اس وقت تک چھپائی جائے جب تک تم اسے برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے تمہیں دس سال کی تپسیا کرائی گئی تا کہ تم میں یہ خبر سننے کی سکت پیدا کی جائے۔ تمہاری یادداشت بھلانے کے لیے میں اندرون جنگل سے بھولن بوٹی لایا تھا (بھولن بُوٹی سندر بن میں پائے جانے

والا ایک ایسا خودرو پودا ہے جس کو کھانے سے کسی حد تک یادداشت سلب ہو جاتی ہے۔اس بُوٹی میں (Gama hydroxy-butyrolactone. GBL) کی طرح کا ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے۔امریکہ میں اس بُوٹی سے نچوڑے ہوئے عرق کو کیمیائی طور پر (Gama hydroxy-butyric acid - GHB) میں تبدیل کرنے کے بعد اسے (Date Rape Drug) ڈیٹ ریپ ڈرگ کے طور پر غیر قانونی استعمال کیا جاتا ہے۔ بے بُو اور نمکین ذائقہ کے اس عرق کو شراب، پانی یا کسی جوس وغیرہ میں ملا کر عورتوں کو دے کر ان کی مرضی کے بغیر بدفعلی کی جاتی ہے۔ہوش میں آنے کے بعد بے چاری عورتوں کو کچھ یاد نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کیا سانحہ بیت چکا ہے۔)

جس دن ہمیں اس حادثے کی اطلاع ملی تھی تمہیں ساتا کاٹے ہوئے تیسرا روز تھا۔ساتے کے دوران میں تمہارے لیے کھانا لا کر رکھتا تھا۔میں نے کھانے میں یہ بُوٹی ملا کر تمہیں کھلانا شروع کر دی۔بھُولن بُوٹی کے چھ ماہ کے مسلسل استعمال کے بعد میں وکیلنی کے ہاں سے بے ہوش ہونے کے بعد تک کے تمام واقعات تمہارے ذہن سے محو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوش میں آنے پر تم سب سے پہلے مجھے دیکھو اور وہی سوال کرو جن کو بھلانے کے لیے مجھے تم پر چھ ماہ کی مشقت کرنا پڑی تھی۔اس لیے میں نے خود در پردہ رہ کر تمہارے ہوش میں آنے کے بعد آنند جی کو آگے رکھا تھا۔تم پچھلے دس سال سے بنوں بی بی کی مالا جپتے رہے ہو۔ٹیپو سلطان کا اثاثہ اس کے حقداروں تک پہنچانا تمہارے امتحان کے سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ بھاگاں کو ہم نے پہلے سے وہاں بھجوا دیا تھا۔لڑکی سے تمہاری گفتگو سننے کے بعد آج ہی دیوئیوں نے مجھے تمہیں سب کچھ بتانے کی آگیا دی ہے۔اسی لیے لڑکی کے خیمے سے نکلنے کے بعد تو نے وہاں مناسہ کی خوشبو سونگھی تھی۔

باپو کی بات سچی تھی۔اگر یہ اندوہناک خبر جس نے میرا ہنستا بستا گھر پل بھر میں اجاڑ دیا تھا، مجھے حادثے کے وقت دی جاتی تو میری برداشت سے باہر ہوتی۔ دس سال گزرنے کے بعد میں اسے دیوئیوں کی کرپا سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ خبر سنانے کے لیے مجھے مسلسل دس سال تک تیار کیا تھا۔ مجھے اتنے بڑے حادثے کا دُکھ تو تھا لیکن میری آتما کو عجیب سی شانتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیون کا ہر راستہ موت کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا ہے۔مرنے والوں کا اسے ماتم کرنا چاہیے جسے خود نہ مرنا ہو۔ میں باپو کے بے ترتیب سانسوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اب وہ بھی میرے پاس زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے۔ بہت سے لوگ چلے گئے ہیں تو کیا ہوا، میں بھی دوسروں کی طرح ایک دن چلا جاؤں گا اور پھر میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ میرے پاس بھگوان ہیں، دیویاں ہیں، دیوتا ہیں۔ میرے پاس مجھے پیار کرنے والوں کی حسین یادیں ہیں۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے باپو کو دیکھا جو میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔ کیا سوچ رہے ہو را موبیٹے؟ کچھ نہیں باپو، مرنے والوں کا ماتم کرنا میری کم ظرفی ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کس منہ سے دیوئیوں کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے مجھے یہ خبر سنانے کے لیے اب تک نہ جانے کتنے جتن کیے ہیں۔ میں نے بڑے تحمل سے جواب دے کر اپنے آس پاس نگاہیں دوڑائیں تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں اس وقت بنوں بی بی کے ڈیرے پر تمام شمانوں میں گھرا تھا۔

مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی بیٹے۔ پھر باپو نے اکھڑی سانس لے کر کہا، اب مجھے جانے میں آسانی ہوگی۔اس کے بعد انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اونچا کیا اور سب شمانوں سے کہا تم سب گواہ رہو۔ بنوں بی بی نے مجھے آگیا دی ہے کہ میرے بعد را مو بڑے بابا کی مسند پر بیٹھے گا۔سب شمانوں نے ایک ساتھ کہا، ہم سب گواہ ہیں۔ پھر سب سے پہلے آنند جی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے بڑے بابا تسلیم کر کے بیعت کرنے کے بعد مبارک دی۔اس کے بعد سب شمانوں نے باری باری میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ کر میری بیعت کی۔شمانوں کی بیعت سے فارغ ہو کر میں باپو کی جانب متوجہ ہوا تو وہ پرلوک سدھار چکے تھے۔ان کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ تھی۔ باپو کی چتا کو میں نے ہی آگ دکھائی تھی اور ان کی راکھ بنوں بی بی کے ڈیرے کے پاس میں نے زمین میں دبا دی۔جن کا ماضی حسین ہو انہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے زیادہ دکھ ہوتا ہے اور جن کا ماضی تلخ ہو انہیں بھی کم دکھ نہیں ہوتا۔ پچھلے کئی برس سے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا ترک کر دیا تھا اور پھر پیچھے دیکھنے میں رکھا ہی کیا تھا۔ چند باتیں، چند یادیں۔ میں نے بھی اپنے تلخ اور حسین ماضی کی یادوں کو باپو کے ساتھ ان کی چتا میں رکھ کر جلا دیا تھا اور باپو کی راکھ کے ساتھ زمین میں دبا دیا تھا۔ بڑے بابا کی مسند نہ کسی کو رشوت سے ملتی ہے اور نہی سفارش سے۔ باپو نے مجھے یہ مسند اپنا لے پالک ہونے کے ناطے بھی نہیں دی تھی۔اس مسند کے لیے مجھے دیوی اور دیوتاؤں نے برسوں امتحانات کی چکی میں پیسا تھا۔انہوں نے مجھے اندر اور باہر سے پہلے اچھی طرح کھنگالا تھا۔ پھر کھرچ کھرچ کر صاف کیا تھا۔صاف کرنے کے بعد مجھے دولت کے لالچ سے لے کر شہوت کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھا تھا۔تب کہیں جا کر مجھے یہ سب کچھ ملا تھا۔اگر میں کسی مقام پر ان کے معیار پر پورا نہ اترتا یا کسی جگہ دولت یا شہوت کی لالچ میں اپنے جیون کو کوئی دوسرا موڑ دینے کی کوشش کرتا تو دیوتا میری بجائے کسی اور کو یہ مسند عطا کر دیتے۔

باپو میرے اوپر بڑے بابا کی ذمہ داری ڈال گئے ہیں۔ بڑی ذمہ داری کا تقاضا بھی بڑا ہوتا ہے۔اس لیے میں نے دنیا کی خواہشات کی ساری کھوٹ اپنے من سے نکال کر پھینک دی ہے۔میری نظروں میں دنیا اور اس کا سب کچھ ایک خواب یا ایک سراب ہے۔ایک ایسا خواب جو جاگ جانے سے ٹوٹ جاتا ہے اور ایک ایسا سراب جو قریب جانے سے اور دُور چلا جاتا ہے۔خوابوں کے پیچھے جانے والا بیدار ہو کر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے اور سراب کے پیچھے دوڑنے والا بھول بھلیوں میں گم جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اس دنیا میں سدا رہنے کے لیے نہیں آئے انسان دنیا دنیا کی رٹ لگائے جب موت کی دہلیز پر پہنچ کر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ میں نے دنیا کو اور دودنیا والوں کو طلاق دے کر اپنے لیے جو راہ چنی ہے اس

کا ہر لمحہ دنیا میں موجود تمام سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی مالیت سے بھی فزوں ہے۔ اس راہ میں چلنے والا جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو وہ خود کو سکونِ قلب کی دولت سے مالا مال پاتا ہے۔ تارکِ دنیا لوگ دنیا داروں کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے سیانے پاگلوں کو پاگل خانے میں بے تکی حرکتیں کرتے دیکھتے ہیں۔ ایسے پاگل جو خود کو دانا تصور کرتے ہوئے دنیا کی لوٹ گھسوٹ میں مصروف ہو کر دنیا کی حقیقت بھُلا بیٹھتے ہیں۔ لوٹ کا یہ مال ان کے لیے جسمانی آرائشیں اور روحانی آلائشیں بن کر ان کو اندر سے گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ موت کی دہلیز پر وقت کی رائیگانی کا خوف انکا استقبال کرتا ہے۔ اس کے برعکس تیاگوں کے لیے موت ایک ایسا دروازہ ہے جہاں پر راحتِ جان ان کی منتظر ہوتی ہے۔ یہ مقام حاصل کرنے کے لیے وقت کے ریلے مجھے بہا کر جن جن راہوں میں بھی لے گئے میں ہنس کر گیا تھا۔ اس کے صلہ دیوتاؤں نے مجھے وہ کچھ دیا ہے کہ اب میری آواز سننے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے یاتریوں کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے۔ میں جس سے بات کرلوں وہ خود کو بھاگیاوان سمجھنے لگتا ہے۔ میں جس کی جانب دیکھ لوں اس پر دولت کی دیوی مہربان ہو جاتی ہے۔ میں جس کے جسم پر ہاتھ پھیر لوں وہ جسم تمام بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے اور میرے بدن کو چھونے والے پوتر ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ مجھے دنیا اور دنیا والوں کو چھوڑنے کے بعد ہی ملا ہے۔ اگر مجھے ایک لاکھ بار اس دنیا میں کسی بھی روپ میں بھیجا گیا تو بھی میں اپنا ہر جیون اسی جیون کی روشنی میں گزاروں گا۔

آج کل میں شب و روز بنوں بی بی کی مالا جپنے میں مصروف رہتا ہوں اور وہ مجھے اپنے درشن کرانے میں کنجوسی نہیں برتتی۔ دیویاں اور دیوتا ہر شب میری کٹیا میں مجھے ایسے ملنے آتے ہیں جیسے عام لوگ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں۔ دیوتا میری زبان سے نکلی ہوئی ہر بات ایسے پوری کرتے ہیں جیسے وہ ان کی زبان سے نکلی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب لوگ تیاگی ہو کر میری طرح جنگلوں میں رہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ دنیا داری میں قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ میں نے اپنی سوانح دنیا والوں کو یہ سمجھانے کے لیے لکھی ہے کہ مشکلات اور دکھوں کا راستہ ہی اصل میں فلاح کا شانتی کا راستہ ہے۔ اس لیے غموں کی راہ میں رنجیدہ ہونے کی بجائے منزل پر پہنچنے کی راحت کے بارے میں سوچ کر مسکرایا کرو۔ غصہ کرنے کی بجائے پیار بھری دعائیں دیا کرو۔ غیر ضروری باتوں کی بجائے کام کی باتیں کیا کرو۔ کانٹے بچھانے والوں کی راہوں میں پھول بچھایا کرو۔ کسی کو آنسو دینے کی بجائے کسی کے آنسو پونچھ لیا کرو۔ دوسروں کو موت کی بجائے جیون دو۔ جو رزق تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے وہ تمہیں ہر حال میں ملے گا۔ جو تمہارا نہیں ہے اس کے پیچھے مت دوڑو۔ جب رزق ملے تو شکر کرو اور دوسروں سے بانٹ کر کھاؤ۔

اب میں ساٹھ کے پیٹے میں ہوں اور مجھے بڑے بابا کی مسند پر بیٹھے ہوئے معلوم نہیں کتنا سمے بیتا ہے۔ جیون کے روز و شب میں روز سورج نکلتا اور ڈوبتا رہتا ہے۔ موسم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ میں ہفتے کے چھ روز بنوں بی بی کی مالا جپتا رہتا ہوں۔ شنی وار کے دن یاتریوں کی سیوا کے لیے باہر جاتا ہوں۔ آنے والوں کے مسائل سنتا ہوں اور ان کے درد کا مداوا کرنے کی پرارتھنا کرتا ہوں۔ لوگ میرے لیے جو تحائف لاتے ہیں میں انہیں دوسروں میں بانٹ دیتا ہوں۔ اپنے بارے میں لوگوں کے خیالات سن سن کر دیوتاؤں کا شکر ادا کرتا ہوں۔

ایک دن مجھے اطلاع ملی تھی کہ سنجی خلی کا شان سور گباش ہو گیا ہے اور میں نے کسی اور کو وہاں شان بنا کر بھیجنا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہاں کا شان پرلوک سدھارتا ہے وہاں پر مجھے نئے شان کو نامزد کر کے بھجوانا ہوتا ہے۔ سوچا کہ یہ کام جلدی نمٹا دوں گا۔ اسی دوران ایک رات حسبِ عادت کٹیا میں بند آنکھوں سے بنوں بی بی کی مالا جپتے جپتے مناسہ کی خوشبو اور روشنی نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ دیکھا تو میں مناسہ کے جسم سے پھوٹنے والی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے پاس بنوں بی بی کھڑی تھی۔ میں دونوں کے آگے سجدہ ریز ہو کر اٹھا تو دیکھا کہ مناسہ نے نازک بانہوں میں ایک نومولود بچہ سنبھالا ہوا تھا۔ اس نے یہ بھاگوان بچہ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا، صیام جی، یہ بچہ آپ کے پاس ہم دونوں کی امانت ہے۔ بنوں بی بی نے ایک گوری رنگت کی شیش ناگن میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا، اور یہ اس بچے کی ماتا کا دوسرا جنم ہے۔ اب تم اس بچے کے راکھی ہو۔ یہ کہہ کر دونوں دیویاں ہوا میں تحلیل ہو گئیں اور میں نے اس کرماں والے بچے کے سرخ بالوں کو دیکھا اور اس کا دمکتا ہوا معصوم سا گول چہرہ چوم کر سوچا، آج سے اس بچے کا نام رامو ہے اور میں خود سجنی خلی (کھلی) جا کر اس کی پرورش کروں گا۔ دوسرے روز میں نے سینا جی کو بڑے بابا کی مسند پر بٹھایا اور خود اس بھاگوان بچے کی سیوا کرنے کے لیے سجنی خلی کو سدھارا۔

آج کل میں اپنے رامو کے سنگ سجنی خلی کی اُسی جھونپڑی میں رہتا ہوں جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ میرا رامو دو برس کا ہونے کو ہے اور آج اس نے مجھے پہلی بار بابو کہا ہے۔

زندگی کا پیغام

۱۰۔ مارچ ۱۹۱۰ء کو پیدا ہونے والے والڈ ا مورا اور ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو آنکھ کھولنے والی والڈامینا نے اہلِ خانہ کی مرضی کے خلاف ۷۔ فروری ۱۹۳۱ء کو گھر سے بھاگ کر شادی کی۔ لگ بھگ اسّی سال گزرنے کے بعد آج والڈامورا ایک سو دس سال اور والڈامینا ایک سو چار سال کی عمر میں اکیواڈور کے دارالحکومت کیوٹو میں صحت مند اور خوش باش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان اسّی سالوں میں ان کی کئی نسلیں محبت کی گواہ ہیں اور پانچویں نسل کا ایک بچہ تو بزرگ دادا دادی کے لیے زندگی کا پیغام ہے۔

رہائی اپنے وقت پر شروع ہوگی

(جرمن کہانی)

فرانز کافکا

ترجمہ: ظفر قریشی (نیویارک)

''فرانز کافکا کی گمشدہ تحریری'' اس نام سے یہ کتاب ستمبر ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والی ہے۔ کتاب میں شامل چار کہانیوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ پہلی بار ''دی نیویارکر'' نے اپنی ۲۹۔ جون ۲۰۲۰ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ فرانز کافکا کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اس کا شمار مغرب کے ان چند ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ساری انسانیت کو اپنی فلسفیانہ تحریروں سے متاثر کیا ہے۔ کافکا نے جو کچھ لکھا اس کا بڑا حصہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے مگر پھر بھی کچھ عرصے بعد کچھ ایسی تحریریں برآمد ہو جاتی ہیں جو انگریزی پڑھنے والوں کو پہلے دستیاب نہیں تھیں۔ کافکا کی شہرت یافتہ تحریروں میں ''دی ٹرائل'' اور ''میٹا مورفوسس'' (Metamorphosis) سرفہرست ہیں۔

☆

''داستان'' اس کوشش کو قابل فہم بناتی ہے جو ہوتی نا قابل فہم ہے لیکن اس کی بنیاد بہرحال حقیت پر ہوتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بالآخر اس کا اختتام فہم وادراک سے بالاتر ہوتا ہے۔

یونانی دیوتا پرومیتھیوس کے حوالے سے ہمارے پاس چار داستانیں ہیں۔ پہلی داستان یہ ہے کہ اس نے ساتھی دیوتاؤں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کا عمل انسانیت کی ترجیح قرار پایا تھا چنانچہ سزا کے طور پر اسے کوہِ قاف کی ایک سنگلاخ چوٹی پر زنجیر سے پابند کر دیا گیا۔ پھر دیوتاش نے اس پر چیلیں چھوڑ دی تھیں جو اس کے جسم پر بیٹھ کر اس کا جگر نوچ نوچ کر کھایا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جتنا جگر نوچ کھاتی تھیں اتنا ہی پھر بڑھ جاتا تھا۔

دوسری داستان یہ تھی کہ چیلیں جب اپنی خمیدہ چونچوں سے اس کا جگر نوچتی تھیں تو تکلیف کے مارے وہ پیچھے ہٹتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے خود بھی پتھر بن گیا تھا۔

تیسری داستان کے مطابق اگلے ایک ہزار برسوں کے دوران نہ صرف دیوتا اس کا جرم بھول گئے تھے بلکہ چیلیں اور وہ خود اپنا جرم فراموش کر بیٹھا تھا۔ چوتھی داستان کے مطابق تمام متعلقہ فریق اس پورے طریقہ کار سے تنگ آ گئے تھے۔ چیلیں بیزار ہو گئی تھیں اور وہ خود بھی سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ خود اس کا اپنا زخم بھی تھک ہار کر اپنے آپ کو بند کرنے پر مجبور ہو گیا تھا جبکہ اصل پہیلی تو وہ پہاڑ تھے۔

☆

ایک بڑی ڈبل روٹی میز پر پڑی تھی۔ باپ ایک بڑا ٹھرا لے کر اندر داخل ہوا تا کہ ڈبل روٹی کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکے مگر اس حقیقت کے باوجود کہ ٹھرا بڑا اور تیز تھا اور ڈبل روٹی نہ بہت نرم تھی اور نہ ہی زیادہ سخت۔ اس کے باوجود ٹھرا ڈبل روٹی کو کاٹ نہ سکا۔ ہم بچوں نے اپنے باپ کو حیرت سے دیکھا۔ باپ نے ان سے پوچھا:

''تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے؟''

''کسی چیز کی کامیابی تمہارے نزدیک زیادہ حیران کن ہونی چاہیے۔ ناکامی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ تم لوگ سو جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد میں پھر کوشش کروں گا۔ تب شاید کامیاب ہو جاؤں۔''

ہم اپنے اپنے بستروں میں جا کر لیٹ گئے لیکن ہم میں سے کوئی نہ کوئی رات کے کسی پہر جاگ اٹھتا اور گردن نکال کر باپ کی طرف دیکھتا جو میز کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے اپنا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی داہنی ٹانگ پیچھے کی طرف تھی اور ڈبل روٹی میں سے ٹھرا گزارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ہم علی الصبح جاگے تو ہم نے باپ کو اسی وقت ڈبل روٹی کے برابر ٹھرا رکھے دیکھا۔ ہمیں جاگتے دیکھ کر اس نے کہا:

''تم نے دیکھا میں ابھی تک اس ڈبل روٹی کو کاٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ تو کافی مشکل کام ہے۔''

ہم نے اپنے اپنے طور پر ڈبل روٹی کاٹنے کی کوشش کی۔ باپ کی اجازت سے ہم نے ٹھرا اٹھانے کی کوشش کی لیکن ٹھرا اتنا بھاری تھا کہ ہم سے نہ اٹھ سکا جبکہ اس کا دستہ باپ کی رات بھر کی کوششوں سے دمک رہا تھا۔ ہمیں تو یوں لگا کہ ٹھرے کا دستہ بھی ہمارے ہاتھوں میں آنے سے انکاری تھا۔ یہ دیکھ کر باپ کو ہنسی آ گئی اور اس نے کہا:

''چلو اسے چھوڑو۔ میں ابھی باہر جا رہا ہوں۔ رات کو واپس آؤں گا تو ایک بار پھر کوشش کروں گا۔ ایک حقیر سی ڈبل روٹی مجھے احمق بنائے' یہ مجھے منظور نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آخر کار اسے میرے ہاتھوں کٹنا ہی ہے۔ اسے مزاحمت کی اجازت ہے اس لیے مزاحمت کر رہی ہے۔'' باپ کی اس بات پر ہم بچوں نے دیکھا کہ ڈبل روٹی کسی غصیلے شخص کے منہ کی طرح سکڑ گئی ہے اور اب ہماری نظر میں وہ بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔

☆

ایک کسان نے شاہراہ پر مجھے روکا اور مجھ سے درخواست کرنے لگا کہ میں اس کے ہمراہ اس کے گھر چلوں۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے لیے مددگار ثابت ہوں گا۔ دراصل اس کا اپنی بیوی کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا' ان کی آپس کی تکرار سے اسے اپنی زندگی تباہ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چند سادہ لوح بچے بھی تھے جو بالکل ناکارہ تھے۔ وہ یا تو خوامخواہ کھڑے رہتے تھے یا اودھم مچاتے رہتے تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے خوشی ہو

گی لیکن مجھے شک ہے کہ میں چونکہ ایک اجنبی ہوں اس لیے اس کا کسی معاملے میں مددگار ثابت ہوسکوں گا۔ میں نے کہا کہ بچوں کو تو میں کسی کام سے لگا سکتا ہوں لیکن بیوی کے معاملے میں کچھ نہ کرسکوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بیوی جھگڑالو ہوجاتی ہے تو اس کی وجہ شوہر ہوتا ہے۔ اور چونکہ وہ پوری صورتحال سے ناخوش تھا یہ ممکن ہے کہ اس نے خود کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ صعوبتیں برداشت کی ہوں لیکن اپنی بعض عادتیں بدل نہ سکا ہو۔ اس لیے میں پوچھتا ہوں کہ میں کیونکر کامیاب ہوسکوں گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ اس کی بیوی کے غصّے کا رخ اپنی جانب موڑ لوں۔ ابتدا میں میں خود سے زیادہ باتیں کررہا تھا جبکہ مجھے اسے مخاطب کرنا چاہیے تھا لیکن پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے حصّے کی مشکلات برداشت کرنے پر میرا معاوضہ کیا ہوگا؟ اس نے کہا ہم جلد ہی کوئی سمجھوتہ کرلیں گے خاص طور پر اس صورت میں جب میں اس کے لیے کارآمد ثابت ہوں گا۔ ویسے یہ بھی تو ممکن ہے کہ سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں' میں جو کچھ چاہوں اٹھا کر رکھ لوں۔ اس مرحلے پر میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا مبہم وعدہ تو مجھے مطمئن نہیں کرسکے گا۔ میں دراصل ایک حتمی معاہدہ چاہتا تھا تاکہ مجھے معلوم ہو کہ اس کی طرف سے مجھے ہر ماہ کیا معاوضہ ملے گا۔ وہ حیران تھا کہ میں نے اس سے ماہانہ تنخواہ کا مطالبہ کیا تھا۔ مجھے حیرت اس کی حیرانگی پر ہورہی تھی۔ کیا اس کا خیال تھا کہ محض چند گھنٹوں میں' میں دو افراد کے درمیان پیدا ہونے والے زندگی بھر کے تنازعات کا حل تلاش کرسکوں گا؟ کیا وہ توقع کررہا تھا کہ دو گھنٹوں کے اختتام پر مزدوری کے طور پر ملنے والی خشک چنے کی بوری اٹھاؤں گا، اظہار تشکر کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کا بوسہ لوں گا اور اپنے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر برفیلی سڑک ناپنے کے لیے نکل جاؤں گا؟ یقیناً نہیں۔

کسان خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مجھے اس کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارنا ہوگا تاکہ سب سے پہلے پوری صورت حال سے خود کو ہم آہنگ کرسکوں اور ممکنہ اصلاحات کی طرف توجہ دے سکوں۔ اور پھر میں نے سوچا کہ ماحول کو سازگار بنانے کے لیے مجھے مزید کچھ عرصہ رہنا پڑے گا۔ اور جب میں سارے کام کرچکوں گا تو تب تک بوڑھا ہوچکا ہوں گا اور کہیں جانے کے قابل نہ رہوں گا۔ میں اتنا تھک چکا ہوں گا کہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ تب میرا مطمع نظر آرام اور متعلقہ فریقین کی طرف سے فراہم کردہ سہولتوں پر ان کا شکریہ ادا کرنا رہ جائے گا۔

''یہ تو ممکن ہی نہیں ہوگا!'' کسان بولا۔ ''تم میرے گھر میں خود کو رکھنا چاہتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ بالآخر مجھے ہی میرے گھر سے نکال دو۔ تب تک میرے خیال میں مجھے آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ صورتحال درپیش ہو۔

''جب تک ہم ایک دوسرے پر مکمل اعتماد نہیں کریں گے ہمارے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا: ''کیا میں نے تم پر اپنے اعتماد کا اظہار نہیں کیا ہے؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے زبانی وعدے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور وعدہ خلافی کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تمہاری خواہشات کے مطابق جب میں تمہارے گھر کا انتظام ٹھیک کردوں گا تب اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے نکال باہر نہیں کروگے؟''

کسان نے میری طرف دیکھا اور کہا:

''تم کبھی ایسا موقع آنے ہی نہ دوگے۔''

''تم جو چاہو کرو اور میرے بارے میں جو چاہو سوچو۔ لیکن یہ کبھی نہ بھولنا کہ یہ بات میں تمہاری دوستی میں کہہ رہا ہوں۔ ایک مرد کی طرح دوسرے مرد سے کہ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گے تو اپنے گھر میں تمہاری گزر اوقات نہیں ہو پائے گی اس لیے کہ تم خود اپنے ساتھ ہونے والا سلوک برداشت نہیں کرسکو گے۔ میرا تم سے سوال یہ ہے کہ اپنی بدتمیز بیوی اور گنوار بچوں کے ساتھ مزید کتنا عرصہ گزار سکو گے؟ اگر تم مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکو تو کیوں نہ سب کچھ ترک کر کے گھر کے مسائل کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔ دونوں اس سڑک پر اکٹھے چلیں گے اور میں تمہاری طرف سے شکوک وشبہات کا شکار بھی نہیں ہوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔

''کاش میرے پاس ایسا کچھ کرنے کی آزادی ہوتی'' کسان بولا۔ ''میں اپنی بیوی کے ساتھ پچھلے پندرہ برسوں سے ہوں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں ہے اور میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ اس کے ساتھ اتنا وقت میں نے کیسے گزار لیا مگر اس حقیقت کے باوجود میری مشکل یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے چھوڑنے سے قبل میں وہ تمام کوششیں کرلینا چاہتا ہوں جو اسے چھوڑنے کا جواز بن سکیں اور پھر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ میری کوششیں بارآور ثابت ہوں اور یا تو اس کی عادتیں ٹھیک ہوجائیں یا پھر میں ہی اس کی بدمزاجی کا عادی ہوجاؤں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہراہ کے وسط میں تم چلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ تب مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ تمہیں ایک پیش کش کرکے دیکھوں۔ میری یہ آخری کوشش ہوئی۔ چنانچہ اب میں یہ آخری کوشش کردیکھوں گا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہوجاؤ تو میں جو معاوضہ مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟''

''مجھے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہاری مشکلات میں اضافہ کرکے تمہارا استحصال نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے مزدور کی حیثیت سے تاحیات ملازم رکھ لو۔ میں ہر کام کرسکتا ہوں اور تمہارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گا لیکن میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا کہ تم میرے ساتھ عام ملازموں والا سلوک کرو یا وہ سلوک کرو جو تم دوسرے مزدوروں کے ساتھ کرتے ہو۔ مجھے ملازم رکھنے کے بعد تم مجھے حکم نہیں دے سکتے۔ تمہاری اجازت سے میں جس طرح چاہوں تمہارا کام کرسکتا ہوں۔ مثلاً ابھی یہ کام کروں

گا اور کچھ دیر بعد وہ کام کروں گا اور کبھی کوئی کام کرنے کے لیے کہو گے تو تمہارا لہجہ نرم ہو۔ اگر تم محسوس کرو کہ میں اس کام کی انجام دہی میں دلچسپی نہیں لے رہا تو تمہیں یہ حقیقت تسلیم کے کے خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔ مجھے روپے پیسے اور دولت کی تمنا نہیں ہے لیکن کپڑے اور اعلیٰ قسم کے ملبوسات اور موجودہ اعلیٰ معیار کے جوتے مجھے درکار ہوں گے اور میں چاہوں گا کہ بوقت ضرورت مجھے فراہم کیے جائیں گے۔ اگر یہ اشیاء تمہارے گاؤں میں دستیاب نہیں تو ان کی خریداری کے لیے تمہیں قریب ترین بڑے شہر کا رخ کرنا ہوگا۔ لیکن فی الحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے میرے پاس موجود کپڑے اور جوتے اتنے ہیں کہ برسوں چلیں گے۔ اور جہاں تک میری اُجرت کا تعلق ہے، میں عام مزدور کی اُجرت پا کر بھی خوش ہو جانے والوں میں سے ہوں تاہم میں اصرار کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری خوراک میں گوشت کا عنصر روزانہ اور لازمی ہونا چاہیے۔

''روزانہ؟'' کسان نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا جیسے میری باقی تمام شرائط سے وہ مطمئن ہو گیا ہو۔

''روزانہ!'' میں نے اس لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دانت غیر معمولی ہیں۔'' میری شرائط کا جواز تلاش کرنے کی غرض سے اس نے میرے منہ میں انگلی ڈال کر میرے دانت محسوس کیے۔ ''بہت تیز ہیں۔ بالکل کتے کے دانتوں کی طرح!'' بالآخر وہ بولا۔

''خیر۔ میرے دانت جیسے بھی ہوں۔ مجھے گوشت روزانہ درکار ہو گا۔ اور جتنی بیئر اور دیگر شرابیں تم پیو گے اتنی ہی میں بھی پیوں گا۔''

''لیکن یہ تو بہت زیادہ شراب ہوگی۔'' کسان نے کہا۔ ''کیونکہ میں واقعی بہت پیتا ہوں۔''

''یہ میرے لیے خوش خبری ہے۔ اب اگر تم اپنی شراب کم کرو گے تو میں بھی اپنی کمر کس لوں گا۔ تم شاید شراب اس لیے زیادہ پیتے ہو کہ تمہاری ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے۔''

''شراب کی مقدار کا ازدواجی زندگی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن ہم چونکہ اکٹھے پئیں گے اس لیے تم بھی اتنی ہی پینا جتنی میں پیوں گا۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی نہیں سکتا۔ میں تنہائی میں اپنی خوراک یا اپنے مشروب سے لطف اندوز ہونا پسند کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تنہا؟'' کسان نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''تمہاری خواہشیں سن سن کر میرا سر گھومنے لگا ہے۔''

''میری اتنی زیادہ خواہشیں نہیں ہیں کہ تمہارا سر گھما دیں۔ بلکہ میں کہوں گا کہ میں اپنی خواہشوں کی فہرست کے اختتام تک پہنچ گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ رات میں جب میں سونے لگوں تو میرے سرہانے ایک دیا جلتا رہے چنانچہ اس دیئے کے لیے تیل بھی مجھے درکار ہوگا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا دیا ہے جو بہت کم تیل خرچ کرتا ہے۔ اتنا کم تیل کہ کہنا ضروری نہیں تھا لیکن میں نے احتیاطاً یہ بات بیان کر دی ہے تاکہ بعد میں وجہ تنازعہ نہ بنے۔ چیزیں مانگنا یا طلب کرنا مجھے برا لگتا ہے تاہم مجموعی طور پر میں ایک ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں لیکن جب متفقہ شرائط پر عمل نہ ہو اور معاہدے کی خلاف ورزیاں ہونے لگیں تو سختی پر اتر آتا ہوں۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر میری پوری اجرت ادا نہ کی گئی اور ایک دھیلے کا بھی ہیر پھیر ہوا تو میرے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ تمہاری نیند کے دوران میں تمہارے گھر کو نذرِ آتش کر سکتا ہوں۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ ہمارے درمیان جب ساری باتیں طے ہو جائیں تو تم کو انکار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوگی، خاص طور پر ایسی صورت میں جب تم میرے ساتھ شفقت کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً مجھے چھوٹے موٹے تحفے دیتے رہا کرو گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحفوں کا مہنگا ہونا بالکل بھی ضروری نہیں۔ یہ جو معمولی نوعیت کی نوازشوں کا مظاہرہ تمہاری جانب سے ہوگا دراصل میری تمہارے ساتھ وفاداری کی قیمت ہوگی۔ میں ایک بار پھر تم سے کہہ رہا ہوں کہ میں نہ صرف محنتی آدمی ہوں بلکہ میں وفادار بھی ہوں اور مختلف معاملات میں تمہارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔ میں جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل بتا چکا ہوں میری ضروریات محدود ہیں اور جتنی بیان کر چکا ہوں اس سے رتی بھر زائد کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ ہاں، اگست کے ۲۴ تاریخ کو میرا جنم دن ہے، اس دن میں چاہوں گا کہ مجھے تمہاری طرف سے رَم (Rum) کے دو گیلنوں (Gallons) کا ایک چھوٹا سا بیرل تحفے کے طور پر ملے۔''

''دو گیلن؟'' کسان نے حیران ہو کر دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ دو گیلن۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے'' میں نے کہا۔ ''تم شاید سمجھتے ہو کہ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی عادتیں بھی محدود کر لی ہیں۔ یقیناً تمہارا لحاظ کرتے ہوئے میں نے خود پر پابندیاں عائد کر لی ہیں کیونکہ دیکھو اگر کوئی اجنبی ہمیں اس طرح کی باتیں کرتے سن لے تو کم از کم مجھے بہت شرمندگی ہوگی۔ اس لیے میری تم سے درخواست ہے کہ ہمارے درمیان جو بھی سمجھوتہ ہو اس کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو تو بہتر ہوگا۔ لیکن اگر کوئی سن بھی لے تو کیا وہ یقین کرے گا؟''

کسان کچھ دیر میری باتوں پر غور کرتا رہا پھر اس نے کہا ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم اپنی راہ لو اور میں اپنے گھر جا کر بیوی کے ساتھ معاملات ٹھیک کرنے کی کوشش کروں۔ یہ بات درست ہے کہ بے چاری کی حالیہ چند دنوں کے دوران میں بہت ٹھکائی کرتا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر میں اسے مارنا پیٹنا بند کر دوں تو وہ میری احسان مند ہو کر میرے ساتھ بہتر سلوک کرے گی۔ ادھر ماضی قریب میں میں اپنے بچوں کی بھی بہت دھنائی کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اصطبل سے

گھوڑے کا چابک نکال کر انہیں مارا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اب اپنے بچوں کے حوالے سے بھی اپنا رویہ تبدیل کرنا ہوگا۔ سوچتا ہوں کہ شاید اس صورت میں حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ماضی میں میں نے متعدد بار اپنا رویہ بدلا تھا لیکن صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک تمہارے مطالبات کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میرا کاروبار اتنا بڑا نہیں کہ انہیں پورا کر سکوں۔ اگر تمہارے مطالبات زیادہ نہ ہوتے تب بھی میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں روزانہ گوشت کھلانا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اور دو گیلن رَم اگر میں تمہیں فراہم کرنا بھی چاہوں تو میرا نہیں خیال کہ میری بیوی مجھے یہ اجازت دے گی کہ میں تمہیں اتنی بڑی مقدار میں شراب فراہم کروں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ اجازت نہ دے تب میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ کر سکوں گا۔''

''تو پھر اتنے لمبے چوڑے مذاکرات کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

☆

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس پورے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایک کونے میں پڑا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ دیکھنے سے مراد، اس نیم مردہ حالت میں جو کچھ نظر آ سکتا ہے یا سنائی دے سکتا ہے یا سمجھ میں آ سکتا ہے، ماسوائے اس صورتحال کے جو پچھلے کئی ماہ سے مجھے درپیش تھی اور جس کے تحت مجھے رات کا انتظار ہوتا۔

میرے حوالاتی ساتھی کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ وہ ضدی مزاج کا شخص ہے اور اپنے آپ کو کپتان یا لیڈر تصور کرتا ہے۔ مجھے اس کی صورتحال کا اندازہ ہے۔ اسے اپنی مشکل کا احساس قطب شمالی یا قطب جنوبی کے مہم جو جیسا ہے جو کسی یخ بستہ مقام پر جما ہوا اور محدود ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ رہا کرا لیا جائے گا یا اس کی مہمات کے حوالے سے جو واقعات شائع ہو چکے ہیں ان کے مطابق وہ رہا کرایا جا چکا ہے۔ اور اب سے درج ذیل مسئلے درپیش ہیں۔ اس حقیقت سے وہ بخوبی واقف ہے کہ بالآخر اسے اس برفانی قید سے رہائی ضرور ملے گی۔ اس ضمن میں اسے کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ اس کی شخصیت میں کامیابی کا جو بھاری بھرکم پہلو ہے وہ اس کا عزم ظاہر کرتا ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ خواہش کرے یا نہ کرے اسے معلوم ہے کہ رہائی اس کا نصیب ہے لیکن رہائی کی خواہش اسے کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے یہ ایک بے معنی قسم کا سوال ہے۔ وہ پھر بھی اس سوال پر غور کرتا ہے، میرے سامنے رکھتا ہے۔ ہم دونوں اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہم اس کی رہائی کے موضوع پر بات نہیں کرتے۔ اب جہاں تک رہائی کا تعلق ہے، اسے یقین تو ہے کہ وہ آخر کار رہا ہو جائے گا مگر ظاہری طور پر اس نے اپنی رہائی کے حوالے سے ساری امیدیں اس ایک چھوٹی سی ہتھوڑی کے ساتھ باندھ رکھی ہیں جو اس نے کسی طرح کہیں سے حاصل کر لی تھی۔ یہ چھوٹی ہتھوڑی ڈرائنگ بورڈ (Drawing Board) میں پنیں (Pins) داخل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ وہ یہ ہتھوڑی بھی استعمال نہیں کرتا، اس کی ملکیت ہی اسے خوش رکھتی ہے۔ کبھی وہ میرے برابر آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے اور مجھے ہتھوڑی دکھا کر میری آنکھوں کے سامنے اسے نچاتا ہے۔ میں نے یہ ہتھوڑی ہزاروں بار دیکھی ہوگی۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر فرش پر رکھتا ہے اور اس ننھی منی ہتھوڑی سے میری انگلیوں پر ہلکی چوٹیں لگاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس ہتھوڑی سے وہ حوالات کی دیوار کا ایک کنکر بھی نہیں نکال سکے گا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ یہ کوشش بھی نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ یہ ہتھوڑی دیواروں کے ساتھ گزارتا ہے۔ گویا اپنی رہائی کے لیے باہر منتظر افراد کو اشارہ کر رہا ہے کہ رہائی کی کارروائی کا آغاز کیا جائے لیکن رہائی کی کارروائی اس طرح بالکل شروع نہیں ہوتی۔

رہائی اپنے وقت پر شروع ہوگی، ہتھوڑی ہو یا نہ ہو۔ ہتھوڑی تو محض ایک چیز ہے جسے تھاما جا سکتا ہے۔ پکڑا جا سکتا ہے۔ اسے پیار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن رہائی کو تو آپ پیار نہیں کر سکتے۔ اسے بوسہ نہیں دے سکتے۔

ہاں یہ بات تو ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کپتان کو قید و بند کی صعوبتوں نے پاگل کر دیا ہے۔ اس کی سوچ اتنی محدود ہو چکی ہے کہ اس میں ایک خیال بھی نہیں سما سکتا۔

سولر فارمز

کیمبرج یونیورسٹی نے ضیائی تالیف (فوٹوسنتھیسز) کی ایسی ڈیوائس تیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو کامیابی کے ساتھ سورج کی روشنی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کو استعمال میں لا کر ایندھن بنا سکتی ہے۔ سائنس سی میگزین کی رپورٹ کے مطابق مذکورہ ڈیوائس مصنوعی ضیائی تالیف کے ذریعہ اسی طریقۂ کار کی نقل کرتی ہے جس کے ذریعے پودے اپنے لیے خوراک/توانائی تیار کرتے اور سورج کی روشنی سے ایندھن بناتے ہیں۔ اس ڈیوائس کی بنیاد ایڈوانس فوٹو شیٹ ٹیکنالوجی پر مبنی ہے جو سورج کی روشنی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کو آکسیجن اور فارمک میں تبدیل کر کے قابلِ ذکر ایندھن بناتی ہے۔ اس طرح کے ایندھن کو براہِ راست یا مخصوص طور پر تیار کردہ جنریٹرز میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا پھر اسے ہائیڈروجن میں تبدیل کر کے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ڈیوائس مکمل طور پر وائرلیس ہے جس کے سائز میں اضافہ کر کے سولر فارمز جیسے بڑے فارم کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ سے جاپان

(سفر.....مشرق بعید کے)

یعقوب نظامی

جمعہ 11۔اگست 2017ء

صبح نو بجے ہمیں مانچسٹر کے ہوائی اڈہ سے ہالینڈ کی ہوائی کمپنی کے ایل ایم KLM کے ذریعے سفر کرنا تھا۔گھر سے بیٹی شمائلہ نے ہمارے سوٹ کیس گاڑی میں رکھے اور ہوائی اڈے کی طرف چل پڑی۔

یہ صبح چھ بجے کی بات ہے۔

آج خوش قسمتی سے سورج بھی چمک رہا تھا۔سورج کی کرنیں جب فطرتی مناظر پر پڑتیں تو شبنم کے موتیوں سے منعکس ہوکر پورے ماحول میں رنگ بکھیر رہیں تھیں.....رنگا رنگ مناظر سے انسانی سوچوں پر خوشگوار اثرات مرتب ہورہے تھے۔آج عرصہ دراز کے بعد برطانیہ میں نیلے آسمان پر سورج کو چمکتے دیکھا تو ہر چیز اُجلی اُجلی نظر آرہی تھی۔ہمارے گھر بریڈفورڈ سے مانچسٹر کا ہوائی اڈہ ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔یہ سفر موٹروے M62 کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ جو میرے لئے ہمیشہ دلچسپ رہا۔چونکہ اس میں قدرتی مناظر،جھیلیں، چراہ گاہیں اور پہاڑیاں ہیں۔

مانندِ کشمیر۔

کشمیر کے پہاڑی گاؤں کی مانندان پہاڑیوں پر بھی مکان نظر آتے ہیں لیکن یہ کسی بستی کی شکل میں نہیں بلکہ الگ الگ.....ایک مکان کے میلوں بعد کوئی دوسرا مکان نظر آئے گا۔سرسبز کھیتوں اور چراہ گاہوں میں تعمیر ان مکانوں کی دیواریں مقامی پتھر اور چھت ڈھلوان جن پر پتھر کی سلیٹ لگی ہوتی ہیں۔

برطانوی روایتی مکان۔

یہ مکان تین سے چار سو سال پرانے.....بلکہ کچھ اس سے بھی قدیم ہیں۔

شمالی انگلستان کے علاقے یارکشائر کے دیہاتوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ لوگوں نے اپنی ملکیت میں آنے والی زمینوں چراہ گاہوں اور کھیت کھلیانوں کے اردگرد میلوں لمبی دیواریں مقامی پتھر سے پانچ فٹ اونچی تعمیر کررکھی ہیں۔یہ تقسیم صدیوں پہلے ہوئی جس میں آج تک ردوبدل نہیں ہوا اور نہ کبھی حقوق ملکیت پر لوگوں کو عدالتوں کے چکر لگاتے دیکھا۔اس طرح کی دیواریں ویلز،سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں بھی موجود ہیں۔

برطانوی گاؤں شہروں سے زیادہ حسین اور رہائش گاہیں مہنگی ہوتی ہیں۔صاحب حیثیت برطانوی لوگ شہروں کی بجائے گاؤں میں رہنا پسند کرتے ہیں ۔کچھ یہی سبب ہے کہ برطانوی وزیراعظم بھی اختتام ہفتہ لندن سے تیس میل باہر ایلزبری کے مقام پر اپنی دیہی رہائش گاہ Chequers چیکرز میں فیملی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔پندرہ سو ایکٹر پر پھیلی ہوئی اس جاگیر میں وزیراعظم کا مکان ہے جو لندن کے ڈاؤننگ سٹریٹ کے بعد سیاست کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

فطرت سے پیار کرنے والے برطانوی دیہاتی اپنے ماحول کی حفاظت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ویسے تو اس ماحول میں ایک سناٹا سا چھایا محسوس ہوتا ہے لیکن بعض گھروں کی چمنیوں سے جب دھواں نکلتا نظر آتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ مکان ویران نہیں بلکہ آباد ہیں۔اور پھر بعض اوقات بھیڑ بکریوں کے ممیانے،گائے اور بیلوں کے ڈکارنے اور کتوں کے بھونکنے سے سکوت ٹوٹتا ہے۔

موٹروے M62 پر سفر کرتے ہوئے مسافر جہاں لطف اندوز ہوتے ہیں وہاں مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے اُن کے ذہنوں میں سوالات بھی جنم لیتے ہیں.....ایک سوال ہمیشہ لوگوں کے ذہنوں میں اُس وقت اُبھرتا ہے جب وہ جھیلوں اور پہاڑیوں کے درمیان سے سفر کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں موٹروے دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے.....اور عین درمیان میں ایک فارم ہاؤس نظر آتا ہے۔یہ منظر جہاں دل کش ہے وہاں مسافر اسے دیکھ کر سوچنے بھی لگتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟

حقیقت کیا ہے؟

واقف حال یہ جانتے ہیں کہ اس فارم ہاؤس کا نام ''سکاٹ ہال'' ہے۔ساٹھ کی دھائی میں اس کے بڑے چرچے ہوئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب یہ موٹروے زیرتعمیر تھا تب عوام کا خیال تھا کہ اس فارم ہاؤس کا مالک بہت لالچی انسان ہے جو اپنی زمین کے منہ بولے پیسے مانگتا ہے لیکن متعلقہ حکام کی طرف سے ادائیگی نہ ہونے پر اُس نے یہ جگہ نہیں دی۔

ایک دفعہ میرے دوست نصیر بیگ کے برادر بزرگ حاجی اسلم بیگ نے مجھے کہا کہ آپ نے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد برطانیہ میں آباد ایشیائیوں کی چار سو سالہ تاریخ..... پاکستان سے انگلستان تک.....لکھی ہے۔اب آپ یہ کام کریں کہ M62 پر جہاں ایک فارم ہاؤس دو لین کے درمیان ہے اس پر تحقیق کریں..... چونکہ ہمارے لوگ کہتے ہیں کہ یہ فارم ہاؤس کسی پاکستانی کی ملکیت ہے۔اس کا باپ پاکستانی اور ماں گوری تھی۔اب وہ دونوں اس جہاں سے رخصت ہوچکے ہیں لیکن برخوردار بیٹے نے اس فارم ہاؤس کو ماں باپ کی نشانی کے طور پر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس پر موٹروے بنوانے سے انکار کردیا تھا۔

میں نے چھان بین کی تو معلوم ہوا.....!حقیقت.....عوامی رائے کے برعکس ہے۔فارم ہاؤس کسی پاکستانی کی ملکیت نہیں۔بلکہ.....

یہ زمین اس قدر نرم اور گہرائی میں ہے کہ وہاں موٹروے تعمیر ہی نہیں ہوسکتا تھا۔چنانچہ انجینئروں نے مشورے کے بعد اس فارم ہاؤس کو درمیان میں چھوڑا اور موٹروے دونوں اطراف بنا ڈالا۔جو دیکھنے میں بہت ہی خوب صورت نظر آتا ہے جس کے قریب نیچے ایک مصنوعی جھیل ہے۔اس جھیل میں بارش کا جو پانی ذخیرہ ہوتا ہے اُسے قرب وجوار کی آبادی میں استعمال کے لئے فراہم کیا جاتا ہے۔

فارم ہاؤس سے تھوڑا آگے سیڈل ورتھ Saddleworth کا غیر

آبادعلاقہ زیادہ تر چراہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جہاں بھیڑوں کے ریوڑ چرتے اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر مستیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ.....

بھیڑوں کی دیکھ بھال کے لئے ''آجڑی'' یعنی چرواہا کی بجائے تربیت یافتہ کتے مامور ہیں جو کسی بھی خطرے سے نبٹنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ سیڈل ورتھ کی چراہ گاہوں سے بھی کچھ دردناک قصے جڑے ہوئے ہیں۔

یہ 1963ء سے 1965ء کے درمیان کی بات ہے.....!

پینائین کی یہ پہاڑیاں میڈیا اور عدالتوں میں کافی عرصہ زیر بحث رہیں۔ اس کی وجہ دوسفاک قاتل تھے۔

این براڈلی اور اس کی پارٹنر مارا ہینڈلی.....

دونوں بچوں کو قتل کرتے اور پھر انھیں سینڈل ورتھ کے اس ویرانے میں دفن کر دیتے تھے۔

پھر قانون حرکت میں آیا.....

دونوں قاتل گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں تاحیات جیل میں زندگی بسر کرنے کی سزائیں ہوئیں..... سزائیں کاٹتے کاٹتے دونوں قاتل جیل سے ہی اُس جہاں جا پہنچے جہاں وہ اپنے ظلم سے معصوم بچوں کو قتل کر کے بھیجتے تھے۔

جس مقام پر پینائین کی پہاڑیوں کو کاٹ کر درمیان میں سے موٹر وے تعمیر کیا گیا ہے مسافر جب اسے عبور کرتے ہیں تو..... لنکا شائر میں خوش آمدید..... کے بورڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم یارکشائر کاؤنٹی سے لنکا شائر کاؤنٹی میں پہنچ چکے ہیں۔

پینائین کی پہاڑیاں دیکھنے میں تو زیادہ اونچی نہیں لیکن ہر وقت سردی کو سینہ سے لگائے رکھتی ہیں۔ ابھی آپ یارکشائر میں ہی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ موٹر وے پر ایک بورڈ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ..... یہ مقام انگلینڈ کے تمام موٹر وے سے اونچا ہے.....

یوں اس مقام کی ایک تاریخی حیثیت بن جاتی ہے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

پینائین کی پہاڑیوں کے دامن میں راچڈیل کا خوبصورت ٹاؤن جبکہ دوسری سمت قدرے بلندی پر اولڈہم کا شہر ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں دنیا کی پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی نے 25 جولائی 1978 کو مقامی ہسپتال میں جنم لیا تو دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ چرچ کے پادری سر جوڑ کر بیٹھے کہ اس بارے میں کیا رائے دی جائے۔ اس بچی کو..... لوئیس جوئے براؤن..... نام دیا گیا۔ لوئیس کی پیدائش سے میڈیکل میں ایک انقلاب آیا جس پر اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں عمل ہو رہا ہے۔

لوئیس کی عمر اب چالیس سال ہے۔ یہ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہے۔

لوئیس کو یاد کرتے ہم نے پینائین کی پہاڑیاں عبور کیں اور موٹر وے پر ہی سفر کرتے مانچسٹر کے ہوائی اڈہ پر جا پہنچے۔ ہوائی اڈہ پر معمول کی پڑتال کے بعد ہمارا سامان ہوائی کمپنی نے اپنی تحویل میں لے لیا اور ہمیں بورڈنگ کارڈ جاری کیے جنھیں لے کر ہم انتظارہ گاہ میں جا بیٹھے اور برطانیہ سے جاپان کے سفر کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

عین وقت پر جہاز کے دروازے کھلے اور اعلان ہوا کہ مسافر جہاز میں تشریف لے چلیں۔ مسافروں نے اپنا دستی سامان اٹھایا اور جہاز میں جا بیٹھے۔ جہاز میں بیٹھ کر جائزہ لیا تو یہ ایک چھوٹا سا جہاز تھا جس میں پچاس ساٹھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ بس یہی سمجھئے کہ یہ ایک فضائی کوچ تھی۔ جہاز نے مانچسٹر سے اڑ کر ہالینڈ کے ہوائی اڈہ ایمسٹرڈیم پہنچنا تھا جہاں سے ہمیں ایک بڑے جہاز میں مشرق بعید کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔

مانچسٹر سے ہالینڈ

مانچسٹر سے ہالینڈ کے ساحلی شہر ایمسٹرڈیم کا سفر پچاس منٹ کا ہے۔

جہاز چھوٹا تھا لیکن فضائی میزبان ڈچ لڑکیاں بہت ہی چاک و چوبند تھیں جنھوں نے جہاز کے فضا میں پہنچتے ہی مہمانوں کی خاطر مدارت شروع کر دی۔ چائے، قہوہ اور ٹھنڈے مشروبات کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا کھانا بھی پیش کیا۔ ابھی ہم چائے پینے سے فارغ ہوئے تھے کہ جہاز نے رود بار انگلستان کو عبور کیا تو ساتھ اعلان ہو گیا..... خواتین و حضرات چند منٹوں میں ہم ہالینڈ کے ہوائی اڈہ پر اُترنے والے ہیں۔

ہم نے فضا سے دیکھا تو نیچے نیل گوں سمندر نظر آیا۔ اور پھر جلد ہی سرسبز ہرے بھرے پھولوں بھرے کھیت نظر آنے لگے۔ دنیا کا یہ واحد ملک ہے جو پوری دنیا کی پھولوں کی ستر فیصد مانگ پوری کرتا ہے۔

فضاء سے دیکھا.....

حد نظر تک پھولوں بھرے کھیت جو ہنستے مسکراتے سیاحوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ رنگ برنگے پھولوں کا یہ دیس اس قدر خوب صورت اور دلکش ہے کہ ہالی وڈ سے لیکر بالی وڈ کے فلم ساز اِدھر کا رخ کرتے ہیں تا کہ ان خوبصورت مناظر کو کیمرہ کی آنکھ میں بند کیا جا سکے۔ فضاء سے دیکھا تو پھولوں کے کھیت اور اُن کے درمیان نہریں اور نہروں سے پھر اُس کی شاخیں نکال کر کھیتوں کو سینچا جا رہا تھا۔

ٹیولپ اس ملک کی خاص پہچان ہے۔

پھولوں کے ساتھ ساتھ ونڈمل جو اس دیس کی خاص پہچان ہے وہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ ملک دیکھا تو وہ کہاوت یاد آئی کہ:

اس دنیا کو اللہ میاں نے بنایا۔

لیکن

ہالینڈ کو خوب صورت اُس کے باسیوں نے بنایا۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا..... بحیرہ انگلستان کے ایک طرف ہالینڈ کا شہر ایمسٹرڈیم اور دوسری طرف برطانیہ عظمیٰ کا علاقہ ناروچ نظر آیا۔ مقامی لوگ اس چھوٹے سے سمندر کو کشتیوں کے ذریعے عبور کرتے رہتے ہیں۔

برطانیہ اور ہالینڈ

دونوں ملکوں کے فضائی جائزہ کے بعد میں سوچنے لگا.....!

برطانیہ اور ہالینڈ صدیوں سے آمنے سامنے آباد ہیں۔

دونوں کے درمیان انگلش چینل سمندر حائل ہے۔

برطانیہ اور ہالینڈ کی آپس میں دوستی بھی ہے اور رقابت بھی۔

دونوں کے جہاں مفادات ٹکرائے وہاں اختلاف اور جہاں مفادات کی جنگ کا امکان نہیں تھا وہاں یہ ایک دوسرے کے دوست بن کر رہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ.....

دونوں ملک روز اول سے سولہویں صدی تک گمنامی اور غربت میں رہے۔ آخر غربت سے تنگ آ کر ہالینڈ کے لوگوں نے اپنا سامان کشتیوں پر رکھا اور تلاش رزق میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

تنگ آمد بجنگ آمد..... کا محاورہ ممکن ہے ان لوگوں کے لئے ایجاد ہوا ہو۔ انھوں نے غربت کو شکست دینے اور دنیا کو اپنے قبضہ میں کرنے کا جب قصد کیا تو سب سے پہلے مشترکہ مفادات کے پیش نظر کمپنیاں بنائیں۔ اس میں پہل ہالینڈ نے کرتے ہوئے 1602ء میں ''ڈچ ایسٹ انڈیا'' کمپنی بنائی جس کے پاس کسی زمانے میں 4785 بحری جہاز ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت یورپ کا سب سے بڑا بحری بیڑا اسی قوم کے پاس تھا۔ ان کے مقابلے میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس 2690 جہاز تھے۔

ولندیزی سمندر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے سمندر سے ڈرنے کی بجائے اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ غربت کو ختم کرنے اور اپنے ملک کو سنوارنے کی خاطر سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکلے۔ جہاں سے دولت ملی اُسے جہازوں میں لادا اور اپنے ملک میں لا کر اُسے سنوارا اور از سر نو تعمیر کیا۔

ان سے پہلے پرتگال اور سپین نے جب مسلمانوں سے آزادی لی تو انھوں نے بستر باندھے اور دنیا کے خزانے ڈھونڈنے گھروں سے نکل پڑے۔

سپین کا کولمبس امریکہ اور پرتگال کے واسکوڈی گاما نے ہندوستان پر جا کر جھنڈے گاڑے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے یورپی جن میں سرفہرست ولندیزی یعنی ڈچ تھے وہ بھی غربت مٹانے واسکوڈی گاما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔

سب سے آخر.....

برطانوی ہندوستان پہنچے اور دوسروں کو وہاں سے نکال کر پورے ملک پر خود قبضہ کر لیا۔ قبضہ کے بعد جونک کی طرح ملکی دولت چوس کر برطانیہ پہنچائی..... جب مقامی تلوں میں تیل نہ رہا تو پھر اپنی بساط لپیٹی اور واپس برطانیہ چلے آئے۔

لیکن.....

آتے آتے اپنے ہاتھوں سے وہاں ایسے پودے لگا آئے جو ابھی تک ہمارے سروں پر حکومت کر رہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ کر یورپ لا رہے ہیں۔

میں ماضی کے جھروکوں میں جھانکتا رہا اور جہاز فضاؤں میں سفر کرتا ہوائی اڈے پر جا اُترا۔ میں نے دیکھا ہوائی اڈہ سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یورپ میں جولائی اگست میں تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں ایسے میں لوگ اپنے خاندان کے ساتھ دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کے لئے گھروں سے نکلتے ہیں۔

امریکی بمقابلہ پاکستانی

اگلی فلائیٹ کے لئے ہم انتظار گاہ میں بیٹھے باتیں کرنے لگے تو ایک امریکی لڑکی کندھے پر بڑا بھاری بیگ اٹھائے آ کر ہماری قریب والی نشست پر بیٹھ گئی۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ شرلی نامی یہ لڑکی شگاگو یونیورسٹی میں جغرافیہ کی طالبہ ہے اور چھٹیاں منانے گھر سے اکیلی نکلی ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ.....

''میں پڑھائی کے ساتھ شگاگو کے ایک شراب خانے میں جز وقتی ویٹرس کا کام کرتی ہو۔ معقول تنخواہ ملتی ہے لیکن جب شرابی لوگ زیادہ پی جاتے ہیں تو مستی میں آ کر جیب میں جس قدر پیسے ہوتے ہیں وہ ٹپ کے طور پر مجھے دے دیتے ہیں جس سے میرے پاس اچھے خاصے پیسے جمع ہو جاتے ہیں جنھیں میں ہالیڈے پر خرچ کرتی ہوں۔''

شرلی نے مجھ سے پوچھا کہ جب تم کالج میں پڑھتے تھے تب کون سا پارٹ ٹائم کام کرتے تھے۔ میں نے جواب دیا.....

''ہمارے پیارے پاکستان میں..... طالب علم کام کرنا باعث شرم سمجھتے ہیں۔ چند غریب طلبا ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو..... لیکن ویٹر یا ہوٹلوں میں برتن صاف کرنے جیسے کام کے لئے طلبہ ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ چاہے بھوک سے جان چلی جائے لیکن اپنی اکڑ پر قائم رہتے ہیں۔''

یہ سن کر شرلی حیرت کے ساتھ میرا منہ تکنے لگی..... اور پھر بولی کہ آپ کے ملک میں طلبا کا گزارہ کس طرح ہوتا ہے اور وہ تعلیم کے ساتھ جب عملی کام کر کے تجربہ حاصل نہیں کر پاتے تو پھر انھیں یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کیسے ملتی ہے؟۔

میں یہ کہنے والا تھا کہ پہلے تو ہمیں نوکری ملتی ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو سفارش پر ملتی ہے.....

لیکن پھر

اپنے ملک کی لاج رکھتے ہوئے میں خاموش ہو گیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ.....

یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبا دن کو پڑھائی اور شام کو شہر کے چائے خانوں، شراب خانوں اور ریسٹورنٹ میں ویٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ کام کرنے والوں میں لڑکے اور لڑکیاں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ یہ کام کرنے سے شرمانے کی بجائے فخر کرتے ہیں کہ ہم کما کر خرچ کرتے ہیں۔

..... ماں باپ کے سہارے زندگی نہیں گزارتے۔

یورپی طلباء جو کماتے ہیں اُس سے پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ اگر کچھ پیسے بچ جائیں تو وہ تعطیلات پر خرچ کرتے اور گھوم پھر کر اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ سیاحت کے دوران یہ مختلف شہروں کے یوتھ ہاسٹل میں معمولی ادائیگی پر رات بسر کرتے اور بسوں پر سفر کر کے گھومتے پھرتے ہیں۔ ان ہی تجربات کی بنیاد پر یہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔

ہم یورپ کی ترقی کے گن تو گاتے ہیں لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ وطن عزیز کے طالب علم جو کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتے ہوں وہ کسی ہوٹل میں ویٹر یا برتن دھونے جیسے کام کریں.....

ہرگز نہیں.....!

اسی مصنوعی زندگی کے سہارے جب ہم کالجوں سے فارغ ہوتے ہیں تو پھر سفارشیں ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں تا کہ روزگار ملے.....

جس کے ہاتھ لمبے وہی فیض یاب ہوتا ہے

باقی یا تو غربت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا پھر قانونی یا غیر قانونی طریقہ سے یورپ یا ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر وہی کام کرتے ہیں جو اپنے ملک میں کرنا اپنی کی توہین سمجھتے تھے۔

یورپی ممالک میں بے روزگار اور نکمے لوگوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان کی نظر میں کام کرنے والے باعزت ہوتے ہیں اور ہر کام کی عزت ہے۔

مغرب میں صفائی کرنے والوں سے لیکر دفتری بابو، ڈاکٹر انجینئر اکاونٹینٹ سب کو معاشرے میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے کام کرتا ہے۔ اگر کوئی کسی عہدہ جلیلہ پر ہے تو وہ اُس پر فخر نہیں کرے گا بلکہ اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا نظر آئے گا۔

اور پھر

یورپی پیسے کما کر بنکوں میں رکھنے کے عادی نہیں بلکہ خرچ کرتے ہیں۔ چونکہ یہ اس بات کو جانتے ہیں کہ دولت خرچ کرنے سے بڑھتی ہے جبکہ ہمارے خیال میں دولت پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھنے سے محفوظ رہتی ہے۔

برصغیر کا ماحول یورپی ماحول کے برعکس ہے۔ یہاں ایک کام کرنے والا اور دس کھانے والے۔ اس طرح کے مفت خورے نوجوان.....والدین یا بھائیوں کے سہارے مصنوعی دبدبے کی زندگی بسر کرتے ہوئے اکڑ کر چلتے ہیں۔

جبکہ بعض.....

لوٹ کھسوٹ کی دولت سے مصنوعی زندگی گزارنے کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔

اور اب تو بات نشہ تک آن پہنچی ہے.....

یہی ہمارے ملک کا المیہ ہے۔

☆☆☆☆

اُبھرتے سورج کے سنگ سنگ

ہالینڈ سے جہاز تبدیل کیا۔

یہ ایک بڑا جہاز تھا جس میں تین سو کے لگ بھگ مسافروں کے لئے گنجائش تھی۔ جہاز نے مقامی وقت کے مطابق صبح نو بجے اڑان بھری۔ تب ویت نام میں شام کے پانچ بجے تھے۔ بیگم نے خبردار کیا کہ اس پرواز کے دوران جوں جوں ہم مشرق کی طرف پرواز کرتے جائیں گے تو وقت الٹا چلے گا۔

اس طرح ہمیں.....اُبھرتے سورج کے سنگ سفر کرنا پڑے گا۔

چونکہ

سورج مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

ہم جہاز میں سوار ہوئے تو دیکھا اکثریت سفید فام یورپی لوگوں کی تھی۔ قلیل تعداد میں ویت نام، ملائیشیا کے لوگ بھی تھے۔

ایشیائی چہرے تو صرف ہم تین ہی تھے۔

جہاز میں ہر نشست کے سامنے ٹیلی ویژن دیکھنے کے لئے چھوٹی سکرین جس پر فلمیں، ڈرامے، میوزک کے چینل تھے۔ جہاز کے سامنے اور زمین کی طرف کیمرے نصب تھے جو مسافر یہ دیکھنا چاہیں کہ وہ کس ملک علاقہ یا شہر کے اوپر محو پرواز ہیں.....وہ ان مناظر کو سکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔

ایسے مسافروں میں، میں بھی شامل تھا۔

میرے خیال میں ڈرامے اور فلمیں تو ہم گھر میں بھی دیکھ سکتے ہیں .....سکرین پر جہاز کے بارے میں مکمل معلومات دی جا رہی تھیں۔ جہاز کی رفتار، فضائی اور زمینی درجہ حرارت کے ساتھ جس علاقے یا ملک کے اوپر ہم محو پرواز ہوتے اُس کے نقشے بھی سکرین پر دکھائے جا رہے تھے۔ ان معلومات کے مطابق ہمارا جہاز 33 ہزار فٹ کی بلندی پر چھ سو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔

ملک ملک کی سیر

ہالینڈ سے جہاز اڑا تو جرمنی کے شہر برلن کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے پولینڈ، لیتھوینیا، روس کے صدر مقام ماسکو سے بحیرہ اسود سے گزر کر سمرقند بخارا پہنچا تو دل میں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور مجھے امام بخاری اور دوسرے اہل علم یاد آنا شروع ہوئے جنھوں نے اپنی زندگیاں فروغ علم کے لئے وقف کر دیں تھیں۔ ایک زمانے میں اس علاقہ پر روس نے قبضہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے مساجد بند اور اسلامی کتب کا مطالعہ اور عبادات ممنوع قرار دے دیں تھیں۔

ظلم و جبر کا زمانہ تھا۔

لیکن جب روس افغانستان سے نکلا تو اسے تقریباً سارے مسلم اکثریتی علاقے سوائے چیچنیا کے آزاد کرنے پڑے۔

جب ہم روس کے اوپر محو پرواز تھے تب موسم انتہائی خراب تھا۔ ایسے میں جہاز نے ہچکولے کھانے شروع کر دیئے، پائلٹ نے مسافروں کو حفاظتی بیلٹ باندھنے کی ہدایت کی تو میں سوچنے لگا:

ہوائیں کس قدر نرم اور لطافت بھری ہوتی ہیں لیکن جب یہی ہوائیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں تو سینکڑوں ٹن وزنی جہاز کو بھی جھنجھوڑ کر اپنی طاقت کا احساس دلا دیتی ہیں۔ ایسے میں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو

چیزیں نرم و نازک ہوں اُن میں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ مخفی طاقت بھی پنہاں رکھی ہوتی ہے۔

عورت اللہ کی خوبصورت تخلیق ہے جو دیکھنے میں نرم و نازک ہے لیکن انسانی تخلیق کے مراحل سے جب عورت گزرتی ہے تو اُسی نرم و نازک جان کو اللہ تعالیٰ اس قدر طاقت عطا کر دیتے ہیں کہ وہ فولاد کی مانند ان مراحل سے گزر جاتی ہیں۔

جہاز ازبکستان کے شہر تاشقند، سمرقند بخارا کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا افغانستان کے شہر مزار شریف پہنچا تو مجھے حضرت علیؓ کے اُس مزار کی یاد آنے لگی جسے مقامی لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہاں حضرت علیؓ کا مزار ہے۔

اسی مناسبت سے اس شہر کا نام مزار شریف ہے۔

یہ تحقیق طلب بات ہے۔

لیکن حیرت ہوتی ہے کہ محققین اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے۔

اگرچہ عوام میں حضرت علیؓ کا وہی مزار زیادہ مشہور ہے جو نجف اشرف میں ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ.....

حضرت علی کی شہادت نجف سے پندرہ کلو میٹر دور کوفہ کی جامع مسجد میں ہوئی تھی۔ تب مجھے اپنا وہ سفر یاد آنے لگا جب میں نے عراق کی سیاحت کے دوران نجف اشرف کی زیارت کی اور واپسی پر سفری یادیں قلم بند کی تھیں۔

میں نے مزار شریف میں حضرت علیؓ کے مزار کے بارے میں اپنے سفر نامہ.....پیغمبروں کی سرزمین.....میں لکھا تھا:

نجف اشرف کے علاوہ افغانستان کے صوبے بلخ میں مزار شریف کے مقام پر سلجوک حکمرانوں نے 1136ء میں حضرت علیؓ کا ایک عالی شان روضہ تعمیر کروایا تھا جو اب بھی موجود ہے۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ اسی روضہ کی مناسبت سے یہ شہر مزار شریف کہلاتا ہے۔

حضرت علی کے اس مزار کی ابتدا بھی ایک خواب سے ہوئی۔ سنا ہے 1100ء میں ایک مقامی تاجک ملاّ کو خواب میں اشارہ ملا کہ حضرت علی کو خفیہ طور پر بلخ شہر میں دفن کیا گیا تھا۔ بلخ میں اکثریت تاجک لوگوں کی ہے۔ چنانچہ خواب کے بعد انہوں نے وہاں ایک مزار بنا دیا۔ بعد میں چنگیز خان نے اس مزار کو تباہ و برباد کر دیا تھا، جسے عقیدت مندوں نے اُسی مقام پر بحال کر دیا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس مزار میں آتش پرست مذہب کے پیشوا ''زرتشت'' دفن ہے۔

پاکستان سے بھارت

مزار شریف سے جہاز کابل کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا رات سوا دس بجے پاکستان میں داخل ہوا تو خاک وطن کی خوشبو 33 ہزار فٹ کی بلندی پر محسوس ہونے لگی۔

وطن کی محبت کا جذبہ دل میں موجزن ہوتے ہی چہروں پر خوشگوار مسرت بکھیر دیتے ہیں۔ میں بھی ان پر مسرت لمحات سے گزر رہا تھا۔

ہمارا جہاز پشاور کے بعد اسلام آباد، راولپنڈی کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا جہلم، گجرات اور گوجرانولہ جب نقشہ پر نمودار ہوا تو خونی رشتے نے جوش مارا اور جی نے چاہا کہ اُتر کر چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف طارق، بھابی فاطمہ بتول، لاڈلی بیٹی فضیلہ یوسف اور پوتے حاجی ارحم سے ملاقات کرتا چلوں۔

لیکن.....

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جہاز گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے درمیان سے پرواز کرتا ہوا بھارت میں داخل ہوا اور پھر بھارتی پنجاب کے مختلف شہروں بشمول چندی گڑھ سے دلی پہنچا جہاں سے آگرہ کے اوپر سے سفر کرتا ہوا بھارت کے مشرقی صوبے اڑیسہ میں داخل ہوا اور پھر بھونیشور نامی شہر سے خلیج بنگال میں داخل ہو گیا۔

ہمارا جہاز پونے دو گھنٹے بھارت کے اوپر محو پرواز رہا۔

کالا پانی

خلیج بنگال میں داخل ہونے کے بعد تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ جہاز ہیلیئر نامی جزیرے پر پہنچا جو انڈومان یعنی کالا پانی کے نام سے مشہور ہے۔

کالا پانی.....کا نام سکرین پر نمودار ہوا تو مجھے انگریزی حکومت کے ظلم یاد آنے لگے۔ جنگ آزادی 1857ء کے بعد انگریز چن چن کر جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو گرفتار کر کے اس جزیرے میں لا کر قید میں رکھتے تھے۔ اس کھلی جیل میں ہندو مسلم سکھ سب ہی شامل تھے اور کمال کی بات یہ تھی کہ برصغیر کے تمام علاقوں سے عورتوں، مردوں اور بچوں کو لا کر ان جزائر میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

کالا پانی میں.....

سب کے مذہب، زبانیں اور تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے جدا تھے۔

لیکن

اس کے باوجود سب نے شیر شکر ہو کر قید کاٹی۔

یہ جزیرے کھلی جیل کے مانند تھے۔

کالا پانی کے جزائر دیکھے تو مجھے مولانا محمد جعفر تھانیسری یاد آئے جنھوں نے جنوری 1866ء سے نومبر 1883ء تک زندگی کے سترہ سال اس جزیرے میں قیدی کی حیثیت سے گزارے تھے۔ انھوں نے اپنی رودادِ قفس بڑے دردناک انداز میں.....کالا پانی.....یا تاریخ عجیب.....کے نام سے لکھی تھی۔

چند سال ہوئے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا تو ایک کتاب مجھ تک بھی پہنچی۔ میں نے یہ کتاب پڑھی تھی۔ آج جب ہم اس جزیرے کے اوپر محو پرواز تھے تو مجھے وہ تمام تکالیف اور مظالم یاد آنا شروع ہوئے جس کا ذکر اس کتاب میں درج ہے۔

ان جزائر پر انگریزی جبر اور ظلم سے فوت ہونے والے مولانا احمد اللہ جو انتہائی خستہ حالت میں بے یار و مددگار حالت میں اللہ کو پیارے ہوئے کی مغفرت کے لئے میں دعا گو ہوا۔ اسی طرح بہت سے گمنام مجاہد اس خاک میں مدفن ہیں۔ یہ وہ عظیم لوگ تھے جنھوں نے ایک مشن کی خاطر ظلم و جبر سہتے ہوئے

اپنی جانیں دیں۔

فضائی میزبانی

ہم KLM کی پرواز پر سفر کر رہے تھے۔

تقریباً بیس سال پہلے دمشق جاتے ہوئے میں نے اس کمپنی کے جہاز پر سفر کیا تھا تب کھانے پینے کے معاملے میں حالات کچھ بہتر نہیں تھے جس کا ذکر میں نے اپنے سفرنامہ ''پیغمبروں کی سرزمین'' میں اس طرح کیا تھا:

''اکثر لوگ پی آئی اے PIA کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ کھانا نہیں دیتے، ڈرنک نہیں دیتے۔ یہ نہیں کرتے وہ نہیں کرتے!

لیکن آج کے ایل ایم KLM نے جب (Cheese Burger) چیز برگر نما ٹھنڈا کھانا پیش کیا تو اس وقت پی آئی اے کا گرما گرم چکن پلاؤ، بریانی اور کباب بہت یاد آئے۔ فضائی میزبانوں کی طرف سے ادب آداب کے اظہار میں گرم جوشی تھی لیکن کھانے پینے کا معاملہ کافی ٹھنڈا رہا۔''

''پیغمبروں کی سرزمین'' نامی سفرنامہ شائع ہوا تو میں پاکستان گیا جہاں کے ایل ایم K L M اسلام آباد آفس کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی.....جس نے میرے سفرنامہ کا حوالہ دے کر کہا جناب.....آپ کی شکایت پر ہماری کمپنی نے غور کیا تھا جس کے نتیجہ میں ہم کھانوں میں بہتری لے آئے ہیں۔اس بات کا ذکر کمپنی نے اپنے فضائی میگزین میں بھی آپ کے حوالے سے کیا تھا۔اُس میگزین کی ایک کاپی میرے پاس تھی لیکن اب وہ دستیاب نہیں۔ہم آپ کے شکر گزار ہیں چونکہ مثبت تنقید ہمارے لئے مشعل راہ ہوتی ہے۔

آج میں کے ایل یم KLM کے ذریعے بارہ گھنٹے کے طویل سفر میں بھوکے پیاسے سفر کرنے سے گھبرایا ہوا تھا لیکن فضائی میزبان لڑکیوں نے ہمیں اُس وقت ورطۂ حیرت میں ڈال دیا جب انھوں نے قسم قسم کے کھانے کھلائے۔ پہلے ہلکے پھلکے کھانوں سے آغاز ہوا تو پھر مسلسل ہمیں کھلاتے رہے۔

جب فضائی خدمت گار رنگ برنگے کھانے کھلانے میں مصروف تھیں تب مجھے خیال آیا کہ کھانے پینے کے معاملے میں ڈچ Dutch ہمارے گوجرانوالہ کے بٹ Butt ہیں۔جن کی زندگی کا مشن ہی کھانا کھانا ہے۔

سنا ہے بٹ کھا کھا کر سیر نہیں ہوتے بلکہ تھک جاتے ہیں۔

فضائی میزبانوں کے کھانوں کا حساب لگایا تو اب تک انھوں نے سات قسم کے کھانے پیش کیے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ہمارے ایک مکتبہ فکر کے مطابق سات قسم کے کھانے نیاز یا ختم شریف پیش کرنے سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔ڈچ والے ثواب کی خاطر نہیں بلکہ اپنی ساکھ کی بہتری کے لئے خدمت کر رہے تھے تاکہ اگلی بار ہم پھر اسی ہوائی کمپنی کا انتخاب کریں۔

کے ایل ایم KLM کے اس جہاز پر تین سو مسافر سوار تھے۔

میں سوچنے لگا کہ ماہرین کا کتنا کمال ہے کہ تین سو مسافر اور پھر اُن کے سامان کے ساتھ جہاز کا ایندھن یعنی پٹرول.....اور پٹرول بھی اتنا کہ جس کا ہم حساب ہی نہیں کر سکتے۔

ہمیں صرف اتنا معلوم ہے .....

جمبو جیٹ جہاز ایک سیکنڈ میں ایک گیلن پٹرول استعمال کرتا ہے۔ یعنی ایک منٹ میں ساٹھ گیلن اور ایک گھنٹے کے سفر میں چھتیس سو گیلن جبکہ ہماری فلائیٹ بارہ گھنٹے کی تھی جس کے لئے جہاز کے ٹینک میں ساٹھ ہزار گیلن پٹرول بھی تھا۔مسافروں اور اُن کے سامان کا وزن اور ساٹھ ہزار گیلن پٹرول اور کھانے پینے کی اشیاء اور جہاز کا اپنا وزن ملا کر اگر حساب کریں تو میرے جیسے انسان کا حساب ختم ہو جاتا ہے لیکن علم کی بدولت انسان نے یہ کمال کر دکھایا کہ اتنا وزن اٹھا کر جہاز فضا میں چھ سو میل فی گھنٹہ کے حساب سے پرواز کرتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔

مسلسل بارہ گھنٹے پرواز کرتے ہوئے جہاز ملائیشیاء کے خوبصورت اور جدید ترین شہر کوالالمپور Kuala Lumpur پہنچا۔

یہاں سے ہم نے دوبارہ جہاز تبدیل کیا جس نے ہمیں صبح دس بجے ویت نام کے شہر ہو چی منہ سٹی پہنچایا۔

اسی شہر کے ایک کالج میں ہمارا بیٹا خرم نظامی انگریزی پڑھاتا تھا۔

۔ فتویٰ ۔

پرنٹنگ مشین جرمنی کے ایک سنار گوٹنبرگ نے 1455 میں ایجاد کی۔ اسوقت مسلم تہذیب تاریخی عروج پر تھی۔ عثمانی خلافت کی عظیم سلطنت ایشیا میں شام عراق ایران آرمینیا آذربائیجان اردن سعودی عرب یمن مصر تیونس لیبیا مراکو تک اور یورپ میں یونان روم بوسنیا بلغاریہ رومانیہ اسٹونیا ہنگری پولینڈ آسٹریا کریمیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ مذہبی علما نے فتوی دیدیا کہ پرنٹنگ مشین بدعت ہے اس پر قران اور اسلامی کتابوں کا چھاپنا حرام ہے۔عثمانی خلیفہ سلطان سلیم اول نے پرنٹنگ مشین کے استعمال پر موت کی سزا کا فرمان جاری کر دیا۔مسلم ممالک پر یہ پابندی 362 سال برقرار رہی۔ ہاتھ سے لکھے نسخے چھاپہ خانے کا مقابلہ کیسے کرتے۔۔!؟ کتابوں رسالوں کی فراوانی نے مغرب کو جدید علوم کا سمندر اور مسلم تہذیب کو بنجر سوچ کے جوہڑ میں تبدیل کر دیا۔ جاگے تو فکری بینائی کھو چکی تھی۔آخر 1817 میں فتوی اٹھا لیا گیا۔ لیکن ان پونے چار سو سال کی پابندی نے مسلم تہذیب کو عقیدوں کا ذہنی غلام بنا دیا۔ از خود سوچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا۔ یہ فاصلہ آج تک نہ صرف برقرار ہے بلکہ مزید بڑھتا جا رہا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ مسلمانوں کو اس تہذیبی زیاں پر ملال بھی نہیں، نہ ہی یہ تاریخ نصاب میں پڑھائی جاتی ہے کہ نئی نسل سابقہ غلطیوں سے سبق سیکھ سکے۔

'' شرف کا تاج ''

طلسمات

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

کارگاہِ جہاں، کارگاہِ جہاں
کارخانوں کا پھیلا ہوا سلسلہ
کارخانے جو قدرت کی تخلیق ہیں
اور قدرت کی تخلیق رکتی نہیں
چائے، کافی کا یا لنچ کا
کوئی وقفہ نہیں
کام شفٹوں کی صورت میں ہوتا بھی ہو
پھر بھی، رکتا نہیں
فرد ہو یا گروہ
لاکھ چھٹی منائے مگر، کام سے
مکت ہوتے نہیں
کام کی نوعیت کو بھی جانے بِنا
کام کی نوعیت، ماہیت، جبریت
جانتا کون ہے؟ سوچتا کون ہے؟
مانتا کون ہے؟

کارگاہِ جہاں کے سبھی ذی حیات
سارے مزدور، رہتے ہیں مصروف کار
خواہ دن ہو کہ رات
کام رکتا نہیں!

شرف کا تاج پہنا ہوا آدمی
چار پایہ، دو پایہ، پرندہ کوئی
یا ہو آبی حیات
مادرِ ارض کی گود میں رینگتا
ننھا کیڑا کوئی۔
مزد میں ہیں جُتے، سب ہی مزدور، یاں
کام رکتا نہیں!

''آئی، می، مائن'' کا شور اور غلغلہ
صرف خوش فہمیاں
''میں'' کا مفہوم گم ''مجھ کو'' کہنا لغو
اور ''میرا'' یہاں کچھ نہیں، کچھ نہیں

آپ اور ہم یہاں
اک طلسمات میں۔۔۔ ہیں
اگر ہیں۔۔۔ کہیں!
ورنہ کیا آپ، کیا ہم
کہیں ہیں۔۔۔؟
کہیں بھی نہیں۔۔۔!!

عجب گھڑی

افتخار عارف

(اسلام آباد)

عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو بلا رہے تھے
مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا
نظر میں اک اور ہی جہاں تھا
نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں
نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں
صلہ، جزا، خوف، ناامیدی
امید، امکان، بے یقینی
ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں
اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں
عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو
عجب نہیں آج بھی میری راہ دیکھتی ہو
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو
ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کر دیں
عجب نہیں میرے لفظ مجھ کو معاف کر دیں
عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

○

محبت ایجاد کرو

اگوسٹینو نیٹو (انگولا)

۔ترجمہ۔

امجد اسلام امجد (لاہور)

تمھاری دست رس میں ہیں
روحیں، عضلات اور حواس
انسان اور بے شکل مادہ
تم ان سے نت نئی چیزیں ایجاد کر سکتے ہو
کرو اور اپنی آنکھیں خشک رکھو

تم جنگلوں میں آلودگی سے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدبیریں
اختراع کر سکتے ہو
تم کوڑے کی وحشی قوت میں اضافہ کر سکتے ہو
تم چرے ہوئے درخت کے تنے سے خوشبو کشید کر سکتے ہو
کرو اور اپنی آنکھیں خشک رکھو

تم ایجاد کرو گے
جنگلی کلہاڑوں سے ستارے اور
بچوں کے آنسوؤں سے امن
تم غلامی کے آنسوؤں اور پسینے اور غلاموں کی نفرت سے امن
تخلیق کرو گے
تم امن ایجاد کرو گے
کرو اور اپنی آنکھیں خشک رکھو

تم غلامی کی شاہراہ سے آزادی کا رستہ نکالو گے
تم محبت کی آزاد اور کھلی سڑکوں پر محبت کو زنجیریں پہناؤ گے!
تم سولیوں پر جھولتے ہوئے تڑے مڑے جسموں سے مسرت
کے نغمے ایجاد کرو گے!
کرو۔۔۔!!
اگر تم واقعی کچھ ایجاد کر سکتے ہو
تو محبت ایجاد کرو
اور اپنی آنکھیں خشک رکھو

آج.....

پروین شیر
(نیوجرسی)

کل تک جوان کے حامی تھے
آج وہی منہ موڑ چکے ہیں
ان کے خال وخد میں سارے
گزرے ماہ وسال کے کتنے
گہرے داغ ابھر آئے ہیں
وہ اپنی ہی سست روی میں رینگ رہے ہیں!
اب اک اور توانا چہرہ
چاروں جانب چمک رہا ہے
سب اس کے دل دادہ ہو کر جھوم رہے ہیں
پارینہ وقتوں کے ساتھی
اب بھی ان کی انگلی تھامے
اونچے نیچے کچے رستوں
پر ہیں محوِ خراماں لیکن
جواں سال کے ساتھی پختہ
چکنی سڑکوں پر سرعت سے
بھاگ رہے ہیں
گزرے وقت کے دائیں بائیں فرش پہ بکھرے
گرد آلودہ، کورے کاغذ
رنگ برنگے قلم پڑے ہیں
وقت موجودہ کی گود میں بیٹھے
کمپیوٹر کے تختۂ حرف پہ
رقصاں ہر انگلی کی حرکت
حسرت سے تکتے رہتے ہیں!

○

احساسِ ندامت

یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

آج کل کچھ لوگ،
(میں بھی اُن میں شامل ہوں)
وقت گزاری کی خاطر
وٹس ایپ، فیس بک یا پھر ای میل وغیرہ کے
نت نئے لوگوں سے رابطہ رکھے، اپنی تنہائیوں میں
چند لمحوں میں طفل تسلی بھر لیتے ہیں
خود کو ہی جُل دے لیتے ہیں
لیکن تسکینِ روح کہاں ہو پاتی ہے
اکیلے میں بے طرح تڑپاتی ہے، گاہے رُلاتی ہے
آج جب میں فیس بک میں الجھا تھا، میرے یار گلزار نے مجھکو
جھنجھوڑا۔۔۔بھول گئے گلزار کو اپنے، نہ کرتے ہو اس سے رابطہ
اور نہ ہی فون اٹھاتے ہو۔
نت نئے یاروں میں الجھ گئے ہو کیا؟
میں خاموش، گنگ زباں، شرم سے پانی پانی
جیسے کوئی بیوہ، اپنی بیوگی میں خوشی کی پیوند لگاتی،
پکڑی گئی ہو۔۔۔!!

○

خسارہ

ناصر علی سید
(پشاور)

وہی منظر پرانا چاہتا ہے
پرندہ لوٹ آنا چاہتا ہے
سلاسل رزق کے پیروں سے باندھے
زمانہ آزمانا چاہتا ہے
زمین سے ایک رشتہ تو نہیں تھا
مگر دل آب و دانہ چاہتا ہے
تھکن پیروں سے اُٹھ کر دل سے لپٹی
سفر کوئی ٹھکانہ چاہتا ہے
جہاں روتی ہے پرکھوں کی حویلی
وہیں دل لوٹ جانا چاہتا ہے
وہ سب الزام میرے نام کر کے
بچھڑنے کا بہانہ چاہتا ہے
یہ دل پچھلا خسارہ بھول بیٹھا
پھر اس سے دوستانہ چاہتا ہے

○

آقا

فیصل عظیم
(کینیڈا)

غلاموں کی صفوں سے آ رہی ہیں کیسی آوازیں
کہ جیسے آج ہر اک تختِ شاہی کو گرا دیں گے
کہ جیسے ہر جلالِ بادشاہی کو جلا دیں گے
پریشاں ہو گئے آقا!
ابھی تو کچھ دیوں کی روشنی ہے آپ کی زد میں
ابھی تو کچھ اضافہ اور ہو گا آپ کے قد میں
ابھی تو کچھ اندھیرا اور بڑھنا ہے شبستاں میں
ابھی تازہ لہو کچھ اور بہنا ہے گلستاں میں
غنیمت ہے، ابھی تو تخت کے پائے سلامت ہیں!
مرے آقا! ابھی دربار کے سائے سلامت ہیں!

پریشاں ہو گئے آقا! ابھی تو رات باقی ہے
ابھی تو آپ جیتے ہیں، ابھی تو مات باقی ہے
ابھی تو زرد موسم ہے، ابھی برسات باقی ہے
ابھی کچھ وقت باقی ہے طلوعِ صبحِ امکاں میں
ابھی کچھ زنجیریں صدائیں دیں گی زنداں میں
ابھی کچھ اور سر، جو خم نہیں ہوں گے، قلم ہوں گے
ابھی کچھ اور ہاتھوں میں بغاوت کے عَلَم ہوں گے
ابھی کچھ اور افسانے اذیّت کے رَقَم ہوں گے
ابھی راہِ بقا میں اور کچھ تازہ ستم ہوں گے
پھر اُس کے بعد تم ہو گے، پھر اُس کے بعد ہم ہوں گے
پریشاں ہو گئے آقا!

○

- انسانی رزمیہ -

'زمین میری مسافت کے آگے کم پڑ گئی'

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

آسمانوں نے میرے نام
نقل مکانی کا سندیسہ لکھا
میں نے شاہ بلوط کے سائے میں
آنسو بہاتی عورت کی زرد پیشانی پہ
الوداعی بوسہ دیا
اپنے مردے زمیں کے سپرد کیے
اور اجنبی سرزمینوں پہ
اپنے قدموں کے نشان چھوڑنے چل دیا
زمین
میری مسافت کے آگے کم پڑ گئی
میں نے اپنی تھکن اتار کر رستے پہ رکھ دی
جہاں سنگِ میل اگ آیا
میری زبان میں بھوک کا ذائقہ رینگنے لگا
میری زندگی
خوراک اور خوشبودار جسموں کی تمنا میں بسر ہوئی
میں نے جانوروں کی سیرتوں کو جانا
اور سخی مزاج پیڑوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیے!

اس عورت کی تمنا میں
میں نے جدائی کی ان گنت شامیں بسر کیں
پرندوں کی چہکار میں اس کی آواز کے ریزے چنے
اس کے بغیر
سورج میری منڈیر سے اڑ گیا
اور دریا نے اپنا رستہ بدل لیا
میرے جسم کا چولہا بجھ گیا
میرا زندہ وجود
اس کی یاد میں مٹی ہو گیا
وقت نے میرے حصے کے اچھے دن چرا لیے
میرے پیڑ کی شاخوں سے پانی برستا رہ گیا
میں نے اس کے بغیر بارش کو منہ نہ لگایا
اپنے تعاقب میں آتی بھوک کو دیکھ کر
میں نے بارش کے نام سندیسہ لکھا
دشمن کے سیاہ دل کے لیے پتھر سے انی بنائی
اور اپنے پھٹے لباس کے لیے پیوند ایجاد کیا
قبیلے کی سب سے جہاندیدہ عورت سے
محبت کا ہنر سیکھا
اور بھوکے شیر کے مقابل ڈٹ گیا!

اپنے عارضی پڑاؤ کے سامنے
میں نے اس حسن پیشہ عورت کے لیے
گارڈینیا کے پھول بوئے
اور آسمان کے نیلے ٹکڑے سے اس کے گلابی پاؤں کے لیے فرش بنایا
میں نے اپنے پہلو میں تازہ پانی کا کنواں کھودا
اور اسے اس کی تشنگی کے نام انتساب کیا
میں نے اپنے پڑاؤ میں
اس کے نام کا آتشدان روشن کیا
شفاف چشمے کا آئینہ چلو میں بھرا
اور قبیلے کے ناتواں شخص کے لیے
بیساکھی بنانے کا خواب دیکھنے لگا
ابھی دلوں پہ اداسی کی آیت نہ اتری تھی
ابھی گھر
میری یادوں کے ورق پہ تسطیر نہ ہوا تھا
میں نے اپنا انتظار
نرسلے کی جڑوں میں انڈیلا
اور سینے کے ہرے زخم
بانسری کے نام ہدیہ کیے
میری اداسی
دل سے نکل کر ہواؤں میں سرایت کر گئی!

امن کی فاختہ

العدروس
(جدہ)

زمینِ حرم سے اڑو فاختاؤ
زمانے میں چاروں طرف پھیل جاؤ
سبق ربطِ باہم کا سب کو پڑھاؤ
بہر گام تم نخلِ الفت اگاؤ
بہرسو سبیلِ محبت لگاؤ
بہرحال چاہت کا پرچم اڑاؤ
پروں پر نوید محبت رقم ہو
حدیث سکون سلامت رقم ہو
رواداریوں کی روایت رقم ہو
تحمل کی ساری حکایت رقم ہو
محبت کا مضمون چہکار میں ہو
فرشتوں کا انداز رفتار میں ہو
صدامست انسان کے پیار میں ہو
کوئی شاخ زیتون منقار میں ہو
ہر اک شعلہ ساماں کو شبنم بناؤ
جو ہیں زخم زخم اُن پہ مرہم لگاؤ
بلا تفریق بھرو تم سب کے گھاؤ
بجھے تاکہ برسوں کا جلتا الاؤ
کرو توپ کے سب دھانوں کا ٹھنڈا
نشانوں ، تیروں ، کمانوں کو ٹھنڈا
سِنانوں کو ٹھنڈا میانوں کو ٹھنڈا
عداوت کے سب ترجمانوں کو ٹھنڈا
ذرا گیسوئے شب کو زنجیر کر دو
نئی صبح آنکھوں میں تصویر کر دو
زمانے میں دو چند توقیر کر دو
ہویدہ ہمیں مثلِ تنویر کر دو
تو اے خطۂ ہند کے چاند تارو
تمہیں سے مخاطب ہوں اے میرے پیارو
خدا نے جو بخشی ہے نعمت یہ تم کو
علاقہ ہے، قریہ ہے بستی ہے گھر ہے
پہاڑی ہے دریا ہے یا کوئی تھر ہے
بہت ہی بڑا یا بہت مختصر ہے
یہ جو بھی ہے جیسا ہے اور جس قدر ہے
ابوجد کی قربانیوں کا ثمر ہے
غریبوں کی پونجی نحیفوں کا زر ہے
یتیموں کا دل ہے شہیدوں کا سر ہے
یہ سب ہے مگر تم کو پیارا اگر ہے
تو ہونا بہرحال شیروشکر ہے
تشدد عناد و عداوت سے بچنا
کوئی رُت ہو انساں کی نفرت سے بچنا
وطن کی حفاظت ہے دینی فریضہ
وطن کو جو چاہے وطن ہے اُسی کا
شہیدوں نے کی ہے عطا یہ امانت
تو لازم ہے تم سب پہ اس کی حفاظت
نبھایا اگر عہد تم نے وفا کا
رہے گا صدا فضل تم پر خدا کا
محبت کو اپنی عبادت بنا لو
خلوص و رحم اپنی عادت بنا لو
محبت تو تعلیم ختم الرسل ہے
محبت ہی جزو ہے محبت ہی کُل ہے

یوسفِ ثانی

انجم جاوید
(لاہور)

اُس کی خوابیدہ آنکھیں
اور نیلے ڈورے
اکثر مجھ سے کہتے ہیں
ہم اس خوف میں رہتے ہیں
جس دنیا کی فتح کی خاطر تم اس حد تک پہنچے ہو
اس سے آگے مت جانا
اس رستے کے راہی بالآخر پتھر ہو جاتے ہیں
خواہشِ جاں کے صورت گر خود بے منظر ہو جاتے ہیں
لیکن یہ سب باتیں۔۔یہ سارے مفروضے خوب نہیں
وہم و گماں ہو جانا حق آگاہوں کو مرغوب نہیں
یوسف پر اک بار زلیخا کی چالوں سے الجھا ہے
پھر اک بار
اک ملکِ سبا کی خوشبو ہدہد لائی ہے
اور بلقیس کی خواہش ہے
اس کا مفتوح سلیماں ہو
کوئی کہاں تک اس منزل سے گریزاں ہو
دامنِ یوسف
پھر اک بار زلیخا کے ہاتھوں میں ہے
اور میری تقدیر کی ساری کالک ان راتوں میں ہے

○

"نیپوٹزم"(Nepotism)

شیبا کوثر
(برہ بترہ آرہ، بہار)

زہر آلود فضاؤں میں
دائرے میں سمٹتے لوگ
پگھلتے برف کی طرح
وجود اپنا کھوتے ہوئے
موسم کی تبدیلی کے
یہ ہیں گواہ سارے
لیکن! یہ تبدیلی
بہتر نہیں کسی کے لئے
فنا ہو جائے گی
کتنی ہی بستیاں
ہیں اثرات اسکے جہاں جہاں
بہتر یہی تھا کہ
موسم نہیں بدلتے
جیسے بھی تھے جو کچھ
ویسے ہی رہتے سب کچھ
کھلا کھلا سا آسمان ہوتا
روشن ہر ایک مکان ہوتا
سارا شہر ایک جسم ایک جان ہوتا
چہرہ گلاب کوئی یوں نہ ہلکان ہوتا
بہتر یہی تھا کہ
موسم خوشنما ہی رہتا
گلاب گلاب رہتے سورج سورج ہی رہتا
اگر یہ "نیپوٹزم" نہ آتا
سکون زندگی کا یوں رائیگاں نہ جاتا۔۔۔!!

○

حسرت موہانی

(سیاست اور ادب کا بڑا نام)

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

سید الاحرار (رئیس الاحرار) سید فضل الحسن حسرت ۱۸۷۵ء میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ موہان تھا تو چھوٹا سا قصبہ لیکن اس کو خطۂ اودھ کا یونان کہا جاتا تھا۔ یونان کے ساتھ ہی آپ کو اگر سقراط کی یاد آئے تو میں آپ سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ حسرت موہانی میں تھوڑی بہت سقراطیت ضرور تھی۔ یہاں سقراطیت سے میری مراد حق گوئی اور بے باکی سے ہے اپنے کردار کی اس صفت کی وجہ سے وہ اہل حکومت اور اہلِ سیاست دونوں کی نظروں میں کھٹکتے رہے۔ دونوں ان سے بیزار بھی رہے اور خوف زدہ بھی۔ اس نکتے پر آپ جتنا غور کریں گے اتنا ہی میرے اس تقابل کو جائز قرار دینے پر مجبور ہوں گے۔ میں نے موہان سے یونان اور حسرت سے سقراط کی جانب آپ کی سوچ کو موڑا وہ سطحی اور رسمی نہ تھا۔ اب اگر کوئی صاحب حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرف توجہ مبذول کرنے کا اشارہ فرمائیں گے تو وہ بھی درست ہوگا کیونکہ حسرت کے مزاج میں غفاریت کے عناصر بھی آسانی سے دریافت کیے جاسکتے ہیں۔

حسرت موہانی کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا سے جا ملتا ہے۔ والد کا نام سید ازہر حسن تھا۔ ان کے جدامجد سید محمود نیشاپور سے موہان آئے تھے۔

کیوں نہ ہوں اردو میں حسرتؔ ہم نظیریؔ سے نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاکِ نیشاپور سے

چھٹپن موہان میں گزرا۔ مسلمانوں کی رواجی تعلیم کے علاوہ موہان مڈل سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔ موہان سے ان کے والد فتح پور سہوہ آ گئے۔ حسرت کو یہاں اچھی رفاقتیں میسر آئیں۔ نیازؔ فتح پوری کا ساتھ بھی ملا فتح پور کو شاید جلد فراموش نہ کر سکے۔

اب تلک موجود ہے کچھ کچھ لگا لائے تھے ہم
وہ جو اک لپکا کبھی خاک جہاں آباد سے

گورنمنٹ ہائی سکول سہوہ سے ۱۸۹۹ء میں امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ علی گڑھ گئے وہاں ہم جماعتوں میں خادمِ کعبہ مولانا شوکت علی اور سجاد حیدر یلدرم، احباب میں عبدالہادی خاں وفا اور کرامت اللہ اور اساتذہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین اور پروفیسر چکرورتی کے مرتبے کے لوگ میسر آئے۔ علی گڑھ ہی میں ان کی شخصیت کھل کر سامنے آئی۔ ادب اور سیاست میں یکساں دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج سے نکالے گئے۔ بی اے کا امتحان پرائیویٹ طالب علم کے طور پر دیا۔ ریاضی اور عربی اختیاری مضامین تھے۔ نتیجے سے قبل ہی ''اردوئے معلیٰ'' جاری کر دیا۔ اس مجلّے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ادب کے ساتھ سیاسی موضوعات پر بھی مضامین شامل ہوتے تھے۔ حسرت نے ایک چھاپہ خانہ (پریس) بھی قائم کیا۔ یہ پریس لکڑی کا تھا۔ بعض اوقات حسرت کو سارا کام تنِ تنہا کرنا پڑتا۔ وہی رسالہ (اردوئے معلیٰ) ترتیب بھی دیتے۔ کتابت کرتے، پروف پڑھتے پتھروں پر اتارتے اور لکڑی کے پریس کی مدد سے پرنٹ نکالتے۔ لیتھو طباعت کا زمانہ تھا البتہ اسٹیم پریس آ گئے تھے لیکن حسرت کی مالی وساطت سے باہر تھے۔ ''اردوئے معلیٰ'' کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ جریدہ ہی حسرت کی جیل یاترا کا موجب بنا۔ یہ تو میں نے بتا دیا تھا کہ اس میں سیاسی نوعیت کے مضامین بھی درج کیے جاتے تھے۔ اس میں سدیشی تحریک کے دوران بدیشی مال کے بائیکاٹ کے مضامین شائع ہوئے۔ کانگریس کے سخت گروہ اور تلک کی شان میں اشعار شائع کیے گئے۔ جس مضمون نے حسرت کو جیل بھجوایا وہ مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی کے موضوع پر تھا بقول علامہ سید سلمان ندوی ایک طالب علم اقبال سہیل کا تحریر کردہ تھا۔ انگریز سرکار نے پہلے مرحلے پر صرف مضمون نگار کا نام دریافت کیا تھا کیونکہ مضمون کے ساتھ نام درج نہیں تھا۔ حسرت نے یہ موقف اختیار کیا کہ مضمون نگار کا نام بتانا ان کے لیے ضروری نہیں۔ وہ اس طالب علم کو کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے خود کو داؤ پر لگا دیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور وہ جیل بھیج دیئے گئے قید بامشقت کی سزا بھگتنے۔ میں اگر ان کا دوسرے مدیرانِ جرائد سے مقابلہ کرنے بیٹھ جاؤں تو ان کو اس ضمن میں اپنی مثال آپ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ درحقیقت وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ جس وقت وہ جیل جا رہے تھے دیوانِ حافظ شیرازی ان کے ساتھ تھا۔ راستے میں کھولا درج ذیل شعر نکلا:

حیرتا از درمے خانہ کشادہ طلبیم
بر درِ دوست نشینم و مرادے طلبیم

آج کل تو یہ رواج نہیں رہا لیکن پہلے حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالنے کا طریق عام تھا۔ میں اور میرے دو احباب اس کے بے حد شوقین تھے۔ میٹرک کے امتحان کے نتیجے کے سلسلے میں بھی حافظ شیراز سے رجوع کیا تھا۔ ایک مرتبہ دیوان حافظ سے فال نکالنے کے دوران یہ خیال آیا ''کیوں نہ غالبؔ سے رجوع کیا جائے'' غالب سے رجوع کیا۔ دو تین سوال کیے لیکن اُول جلول جواب ملے۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک مرتبہ اور آزمانے کی ٹھانی۔ اس دفعہ سوال کسی معاشقے سے متعلق تھا۔ بڑا ہی مناسب جواب ملا۔ بڑا لطف رہا۔ اسی نوعیت کے اور معاملات میں بھی غالبؔ صاحب نے کمال رہبری فرمائی۔ ہم دوستوں نے ان کو عشقیات کے لسان الغیب کے مرتبے پر فائز کر دیا۔

۱۹۱۰ء میں حسرت آزاد ہوئے۔ ''اردوئے معلیٰ'' پھر جاری ہو گیا۔ حسرت کی سیاسی سرگرمیاں بھی جاری ہو گئیں۔ کانگریس میں تلک گروہ کا ساتھ، سرگروہ احرار آرو بندو گھوش کی حمایت۔ فیروز شاہی کانگریس سے بیزاری، مسلم لیگ سے لال چندی کانفرنس سے بیزاری۔ درحقیقت حسرت کا یہ موقف تھا کہ انگریز سرکار

سے آزادی طلب کرنے کے بجائے لیگ اور کانگریس اس کے طالب ہیں کہ ہندوستانیوں کو غلام سے ترقی یافتہ غلام اور محکوم سے خوش حال محکوم بنادیا جائے۔ ۱۹۰۷ء میں جب تلک گروپ کانگریس سے باہر ہوا تو حسرت بھی کانگریس سے نکل آئے تھے۔اس کے فوراً بعد حسرت نے ایک لائحہ عمل پیش کیا جس کو ''دفاعی مزاحمت کا لائحہ عمل'' کہا گیا۔یہی وہ نظریہ ہے جس کو عدم تشدد کے ناموں سے گاندھی جی نے بعد میں اختیار کیا۔حسرت نے اپنے نظریے کی وضاحت اس طرح کی کہ اس وقت کے تقاضے کے طور پر انگریز سرکار کے مقابلے میں تین راستے مہیا ہیں ایک راستے کو وہ بھیک یا گوایانہ طلب کا راستہ کہتے تھے اور دوسرے راستے کو تشدد اور جنگ وجدل کا راستہ کہتے تھے۔ان دونوں راستوں کے برخلاف ایک تیسرے اور درمیانی راستے کے قائل تھے اس کو ''دفاعی مزاحمت'' کے راستے کا نام دیتے تھے۔

قید فرنگ سے آزادی پاتے ہی حسرت عملی سیاست کے میدان میں گامزن ہو گئے۔انجمن خدام کعبہ اور ہلالِ احمر کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا اور بھیجا۔انگریز سرکار کو ان کی سرگرمیاں پسند نہیں آئیں اور ان کا نزلہ ''اردوئے معلیٰ'' کے چھاپہ خانے پر گرا۔ضمانت کے لیے نوٹس بہ نفسِ نفیس خود سپرنٹنڈنٹ پولیس سر جیمس مسٹن نے پہنچایا۔کسی بھی بڑے سے بڑے پریس سے عام طور پر پانچ سو روپے زرِ ضمانت لی جاتی تھی۔ایک آدھ سے ہزار روپے اور شاید صرف ایک مثال دو ہزار روپے زرِ ضمانت طلب کرنے کی بھی تھی۔ ''اردوئے معلیٰ'' کے پریس کی مالیت ہی قریباً پچاس روپے کی ہوگی جو لکڑی کے پریس اور دو پتھروں پر مشتمل تھا ایسے پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کرنا حکومت کی زیادتی نہیں بلکہ سراسر ظلم تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت نے ''اردوئے معلیٰ'' بند کر دیا۔کتابوں کی دکان کی نیلامی ہوگئی۔''اردوئے معلیٰ'' مئی جون ۱۹۱۳ء میں حسرت نے اپنے چھوٹے سے جھونپڑے نما مکان کی مکانیت، پریس کی مالیت اور پرچے کے خریداروں کی تفصیل بیان کی ہے۔یہ فقرہ ملاحظہ کیجیے ''فقیروں کا اس سے مرعوب ومغلوب ہونا کسی صورت سے ممکن نہیں۔'' اسی مضمون میں وہ اپنی بیگم کے لیے ''کوہِ عزم وثبات بیوی'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ان کی بیگم کے بارے میں یہ الفاظ حقیقت پر مبنی ہیں۔

آپ نے دیکھا انگریز حاکموں نے کس طرح اس مردِ حریت اور صداقت کو قید و بند وہ بھی بامشقت سے موڑنے اور توڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے خیالات میں لچک آئی اور نہ ہی مبارز طلبی میں کمی واقع ہوئی۔ہمارے موجودہ سیاستدانوں کی مانند اس نے اس نظریے کو بنیاد بنا کر ''سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی'' فرنگیوں اور مزنگیوں کے چاپلوس ہندوستانیوں کے حق میں کوئی ''یوٹرن'' (رویے کی یکسر تبدیلی) نہیں لیا، خواہ ان ہندوستانیوں کا تعلق کانگریس سے ہو یا مسلم لیگ سے۔مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء بمقام آگرہ میں جب کانپور کی مسجد کی انہدام کے قضیے کو طے کرانے کے سلسلے میں لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا ریزولیشن (قرار داد) پیش کیا جانے لگا تو حسرت نے مخالفت کی (بحوالہ سید سلیمان ندوی)۔اسی سال پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔برطانوی حکومت کو یہ خبر ملی کہ حسرت اور مولانا ابوالکلام آزاد کو برکت اللہ کی عارضی حکومت سے کچھ خط ملے ہیں اور حسرت کا بل جانے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ ان کے گھر چھاپہ پڑا، خانہ تلاشی ہوئی اور ان کو نظر بندی کا حکم دیا گیا۔ان کی بیگم اور چند احباب نے مشورہ دیا کہ حسرت کو نظر بندی قبول کرنی چاہیے لیکن حسرت نے نظر بندی کی مزاحمت کی اور للت پور جیل میں قید کر دیے گئے۔۱۹۱۹ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔مقصد سرکارِ برطانیہ کے خلاف شکایتی قرارداد پیش کرنا تھا۔یہ قرارداد تحریکِ خلافت اور عالمِ اسلام کے معاملات میں ہندی مسلمانوں کے جذبات سے سرکارِ برطانیہ کی بے حسی کے خلاف تھی۔حسرت موہانی نے اس تجویز میں ہندوستانی افواج کے بائیکاٹ کی ترمیم پیش کی بعد میں علی برادران نے اس ترمیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔۱۹۔جنوری ۱۹۲۰ء کو مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرے ہند سے ملاقات کی۔مقصد صلح کانفرنس میں خلاف کے لیے ہمدردیاں حاصل کرنا اور اس کے لیے ایک وفد انگلستان بھیجنے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔تھا تو یہ مسلمانوں کا وفد لیکن اس میں علی برادران، حکیم اجمل خان، انصاری، عبدالباری، چھوٹانی، ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کے علاوہ ڈاکٹر کچلو، گاندھی جی، سوامی شردھانند بھی شامل تھے۔ترک معاملات کی تحریک میں بھی حسرت پیش پیش تھے۔ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی تھی حسرت سدیشی تحریک میں سرگرم ضرور تھے لیکن گاندھی جی کے چرخے اور کھدر کی تحریک کے خلاف تھے۔کانگریس کے اجلاس ناگپور (۱۹۲۰ء) میں حسرت نے اس اختلاف کا برملا اظہار بھی کیا (بحوالہ ہامفورڈ اور سید سلیمان ندوی)۔۱۹۲۱ء میں ترک معاملات، تحریک استقلال، مکمل آزادی (سوراج) کا مطالبہ، اعلانیہ گوریلا جنگ کی تجویز پیش کی۔گاندھی جی کی کوششوں سے حسرت کی یہ تجویز نامنظور کر دی گئی۔احمد آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس حسرت کی صدارت میں ہوا۔ان کا صدارتی خطبہ ضبط کر لیا گیا اور ان کو ۲۲۔اپریل ۱۹۲۲ء کو قید بامشقت دی گئی۔دو سال کے لیے اگرچہ پہلے ہی رہا کر دیے گئے۔۱۹۲۵ء میں حسرت کی کوششوں سے پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کانپور میں منعقد ہوئی۔اس زمانے میں حسرت کے فرمودات غضب کے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ کمیونزم مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کے خطبۂ استقبالیہ سے دو ایک فقرے ملاحظہ فرمائیے:

''ہم مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے۔۔۔ سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے زیادہ سخت ہے''

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حسرت تاعمر ایک سچے مسلمان اور پکے عاشقِ رسولؐ رہے۔

اسی سال ابن سعود نے حجاز پر حملہ کر دیا۔حسرت کی صدارت میں لکھنو میں آل انڈیا حجاز کانفرنس منعقد ہوئی اور ہندی مسلمانوں نے ابنِ سعود اور اہلِ نجد کے ہاتھوں مقابر اور مساجد کی تباہی اور بالقصد بے حرمتی کی مذمت کی۔ ۱۹۲۶ء میں حسرت حج کی سعادت حاصل کرنے گئے۔وہاں سعودی حکومت نے

حاجیوں سے ٹیکس لینا شروع کیا ہوا تھا حسرت نے اس پر اعتراض کیا اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ عالمین حکومت نے ان سے اور ان کے ساتھیوں سے وہ ٹیکس نہیں لیا۔ (اردوئے معلیٰ فروری ۱۹۲۶ء تحریر سید سلیمان ندوی)

سائمن کمیشن ۱۹۲۹ء میں ہندوستان آیا تو حسرت اور گاندھی جی کے دو قطعی مختلف رویے سامنے آئے۔ حسرت سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے مخالف تھے اور گاندھی بائیکاٹ کے مبلغ تھے۔ حسرت نے اپنے گنتی کے چند ساتھیوں کے ساتھ کالی جھنڈیوں سے گاندھی جی کا کانپور میں استقبال کیا وہ ان کے ساتھی گاندھی ''گو بیک'' (Gandhi Go Back گاندھی واپس جاؤ) کے نعرے لگا رہے تھے جب کہ لوگوں کا ایک جم غفیر ''سائمن گو بیک'' (سائمن واپس جاؤ) کے نعرے لگا رہا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اکیلے رہ گئے اور اکیلے ہی نعرے لگاتے رہے۔ اس مسئلے پر مسلم لیگ میں بھی دو دھڑے دیکھنے میں آئے تھے۔

ان ہی دنوں حسرت نے کانپور سے ایک روزنامہ ''مستقبل'' جاری کیا لیکن زیادہ عرصہ نہ چل سکا البتہ 'اردوئے معلیٰ' جس کو حسرت نے ۱۹۲۵ء میں دوبارہ جاری کیا تھا بڑے عرصے تک چلا۔

جن دنوں کیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا اور ۱۹۲۵ء کے آئین کی منظوری عمل میں آئی حسرت نے شیخ مشیر حسین قدوائی، مولانا آزاد سبحانی اور سید ذاکر علی کی رفاقت میں آزاد پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس پارٹی کے اغراض و مقاصد میں کامل آزادی کے لیے ہندو مسلمانوں کو متحد کرنا۔ اس پارٹی کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور وہ عام انتخابات میں حصہ نہ لے سکی۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید عمل میں آئی۔ مسلم لیگ کو یوپی میں مقبول بنانے میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور حسرت کا بڑا دخل ہے۔ حسرت یوپی کی مجلس عاملہ کے مستقل رکن رہے۔ مسئلہ فلسطین کو اجاگر کرنے کے لیے حسرت نے ۱۹۳۹ء میں مغربی ممالک کا عزم کیا لیکن دمشق پہنچے تھے کہ جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ آگے جانے کے راستے مسدود ہو گئے لیکن حسرت نے ارادہ ترک نہیں کیا۔ دمشق سے بیروت پہنچے۔ ایک جہاز میں جگہ ملنے پر یونان چلے گئے۔ یونان سے ریل میں سفر کیا۔ لندن کے راستے میں ویزا نہ ہونے کی وجہ سے دو ایک جگہ قید بھی ہوئے لیکن اہلِ انگلستان تک مسئلہ فلسطین پر ہندی مسلمانوں کے جذبات پہنچا کر رہے۔

۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس کی ہندوستان آمد پر مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ حسرت چاہتے تھے کہ قائداعظم نو آبادیات پر راضی نہ ہوں۔ وہ بغیر اجازت اسٹیج پر چڑھ گئے۔ ہجوم نے نعرے بازی کی ''نہیں سُنیں گے'' آخر کار مجمع چپ ہو گیا۔ حسرت نے کہا ''قائداعظم کے برخلاف میں پاکستان ڈومینین کا نہیں بلکہ پاکستان جمہوریت کا علم بردار ہوں'' ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں پانچ جمہوریتیں قائم ہونی چاہئیں (۱) مشرقی پاکستان (۲) مغربی پاکستان (۳) مرکزی ہندوستان (۴) جنوب مشرقی ہندوستان (۵) جنوب مغربی ہندوستان اور حیدرآباد دکن۔ ان سب کو وفاقی ہند کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں حسرت نے کافی دوڑ بھاگ کی۔ دہلی میں قائداعظم سے اور واردھا میں راجگوپال اچاریہ، پٹیل اور گاندھی سے ملاقاتیں کیں۔ ۱۹۴۵ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

مارچ ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں راست اقدام کی تجویز پیش ہوئی۔ حسرت نے ترمیم پیش کی کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی قائم کر لیں اور پاکستان کا دستور تیار کریں۔ تقسیم کے بعد حسرت موہانی ہندوستان میں رہ گئے اپنے موقف اور اصولوں سے ہٹے بغیر۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز تھی کہ مسلمانوں کو کانگریس میں ضم ہو جانا چاہیے اور اسلامی اداروں کو صرف سماجی امور تک محدود ہو جانا چاہیے۔ حسرت موہانی کو وہ اپنا حمایتی نہ بنا سکے۔ جوناگڑھ اور حیدرآباد پر ہندوستانی فوج کے قبضے پر سردار پٹیل سے مخاطب ہو کر فرمایا ''تم نے وہی کام کیا ہے جو ہسنگز، ولزلی اور کلائیو نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقتور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں سے آزادی چھینی ہے۔ تمہارے محکمے پر خدا کی لعنت ہو۔'' یوپی اسمبلی میں اس تجویز کی مخالفت کی جو حیدرآباد میں ہندوستانی فوج کی فتح پر مبارک باد دینے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ شیخ عبداللہ سے کشمیر کے مسئلے پر ان کی جھڑپ ہوئی۔

قائداعظم کی وفات پر روزنامچے میں لکھا تھا ''۱۲۔ ستمبر ۱۹۴۸ء آج صبح گھر سے نکلنے پر قائداعظم کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اپنا مقصد پورا کر کے دنیا سے اٹھے ایسی کامیابی بہت کم لیڈروں کو نصیب ہوتی ہے۔''

۱۹۵۰ء میں مولانا حسرت موہانی نے آخری بار (گیارھویں بار) فریضۂ حج ادا کیا (نہایت عسرت اور تنگ دستی کے باوجود) کراچی، لاہور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے۔ جمال میاں فرنگی محل سے کہہ دیا تھا کہ اب زیادہ دن نہیں جینا۔ ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں آخری روزنامچہ تحریر کیا ''آج رات کو میں نے عالم رویا میں جنت کا نظارہ بہت اچھی طرح کیا۔ بہشت کی ایسی صورت پیش نظر ہوئی کہ دل کو یقین ہو گیا کہ یہی اس کی اصلی صورت ہے۔ واللہ اعلم۔ انتقال (۱۳۔ مئی ۱۹۵۱ء ساڑھے تین بجے صبح) سے تین دن پہلے خواہش ظاہر کی کہ ان کی دواؤں کا حساب صاف کر دیا جائے اور کچھ رقم دواخانے میں فاضل جمع کر دی۔ وفات کے دن حساب بالکل برابر تھا کوئی پیسہ ان کے ذمہ واجب الادا نہیں تھا۔

مولانا حسرت موہانی کے عقب میں نہ سرمایہ تھا، نہ زمین تھی اور نہ ذاتی جائیداد جبکہ سیاست کے کاروبار میں ان کی ہمہ وقت ضرورت رہتی ہے۔ ان کے بغیر نہ تو لیڈری چلتی ہے اور نہ ہی چمکتی ہے۔ وہ جن کو اہلِ جمہور (عوام) کہا جاتا ہے ان کے ہاتھ ہوتے ہیں جن کے پاس یہ سب ہوتا ہے۔ گنے چُنے لوگ ان کے بغیر آج کی سیاست میں کامیاب ہو پاتے۔ یہی گِنے چنے لوگ صحیح معنوں میں لیڈر، خادم قوم اور راہبر کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

حسرت موہانی ہندوستان کے ایک سچے سیاسی لیڈر کے طور پر نا قابلِ فراموش ہیں۔ پاکستان میں بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے اور لیا جاتا رہے گا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

۔ جاری ہے ۔

''رہیے اب ایسی جگہ۔۔۔''

فرح کامران
(نیوجرسی)

بچپن میں اسلام آباد کی کڑاکے کی سردی کے دنوں میں رات کے وقت لحاف میں اپنے ٹھٹھرتے ہاتھ پاؤں گرم کرتے ہوئے نانی اماں سے قصے کہانیاں سننے کا اپنا ہی لطف تھا۔ کتنے برسوں کی گرد نے بھی اس منظر کو دھندلا نہیں ہونے دیا۔ پریوں، بھوتوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانیاں ہمیں کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی تھیں۔ اپنی زندگی کے قصے سناتے سناتے نانی اماں اکثر کسی بیماری، طاعون کا بھی ذکر کرتیں اور بتاتیں کہ اس وبا نے کتنی قیامت ڈھائی، اس لمحے ننھے ننھے قطرے ان کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگتے، اور دکھ ان کے لہجے میں امڈ آتا، ہمیں نانی اماں کی زبان سے یہ وبا والا قصہ کبھی اچھا نہیں لگا۔ ہمیں تو عادت تھی ایک خوشگوار اختتام کی جس کے بعد کسی پری یا شہزادی کا عکس اپنی آنکھوں میں سجائے ہم نیند کی آغوش میں چلے جائیں اور صبح کی تازگی ہمیں اس احساس کے ساتھ جگائے کہ جیسے ہم بھی کوئی شہزادی ہوں۔ وہ وقت پیچھے رہ گیا، ہم عمر کی سیڑھیاں چڑھتے رہے، نانی اماں نہیں رہیں، کہانیاں ذہن کے کسی کونے میں دبک کر بیٹھ گئیں البتہ طاعون اور دوسری وبائی بیماریوں کا ذکر نانی اماں کے بعد بھی سنتے رہے لیکن کس پر کیا گذری، اس داستان نے ہمیں کبھی اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ سچ ہے کہ مصیبت سے جب تک انسان خود نبرد آزما نہ ہو، وہ مصیبت نہیں بنتی، محض ایک واقعہ ہوتی ہے۔ ہم نے کب سوچا تھا کہ نانی اماں نے جو زمانہ دیکھا تھا وہ ہمیں بھی دیکھنا پڑے گا۔ حالانکہ نانی اماں کے زمانے اور ہمارے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے، دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے لیکن بے بسی کا عالم وہی ہے۔

کرونا وائرس چین میں اودھم مچاتا رہا، ہم آرام سے بیٹھے رہے۔ ہم تو امریکہ کے باشندے ہیں جو سوپر پاور ہے، جس نے پوری دنیا میں تہلکہ مچایا ہوا ہے، یہ نامراد جرثومہ جو مائکروسکوپ کی مدد سے بھی مشکل سے نظر آتا ہے وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہاں تو بہترین علاج میسر ہے، ذرا سی تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو وہ ایسے خدمت پر مامور دکھائی دیتا ہے کہ گمان ہونے لگتا کہ ہم ڈاکٹر ہیں اور وہ مریض۔ اپنے ملک کا وہ زمانہ یاد آجاتا جب اگر کبھی ہسپتال کا رخ کرنا پڑ جاتا تو لمبی قطار کی تکلیف اس بیماری سے زیادہ محسوس ہوتی جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے ہسپتال کا رخ کیا ہوتا۔ اس پر ستم یہ کہ اس لمبی قطار کا مقصد کبھی اپنی باری پہ جانا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ جو قطار میں ہوتا تھا وہ وہیں کھڑا رہتا تھا اور اندر جانے والے کہیں سے اچانک نازل ہوتے اور فوراً "ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو جاتے۔ غصہ تو بہت آتا لیکن احتجاج کی صورت میں ہونے والی بے عزتی کے خوف سے اس کو پینا پڑتا۔ اکثر تو ایسا ہوتا کہ ہم اپنی باری کے انتظار میں بالکل قریب پہنچ جاتے تو سننے کو ملتا "لنچ ٹائم ہو گیا ہے کل آنا"۔ کس قدر خون کھولتا، ایسے میں ڈاکٹر کا نخرہ تو جو ہوتا وہ ہوتا، دروازے پر کھڑی چپراسن بھی اپنے آپ کو ڈاکٹر سے کم نہ سمجھتی۔ اس کے ہاتھوں اپنی بے عزتی ہمیں ہرگز گوارا نہ تھی اس لئے جو ہوتا اس کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر اپنے اندر کی کڑھن کو ٹھنڈا کر لیتے۔ شاید اسی لئے ہمارے ہاں لوگ ڈاکٹروں سے بھاگتے ہیں اور گھر میں ہی دم دینا بہتر سمجھتے ہیں، کم از کم موت تو عزت کی نصیب ہو۔

کرونا وائرس نے ہمارا کیا بگاڑنا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ امریکہ میں قدم رکھتے ہی پکڑا جائے گا۔ لیکن نہیں بھئی، ایک دن خبر ملی کہ اس کے ناپاک قدم سرزمین امریکہ میں داخل ہو گئے۔ دنیا بھر میں مانی ہوئی ائرپورٹ انتظامیہ نے ان دنوں کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی یا وہ بھی شاید ہماری طرح تکبر کا شکار تھی۔ سچی بات ہے ہم نے تب بھی کان نہ دھرا کیونکہ کرونا صاحب امریکہ کے دوسرے کونے میں تھے۔ ہمارے کان تو اس دن کھڑے ہوئے جب یہ نیویارک پہنچا، خاص طور سے نیویارک کا دل جسے ہم NYC کہتے ہیں۔ اس کا نیویارک میں پہنچنا تھا کہ وہ دن میں رونق افروز اور رات کو روشن افروز گلیوں میں دندنانے لگا۔ ایک جرثومہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ اس نے کچھ ہی دنوں میں شہر کے ہر گوشہ بساط کو جو کبھی دامنِ باغبان و کفِ گل فروش ہوا کرتا تھا، ویران کر دیا۔ نیویارک جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ The City that never Sleeps وہ نانی اماں کی کہانی جیسا سویا ہوا محل بن گیا۔ سینکڑوں لوگ اس شہر کی رونق دیکھنے کہاں کہاں سے آتے اور اس کی اونچی لمبی، آسمانوں سے باتیں کرتی عمارتیں سر اٹھا کر دیکھتے، اور اب وہ ہی عمارتیں سر جھکائے خاموشی سے گلی گلی انسان کی تلاش میں ہیں اور شہر تنہائی کا عذاب جھیل رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کرونا وائرس نیویارک اور اردگرد کی ریاستوں میں پھیلنے لگا، موت زندگی پر غالب آنے لگی۔ اموات جلدی جلدی اعداد بدلنے لگی، مریضوں کی تعداد چند سے سو اور سو سے ہزاروں تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ 7 مارچ کو نیویارک میں ایمرجینسی نافذ کی گئی تو مریضوں کی کل تعداد 5 تھی، ایک ماہ میں لاکھوں اس کی گرفت میں آ گئے اور ہزاروں لقمہء اجل بن گئے، امریکہ کے بہترین ہسپتال اور قابل ڈاکٹروں کا زعم پارہ پارہ ہونے لگا اور انسان کی حقیقت کا بھرم فاش ہو گیا۔ ہمیں بھی اپنے ملک کی ناقدری پہ نادم ہونا پڑا۔ اعتماد آہستہ آہستہ خوف میں بدلنے لگا۔۔۔ دفاتر، اسکول، بزنس کے دروازے بند ہونے لگے۔ دھندے ماند پڑنے لگے، بے روزگاری کی فہرست طویل ہوتی چلی گئی، ضروری اشیاء کا میدان صاف ہونے لگا، ماسک، دستانوں اور ہینڈ سینیٹائزر (hand sanitizers) کا بازار گرم ہونے لگا۔ چہرہ چھپانا ضروری ہو گیا اور ہاتھ ملانا ممنوع قرار پایا۔ پارک کے کناروں پر پیلا ربن باندھ کر کھلی فضا میں سانس لینے والی جگہ غیر ممنوعہ علاقہ ٹھہرائی گئی۔ دوڑتی بھاگتی زندگی گھر میں قید رہنے پر مجبور ہو گئی۔ انسان کمزور پڑنے لگتا ہو تو خدا پر اس کا یقین مضبوط ہونے لگتا ہے اور انسان دلی سکون کے لئے عبادت گاہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن اب کے یہ عالم ہوا کہ

دعا کے لئے مساجد، مندر، چرچ تک جانے پر پابندی عائد کردی گئی۔

کام کی نوعیت بس یہ رہ گئی کہ ہر وقت ہاتھ یا تو صابن سے دھوتے رہیں، یا پھر سینیٹائزر ملتے رہیں۔ لیکن پھر بھی مصیبت کہ اس بات کا گمان رہتا ہے کہ کرونا صاحب ہمارے ہاتھوں پہ اٹھکیلیاں کررہے ہیں مگر نظر نہیں آرہے۔ گویا 'صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کی مصیبت میں مستقل گرفتاری۔ ہاتھ دھونے سے جو وقت بچ جاتا وہ گھر کا سامان لانے اور اس کو ٹھکانے لگانے میں صرف ہوتا۔ پوچھئے وہ کیسے؟؟ بھئی وہ ایسے کہ سامان کے ساتھ یہ خوف بھی آجاتا کہ کہیں اس میں چھپ چھپا کر کرونا بھی نہ آگیا ہو۔ اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے سارے سامان کو گرم پانی کا غسل دینا پڑتا، اس بات سے قطعہ نظر کہ اس طریقہ غسل سے بہت سے کھانے والی چیزوں کی غذائیت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ ایسی ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات جو انسان کو ایک الجھن میں مبتلا کردیں۔ مثال کے طور پر ہاتھ منہ کے قریب نہ لے جائیں. اب بتایئے بھلا کہ جن ہاتھوں میں جب کچھ کرنے کی ہمت آئی تو سب سے پہلے انہیں منہ میں ڈالا اور حس ذائقہ کی مدد سے یہ جاننے کی کوشش کی ہاتھ ہے کیا بلا اور اس کا مصرف کیا ہے، تب سے ہاتھ اور منہ کا چولی دامن کا ساتھ رہا اب ان کو سکھانا ہے کہ عمر بھر کا ساتھ چھوڑ دیں۔ پھر social distancing کا پرزور اصرار، یعنی انسان، جس کو سماجی جانور کہتے ہیں، وہ اب اس عہدے سے دستبردار ہو جائے، محض جانور ہی رہ جائے۔ ہائے کہ انسان انسان سے دور بھاگنے لگا۔ راہ چلتے اگر کوئی نظر آجائے تو کنی کترا کر گذرنا پڑتا۔ چچا غالب سے معذرت کے ساتھ؛ "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں"، شاید چچامیاں آج کے دور میں ہوتے تو اس مصرعے میں ان کو بھی ترمیم کرنی پڑتی۔

ہر چیز سے فراغت حاصل ہوگئی اور ایسی فراغت کہ کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ حالانکہ اس کی تلاش ہمیں ایک عرصے سے تھی لیکن اس کا بھی وہ ہی حال ہوا جو عموماً" کسی شدت سے منتظر چیز کو پالینے کے وقت ہوتا ہے، یعنی کچھ ایسا ہو جاتا کہ اس بات کی خوشی ہی نہیں رہتی۔ اب فراغت ہاتھ آئی تو ہم ڈپریشن کا شکار ہوگئے۔ قلم اٹھانے کی ہمت نہ رہی کتابوں سے جی بے زار ہوگیا۔ خیال تھا کہ کچھ لکھ لینے سے شاید وحشت میں کمی آجائے، ہم ذہن کے کواڑ پہ دستک دے دے کر تھک گئے، لیکن کورا کاغذ ہمیں اداس نظروں سے تکتا ہی رہ گیا۔ ٹی وی، اخبار، اور سیل فون پر ہر تھوڑی دیر بعد سوائے یہ جاننے کے اور کوئی کام نہ رہ گیا کہ آج کتنے لوگ جنگ میں شامل ہوگئے، کتنے ہار گئے اور کتنے فتح یاب ہوگئے، فیس بک جس پر ہر تھوڑی دیر بعد انگلیاں مچل مچل کر دنیا جہان کی ٹوہ لینے پر اکساتی رہتیں اب سیل فون کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرنے لگیں کہ کسی پاکستانی یا جاننے والے کی بری خبر نہ مل جائے۔ موت کا دکھ تو ہر انسان کے لئے ایک جیسا ہی ہونا چاہئے لیکن حقیت یہ ہی ہے کہ ٹیس تب ہی اٹھتی ہے جب کوئی اپنا جاتا ہے۔ اس عالم میں دل صرف ایک ہی نوید کا منتظر رہنے لگا، صرف ایک ہی نوید۔۔۔ کہ اس موذی وبا کا علاج دریافت ہوگیا ہے یا ہونے والا ہے لیکن امکان کے دروازے پر مسلسل ایک موٹا سا تالا ہمیں منہ چڑاتا نظر آیا، جس کی چابی کی تلاش میں سال دو سال لگ سکتے ہیں۔ " کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک".

موت حلق میں پھندا کرنے لگی۔ کبھی گلے میں خراش، کبھی سر میں درد، کبھی تھکن کا گمان رہنے لگا، حتی کہ جس چھینک کے آنے پر کبھی الحمد اللہ کہا کرتے تھے، اب اسی پر سر سے پاوں تک خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا نظر آنے لگا کہ محسوس ہوتا کہ ہم بھی اسی قطار میں لگ چکے ہیں، اور یہ سوچ کر دل دہل جاتا کہ اگر ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا۔ زندگی ہزار جھمیلوں میں گھری سہی لیکن دنیا سے جانے کا دل کس کا چاہتا ہے۔ جب تک نہیں آئے تھے تو اور بات تھی۔ اور پھر انسان کی صرف اپنی ذات تھوڑی ہوتی، کتنے لوگ ایک جان کا حصہ بن جاتے ہیں، پہلے تو زندگی کا بھرپور طریقے سے مزا لینے کا وقت دیا جاتا ہے پھر اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ اس وبا کے اثرات مختلف عمروں کے لوگوں پر مختلف طرح سے پڑے۔ جو اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہوئے، وہ اس خوف میں مبتلا کہ اگر کچھ ہوگیا تو یہ بوجھ کون اٹھائے گا۔ اپنے ہمسفر کے ساتھ زندگی کا سفر آخری سٹیشن تک جاری رہنے کی خواہش کس کی نہیں ہوتی۔ بیچ سٹیشن پر اتر جانے کا خوف سر پر منڈلانے لگا۔ اور اگر زندگی کی گاڑی جو دو پہیوں پر چلتی ہے، ایک پہیئے پر آجائے تو زندگی یوں بھی خوف کے سائے میں گذرنے لگتی ہے۔ اس پر لدی ذمہ داریوں کے بوجھ کو گھسیٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور ہر وقت یہ خوف سر پر منڈلاتا رہتا ہے کہ پتا نہیں ایک پہیئے کی گاڑی اس بوجھ کو منزل تک پہنچا سکے گی یا نہیں۔ ایسی گاڑی چلانے والی اگر صنف نازک ہو تو اور بھی مشکل، کیونکہ luxury گاڑی چلانے والے لوگ اپنی زندگی کے معمولی بوجھ کو اپنی گاڑی میں رکھنے کے بجائے اس ایک پہیئے کی گاڑی میں ڈالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ بہتر ہوتے ہیں لیکن اپنی محرومیوں، اپنی کوتاہیوں کی گٹھری، اپنے غصے کا پلندہ اپنی گاڑی سے اٹھا کر ایک پہیئے کی گاڑی میں پھینک کر اپنی ذہنی آسائشوں کو وقتی تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی اگر ایسی صورت حال سے دوچار ہو تو ان کا خوف دوگنا۔

ادھیڑ عمر والوں اور نوجوانون کے لئے دوسری طرح کی مشکل۔ بزرگوں کو اس بات کا اعتراف کرکے زیادہ ہشیار ہونا پڑا کہ اب وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں کرونا وائرس سے جنگ لڑنا پڑی تو ہار ان کی ہی ہوگی تو بہتری اسی میں ہے کہ مکمل lockdown میں چلا جایا جائے۔ جبکہ نوجوان اس خود اعتمادی میں مبتلا نظر آئے کہ کرونا کیا اس کا باپ بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ نسل ویسے ہی اس زعم میں مبتلا ہے کہ ہم اپنے بڑوں سے بہت زیادہ بہادر اور ذہین ہیں اور جو باتیں ان کو سمجھائی جاتی ہیں وہ فضول اور بے معنی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا کیا ہی ہمارے آگے آرہا ہے، اپنے دور میں ایسے ہی گھمنڈ میں ہم بھی مبتلا تھے۔ ہمارے سامنے بھی دو بچے جو دو دہائی سے زیادہ کا سفر طے کرچکے ہیں اور چونکہ تعلق صنف مخالف سے ہے اس لئے ہر صورت میں ہم ہی کمزور ٹھہرائے جاتے ہیں، حالانکہ انہیں بہادر اور ذہین بنانے میں سو فی صد ہمارا ہی ہاتھ ہے۔ لاکھ

امریکہ جیسے ملک میں پلے بڑھے ہیں لیکن رگوں میں خون تو دیسی ہی دوڑ رہا ہے۔

بچوں نے ہمارے قد سے جوں ہی اپنا قد نکالا تو ہم نے یہ ہی غنیمت جانا کہ اب بات بات پر ٹوکنا اور پیچھے پڑنا چھوڑ دینے میں ہی ہماری عزت ہے۔ لیکن ناس پیٹے اس کرونا وائرس کا جس کی وجہ سے ہمیں برسوں کی چھوڑی ہوئی عادت کو دوبارہ شروع کرنا پڑا۔ دونوں بیٹوں کو دستانے، ماسک اور ہینڈ سینیٹائزر لا کر نہ صرف دیئے بلکہ اپنے سامنے گاڑی میں اور ان کے بیگ میں رکھوائے بچوں کی طرح اب ان پر دوبارہ نظر رکھنی ضروری ہوگئی۔ جیسے ہی باہر سے آتے تو فورا" ہاتھ دھونے کی تلقین اور باہر گزارے ہوئے وقت کی تفتیش ہمارے نئے معمول کا حصہ بن گئے، دستانے پہنے تھے؟ ماسک لگایا تھا؟ ہینڈ سینیٹائزر استعمال کیا تھا؟ وہ فورا" ہی تابعدار بچوں کی طرح جواب دیتے، "جی ماما"۔ لیکن ہمیں پتا ہے کہ یہ فارمولا وہ بہت پہلے سیکھ گئے تھے کہ ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو، خاص طور سے اگر کہنے والے ماں باپ ہوں۔ ہاتھ دھونے جاتے تو ہماری کوشش ہوتی کہ چھپ کر دیکھیں کہ ہاتھ ٹھیک طرح سے دھو رہے ہیں کہ نہیں۔ وہ بھی ہماری لاج رکھنے کے لئے ہاتھ دھونے چلے جاتے، اگر ان کو ذرا بھی خدشہ ہو جاتا کہ ہم دیکھ رہے ہیں تو ہاتھ ٹھیک طرح سے دھوتے ورنہ بس تھوڑی دیر نل کھول کر بند کر دیتے۔ بس گھر میں کچھ ایسا ہی ہنگامہ رہنے لگا جیسا بچپن میں رات کو سونے سے پہلے دانت صاف کرنے اور صبح ہونے پر نہانے پہ ہوتا۔ ہینڈ سینیٹائزر کا کیا حال کیا اس کا پتا ہمیں اس وقت لگا جب ہمیں ان کی گاڑی میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ سینیٹائزر پڑا ہوا ہے، اس سے پہلے کہ ہم کچھ پوچھتے بڑے صاحبزادے نے فخر سے اس کو اٹھا کر ہمیں دکھایا۔۔۔ See Mommy... Hand Sanitizer گویا کہہ رہے تھے کہ دیکھئے میں کتنا اچھا بچہ ہوں آپ کی ہر بات مانتا ہوں۔

ہم نے سینیٹائزر کو اس کے ہاتھ سے لیا۔۔۔ وبا پھیلے ہوئے 20 یا 25 دن ہو چکے تھے اور سینیٹائزر کی بوتل کھلی بھی نہیں تھی، چھوٹے صاحبزادے کی گاڑی میں بیٹھے تو ان کی گاڑی میں سینیٹائزر تھا ہی نہیں، ان کو صفائی کا خبط ہے اس لئے انھوں نے اس کو بحفاظت گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا تھا۔" کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا"۔

ایک دن ہم ایسی ہی پریشانی میں تھے کہ ہمارے ولی عہد نے ایک دم کہا yeyyyymama, ہم نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی، ہمارے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہم نے خوشی سے مچلتے، دھڑکتے اور بے قابو دل کو سنبھالتے ہوئے کہا" کیا ہوا؟ علاج دریافت ہو گیا؟ بیٹے نے اسی انداز میں ذرا مسکرا کر کہا"We beat China" اور اپنی نظریں اسی طرح جھکائے رکھیں۔ تھوڑی دیر تو ہم سناٹے میں آ گئے، لگا کہ تیزی سے دھڑکتا ہوا دل بند ہو جائے گا، پھر دل چاہا کہ عدم تشدد کو خیر آباد کہہ دیں، لیکن چند سیکنڈ سناٹے میں رہنے کے بعد ہمارا قہقہہ چھوٹ گیا، ہم تینوں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

سچ ہے کہ زندگی یہ ہی ہے، دکھ، پریشانی، اور غم کے بادل کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، زندگی اس میں سے روشنی کی کرن نکال ہی لیتی ہے۔ ہر مصیبت کو پیچھے چھوڑ کر زندگی کو آگے بڑھنا ہی ہوتا ہے۔ اور اس کو آگے بڑھنے سے نہیں روکنا چاہئے۔ ہر چند کہ اردگرد کے حالات مایوس کن ہیں، دل اداس ہے، خوف نے گھیرا کیا ہوا ہے، لیکن ان حالات میں بھی اس بات پر شکر کرنا چاہئے کہ زندگی ابھی ہمارے ساتھ ہے۔ زندگی کو بھرپور طریقے سے گزاریئے لیکن احتیاط لازم ہے۔ یہ موقع گھبرانے کا نہیں، سنبھل کر چلنے کا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ کرونا اپنی اوقات بھول گیا ہے۔

اب انسان کے مقابلے میں اکھاڑے میں اترا ہے تو مٹی چٹوا کر ہی دم لیں گے۔ حضرت علی کا فرمان یاد رکھئے کہ مصیبت میں گھبرانا اس سے بڑی مصیبت ہے۔

ایجاد کی ماں

مندر	مزار
بت	قبر
سادھو	ملنگ
جوگی	پیر
درشن	زیارت
ڈنڈوت	سجدہ تعظیمی
پھیرے	چکر
پرشاد	تبرک
بھجن	قوالی
کیرتن	دھمال
کریا کرم	قل چہلم
پنڈت	مرشد
بھگت	مجاور
جنم دن	میلاد
دیوالی	شب برات
دسہرہ	تعزیہ
تانترک بابا	عامل بابا
راکھی	امام ضامن
داسی	مُریدنی
تنتر منتر	تعویز گنڈا
بتوں کو غسل	قبروں کو غسل
سادھو نہیں نہاتا	ملنگ نہیں نہاتا

ایک صدی کا قصّہ

ماسٹر غلام حیدر

دیپک کنول (ممبئی)

گرمیوں کے دن تھے۔ دانتوں کا ایک ڈاکٹر اپنے گھر میں بیٹھا تھا تبھی ایک بھکاری اُسکے گھر کے سامنے سے ایک گانا گاتے ہوئے گزر گیا۔ گانا تھا۔ بابا ایک پیسہ دے دے بابا، بابا ایک پیسہ دے دے۔ وہ اس گانے سے اسقدر متحرک ہوا کہ وہ اُسی وقت اپنے ہارمونیم پر بیٹھ گیا اور اُسنے اس گانے کو راگ پہاڑی دھن میں باندھا۔ اس گانے کے بول یوں تھے۔ راوی کے اُس پار سجنوا، راوی کے اُس پار۔ بعد میں اُسنے اس گانے کو اُمراؤ ضیا بیگم کی آواز میں صدا بند کیا گیا۔ یہ گانا جب ریڈیو لاہور سے بجا تو اس گانے نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ پربھات فلمز کمپنی کے کیشو رام بھولے اس گانے سے اسقدر متاثر ہوا کہ اُسنے اپنی مراٹھی فلم میں اسی دھن پر ایک مراٹھی گانا تیار کر کے اسے اپنی فلم میں شامل کیا۔

اس گانے کا خالق ماسٹر غلام حیدر تھا۔ غلام حیدر سن 1908 کو نارووال پنجاب میں پیدا ہوا۔ غلام حیدر ایک مسلم میراثی خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے کی گائیکی کی ایک لمبی تاریخ تھی۔ یہ لوگ میلے ٹھیلے یا تیج تیوہار میں روایتی لوک گیت گایا کرتے تھے۔ انہیں راگ راگنیوں پر ید طولی حاصل تھا۔ ان میراثیوں میں بہت سارے ایسے بھی نکلے جنہوں نے کلاسیکل موسیقی میں نام کمایا۔

غلام حیدر کے گھر والے اپنے بچے کو اس پیشے سے الگ کچھ بڑا بنانا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اُسے اسکول میں داخل کرایا۔ وہ بھی پڑھائی میں محنت کرتا گیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ سنگیت سے بھی جڑا رہا۔ وہ کئی طرح کے ساز بجا کر اپنا دل بہلاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد گھر والوں نے اُسے ڈینٹری کالج میں داخلہ دلا دیا۔ اُسنے ڈینٹسٹ کی پڑھائی پوری کی اور اُسے دانتوں کے ڈاکٹر کا سرٹفکیٹ مل گیا۔ گھر والے خوش تھے کہ اُنکا بچہ ڈاکٹر بن گیا۔ اُنہیں کیا پتا تھا کہ یہ دانتوں کا ڈاکٹر اپنے لئے کچھ اور سوچ کے بیٹھا ہے۔ چونکہ اُسکی رگوں میں اپنے خاندان کا خون دوڑ رہا تھا اسلئے وہ سنگیت سے دور نہ رہ سکا۔ اُسنے بابا گنیش لال سے موسیقی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ جب اُسنے ڈاکٹری کے پیشے کو خیر باد کہا تو اُسے والدین کے قہر کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے اس قدم نے اُنہیں کافی چوٹ پہنچائی۔ وہ کیا کیا خواب لے کے بیٹھے تھے۔ بیٹے نے اُنکے خوابوں کو تحس نحس کر کے رکھ دیا۔ اُسنے گھر چھوڑ دیا اور کلکتہ جا کر پہلے الفرڈ تھیٹر کل کمپنی اور پھر الیکز نڈر تھیٹر کل کمپنی میں پیانو بجانے کی نوکری کر لی۔ بعد ازاں جب وہ کلکتہ سے لاہور لوٹا تو اُسنے سیٹھ جنک داس کی جینوفون میوزک کمپنی میں بطور میوزک کمپوزر کام کیا۔ وہاں پر اُسنے مشہور گائیکہ اُمراؤ ضیا بیگم کا گانا ریکارڈ کیا جو کہ پنچولی اسٹوڈیو لاہور میں کام کرتی تھی۔ بعد میں امراؤ ضیا بیگم اُسکی بیگم بن گئی۔ وہاں وہ ترقی کرتے کرتے چیف میوزک کمپوزر بن گیا۔

اُسے سنگیت پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ لوگ اُسے ڈاکٹر صاحب کہہ کے نہیں بلکہ ماسٹر جی کہہ کے بلاتے تھے۔ جن دنوں وہ جینوفون میوزک کمپنی میں کام کرتا تھا اُسنے ایک بال کلاکار کی آواز سنی تو وہ اُسکی آواز سے کافی متاثر ہوا۔ اُسنے اُس لڑکی کی آواز میں ایک پنجابی گانا ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔ ہاتھ جوڑا پکیا دا۔ یہ بارہ سالہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ شمشاد بیگم تھی۔ کمپنی کے مالک نے اس گانے کو اتنا پسند کیا کہ ایک سال میں اُسنے شمشاد بیگم کے دو سو گانے ریکارڈ کئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا تھا تبھی ایک بھکاری اُسکے گھر کے سامنے سے ایک گانا گاتے ہوئے گزر گیا۔ گانے کے بول تھے۔ بابا ایک پیسہ دے دے۔ وہ اس گانے سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اُسی وقت ہارمونیم پر بیٹھ گیا اور اُسنے راگ پہاڑی میں اس گانے کی ایک دھن تیار کی اور اُسکے بول ایسے تھے۔ راوی کے اُس پار سجنوا، راوی کے اُس پار۔ بعد ازاں اُسنے امراؤ ضیا بیگم کی آواز میں اس گانے کو ریکارڈ کیا۔ جب یہ گانا ریڈیو لاہور سے بجا تو اس گانے نے تہلکہ مچا دیا۔ موسیقار نوشاد نے جب یہ گانا سنا تو وہ بھی داد دئے بنا نہ رہ سکا۔ بعد میں اُسنے فلم ''میلہ'' میں اسی طرز پر ایک گانا بنایا جس کے بول تھے۔ ''دھرتی کو آکاش پکارے'' جو کہ شمشاد بیگم اور مکیش کی آواز میں تھا۔ یہ تھا ماسٹر غلام حیدر کی دھنوں کا جادو۔

ماسٹر غلام حیدر کو فلم میں پہلا بریک فلم ''تھیف آف بغداد'' میں ملا۔ یہ فلم 1934 میں ریلیز ہوئی۔ روپ کے شوری اور اے آر کاردار نے غلام حیدر کے سنگیت سے اپنی فلموں کو آراستہ کیا۔ یہ فلمیں تھیں، ''مجنوں'' اور ''سورگ کی سیڑھی''۔ ان فلموں سے غلام حیدر کو کوئی خاص مقبولیت نہیں ملی۔ اسکے بعد ڈی ایم پنچولی نے اُسے اپنی پنجابی فلم کے لئے سائن کیا جس کا نام ''گل بکاؤلی'' تھا۔ پنچولی فلم انڈسٹری کا ایک بہت بڑا نام تھا۔ اس فلم میں غلام حیدر نے نور جہاں سے گانے گوائے۔ نور جہاں تب بے بی نور جہاں تھی جب ماسٹر غلام حیدر نے اُسکا ایک پنجابی گانا شیلا پنڈ دی کوڑی سنا۔ غلام حیدر جوہر شناس تھا۔ اُسے نور جہاں کی آواز کی دلکشی نے کافی متاثر کیا۔ اس سے پہلے نور جہاں نے اکیلے بہت کم گانے گائے تھے۔ جتنے بھی گانے گائے تھے اُن سے اُسے کوئی خاص پہچان نہیں ملی تھی۔ ماسٹر غلام حیدر نے نور جہاں کی آواز کی وہ خوبی پہچان لی تھی جو اُسے ملکہ ترنم بنا سکتی تھی۔ پہلی بار ماسٹر غلام حیدر نے اُس سے ''گل بکاؤلی'' کے گانے گوائے۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں میں ثریا نور جہاں، سلیم رضا، ہیم لتا اور جبیں تھیں۔ فلم نے دھوم مچا دی۔ اس فلم کے گانے زبان ذد عام ہو گئے۔ نور جہاں کی آواز نے تہلکہ مچا دیا۔ یہ فلم 1939 میں ریلیز ہوئی۔ اُسنے ایک اور پنجابی فلم ''یملا جٹ'' کو اپنی خوبصورت دھنوں سے آراستہ کیا۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔ اس فلم کے ستارے تھے ایم اسماعیل، نور جہاں، درگا کھوٹے، پران اور انجنا۔ یہ بھی پنچولی پکچرس کے بینر تلے بنی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار موتی بھائی گڈوانی تھے۔ ماسٹر غلام حیدر کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

نور جہاں اور غلام حیدر کی جوڑی اتنی مقبول ہوگئی کہ ہر فلمساز ان دونوں کو اپنی فلم میں سائن کرنا فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھتا تھا۔ کئی سالوں تک یہ دونوں پاکستانی فلمی موسیقی پر راج کرتے رہے۔ ماسٹر غلام حیدر نے پنجابی سنگیت میں جس طرح پنجابی اور سندھی لوک سنگیت کو روایتی سازوں کے ساتھ جوڑ کر ایک نئی رفعت اور مقبولیت بخشی اُس نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے کئی مشہور سنگیت کاروں کو حیران کر دیا۔ ان میں ہنس راج بہل، شیام سندر، حسن لال بھگت رام اور فیروز نظامی کا نام قابل زکر ہے۔ اُنہوں نے بھی روایتی روش سے ہٹ کر غلام حیدر کی تقلید کی جس نے پنجابی اور سندھی لوک سنگیت کو اپنا کر پنجابی فلمی سنگیت کو امر کر دیا تھا۔

دلسکھ پنچولی نے ماسٹر غلام حیدر کو لاہور سے کلکتہ بھیجا تا کہ وہ نیو تھیٹرس کے سنگیت کا مشاہدہ کر سکے۔ نیو تھیٹرس میں جن سنگیت کاروں کا بول بالا تھا وہ تھے، پنکج ملک، انل بسواس اور آر سی بورل جن کا فلم ''پریزڈنٹ'' میں کے ایل سہگل کی آواز میں گایا صدا بہار گانا ایک بنگلہ بنے نیارا نے دھوم مچائی تھی۔ جب غلام حیدر کلکتہ سے لاہور لوٹا تو اُسنے دلسکھ پنچولی سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ کسی کی تقلید کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی پسند اور اپنے ڈھنگ کا ہی سنگیت تیار کرے گا۔ دلسکھ ایم پنچولی کو غلام حیدر کی صلاحیتوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُسنے اپنی ہندی فلم ''خزانچی'' کی موسیقی کی ذمہ داری غلام حیدر کو سونپی۔ اس فلم کے مرکزی اداکار ایم اسماعیل، رمولا، ایس ڈی نارنگ اور جانکی داس تھے۔ یہ فلم 1941 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ اس فلم کا سنگیت کافی مقبول ہوا۔ خاص کر یہ گانا جسے شمشاد بیگم اور غلام حیدر نے اپنی آواز بخشی تھی وہ گانا تھا، ساون کے نظارے ہیں۔ شمشاد بیگم اس فلم کی بدولت راتوں رات اسٹار بن گئی۔ اس فلم نے فلمی سنگیت میں ایک انقلابی بدلاؤ لایا۔ اس فلم کے سنگیت نے انڈسٹری کے جید موسیقاروں کو سوچنے پر مجبور کیا۔ اس سے پہلے کا سنگیت کلاسیکل راگوں میں بندھا ہوتا تھا۔ غلام حیدر نے ان تمام موسیقاروں کو ایک نئی راہ دی تھی۔ اُنہیں یہ بتا دیا تھا کہ فلم کا سنگیت اس طرح کا ہونا چاہیے جس میں اپنی مٹی کی خوشبو ہو۔ وہ بھی اپنی طرزوں میں بدلاؤ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ یہ فارمولہ بعد میں خوب چلا۔ ایس ڈی برمن اور سلیل چودھری نے جس طرح بنگالی لوک سنگیت کو فلموں میں متعارف کرایا اُسکی مثال نہیں ملتی۔ وہ سارے گانے بیحد مقبول ہوئے جنہیں لوک سنگیت کی دھنوں میں ڈھالا گیا تھا۔

ماسٹر غلام حیدر کی انڈسٹری میں طوطی بول رہی تھی۔ پنچولی بردرز نے اُسے اپنی فلم ''خاندان'' کے لئے معاہدہ بند کیا۔ یہ فلم بھی پنچولی پکچرس کے بینر تلے بن رہی تھی۔ اس فلم کا ہدایت کار شوکت حسین رضوی تھا۔ اسے امتیاز علی تاج نے لکھا تھا۔ اس فلم کے مرکزی کردار میں پران نور جہاں اور منور ما تھے۔ یہ پہلی فلم تھی جسمیں نور جہاں اہم کردار میں تھی۔ اس فلم میں کل نو گانے تھے جن میں سے پانچ گانوں کو نور جہاں نے اکیلے اپنی مستی بھری آواز بخشی تھی جب کہ ایک دوگانا تھا۔ اُڑ جا پنچھی اُڑ جا جو کہ اُس نے غلام حیدر کے ساتھ گایا تھا۔ تین گانے شمشاد بیگم کی آواز میں تھے جن میں ایک دوگانا اُس نے نسیم اختر کے ساتھ گایا تھا۔ یہ فلم اپنی موسیقی کی وجہ سے زبردست کامیاب رہی اور اس فلم نے ماسٹر غلام حیدر کو صف اول کا سنگیت کار بنا دیا۔

ماسٹر غلام حیدر کی اگلی ہٹ فلم ''زمیندار'' تھی۔ یہ فلم بھی پنچولی پکچرس کے بینر تلے بنی تھی۔ اسکے ہدایت کار موتی گڈوانی تھے۔ اس فلم میں شانتا آپٹے کلیدی کردار میں تھی۔ ماسٹر غلام حیدر نے اس فلم میں شانتا آپٹے کی آواز میں جو گانے صدا بند کئے اُنکا اسٹائل منفرد تھا۔ ارمان تڑپتے ہیں۔ ہے نٹور گھر دھر مرلی دھر بنواری، بجھا سکو تو بجھو، چھوٹا سا سنسار ہمارا، اور شمشاد بیگم کی آواز میں میرے دیورا کی ہوگئی سگائی ایسے یادگار گیت ہیں جنہیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی فلم میں شمشاد بیگم نے ایک ناقابل فراموش گانا گایا تھا دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا۔

1943 میں ماسٹر غلام حیدر کی فلم ''پونجی'' ریلیز ہوئی۔ اس کا سنگیت بھی سر چڑھ کے بولنے لگا۔ شمشاد بیگم کا گانا گاڑی والے ڈوپٹہ اُڑے جائے رے گلی گلی گوہنجے لگا۔ فلم ''پونجی'' کی بے مثال کامیابی کے بعد ماسٹر غلام حیدر نے لاہور سے بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں اُسے فلم ''بھائی'' کا سنگیت ترتیب دینے کا موقع ملا۔ اس فلم کے اداکار تھے ظہور راجہ، آشا، ستیش، رادھا رانی اور منور ما۔ اس فلم کا یہ دوگانا جو کہ غلام حیدر اور زینت بیگم کی آواز میں تھا، ساجن آجا، ساجن آجا بیحد مقبول ہوا۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر ایک اور گانا تھا، ہندو مسلم سکھ عیسائی جو کہ بلاک بسٹر ثابت ہوا۔

فلمستان وجود میں آگیا تھا۔ اس کے خالق ششدھر مکھر جی فلم سازی کا مہارتھی تھا۔ اُسنے اپنے بھائی گیان مکھر جی کی ہدایت میں ''چل چل رے کی تیاری شروع ہوگئی جسمیں اشوک کمار، نسیم بانو جگدیش سیٹھی، رفیق غزنوی، موتی بھائی اور وی ایچ ڈیسائی اہم کردار میں تھے۔ ماسٹر غلام حیدر کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ بڑے بڑے فلمساز غلام حیدر کے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے۔ ششدھر مکھر جی نے غلام حیدر کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سن 1944 میں ریلیز ہونے والی فلموں میں یہ کاروباری لحاظ سے اول نمبر تھی۔ اس فلم نے ریکارڑ توڑ بزنس کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بمبئی میں غلام حیدر کے ساتھ جو معاون رہے، وہ مدن موہن اور نوشاد تھے جو بعد میں بہت بڑے موسیقار بنے۔ ہر فلمساز ماسٹر غلام حیدر کے فن سے فیضیاب ہونا چاہتا تھا۔ کے آصف فلم ''پھول'' بنانے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے اس فلم کے لئے غلام حیدر کو سائن کیا۔ اس فلم کے اداکار تھے پرتھوی راج کپور۔ وینا کماری۔ مظہر خان، ثریا، درگا کھوٹے، یعقوب، ستارہ دیوی اور آغا۔ یہ فلم 1945 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے اُس زمانے میں چالیس لاکھ کی کمائی کی جو کہ ایک کثیر رقم تھی۔

مشہور ہدایت کار محبوب خان اپنی پہلی تاریخی فلم ''ہمایوں'' کی تیاریوں میں لگا تھا۔ اُسنے ماسٹر غلام حیدر کو اس فلم کو موسیقی سے سنوارنے کے لئے

چنا۔اس فلم کے مرکزی اداکار اشوک کمار اور نرگس تھے۔غلام حیدر نے اپنی مدھر دھنوں سے ''ہمایوں'' کو آراستہ کیا۔اس فلم میں شمشاد کی آواز میں صدا بند کئے گئے گانے بیحد مقبول ہوئے۔خاص کر رسم اُلفت کسی صورت میں اور میرے بھیا نے پہنا ہے تاج بے مثال تھے۔اس فلم کا سنگیت تو ہٹ تھا مگر فلم کو وہ کامیابی نہیں ملی جو اسے ملنی چاہیے تھی۔اسی بیچ سہراب مودی نے بھی غلام حیدر کو اپنی تاریخی فلم ''بیرام خان'' کے لئے سائن کیا جسے گجانند جاگیردار ڈائرکٹ کر رہے تھے۔اس فلم کے اداکار تھے، گجانند جاگیردار، مہتاب، سریش، غلام محمد، للتا پوار، بینجامن اور شاہ نواز۔یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال غلام حیدر کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''جگ بیتی'' تھا۔اس فلم کے ہدایت کار الیس فاضل تھے۔

1947 کی فلم ''مہندی'' میں بیگم پارہ، کرن دیوان، مراد، نرگس اور پریتما دیوی اہم کرداروں میں تھے۔اسی سال اور دو فلمیں ریلیز ہوئیں جن کا نام ''بت تراش'' اور ''منجدھار'' تھا۔1948 کا سال غلام حیدر کے لئے ظفریابی کا سال تھا۔اس سال اُنکی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔''پت جھڑ''، ''برسات کی ایک رات''، ''شمع''، ''شہید'' اور مجبور۔ان فلموں میں جو سب سے اہم فلم تھی وہ تھی فلمستان کی ''شہید'' جسمیں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کام کر رہے تھے۔غلام حیدر ہمیشہ نئی آوازوں کی کھوج میں رہتے تھے۔لتا منگیشکر کو کس نے دریافت کیا اس بارے میں زیادہ تر لوگ کھیم چند پرکاش کا نام لیتے ہیں۔کچھ لوگ انل بسواس کے سر یہ سہرا باندھتے ہیں۔ایک انٹرویو میں لتا منگیشکر نے ان ساری باتوں پر لگام لگا دی۔لتا منگیشکر جس کے باپ دینا ناتھ منگیشکر کا انتقال ہوا تھا اور وہ گھر میں سب سے بڑی ہونے کے باعث گھر گھرہستی کا سارا بوجھ اُسکے نازک کاندھوں پر آن پڑا تھا۔وہ کورس میں گاتی تھی۔مراٹھی فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرتی تھی تا کہ اُسکے گھر کے اخراجات پورے ہوں۔یہ سن 1942 کی بات ہے جب لتا منگیشکر کی عمر تیرہ سال تھی۔یہ اُسکی جدوجہد کے دن تھے۔اُسے کئی ساری مشکلوں اور زلتوں کا سامنا کرنا پڑا۔کبھی اُسے پورے دن بھوکا رہنا پڑتا تھا۔کبھی میلوں پیدل چلنا پڑتا تھا۔اُسکا مربی جو تھا اُسکا نام ماسٹر ونائیک تھا۔وہ اُسکے والد کا دوست تھا اور اُسے وہی فلموں میں کام دلاتا تھا۔ایک دن وہ اچانک چل بسا۔لتا منگیشکر ایکدم یتیم ہوگئی۔اُسکی موت کے ٹھیک دس دن بعد اُسکی کمپنی میں کام کرنے والا ایک فوٹو گرافر اُسے ایک میوزک ڈائرکٹر سے ملانے لے گیا جس کا نام ہریش چندر اوے تھا۔اُسنے اُسے گاتے ہوئے سنا تھا۔اُسنے اپنی آنے والی فلم ''love is Blind'' کے لئے دو گانے ریکارڈ کئے۔بدقسمتی سے وہ فلم تو بنی نہیں مگر اُسکی ریکارڈنگ کے دوران ایک پٹھان بھائی نے اُسے گاتے ہوئے سنا جو کہ ایکسٹرا سپلائر تھا۔اُسنے اُسکی سفارش ماسٹر غلام حیدر سے کی جو پاکستان سے لوٹ کر آیا تھا۔وہ غلام حیدر کی زبردست مداح تھی۔اُسنے ''خزانچی''، ''خاندان'' اور ''شہید'' کے گانے سنے تھے۔وہ اُس سے ملنے کے لئے بے تاب ہوگئی۔یہ سن 1947 کی بات ہے۔اُس وقت لتا جی کی عمر اٹھارہ سال تھی۔وہ جب اُس سے ملنے اُس کے ریکارڈنگ روم میں پہنچی تو وہ اُس وقت ریکارڈنگ میں مشغول تھا۔اُس نے اُسے شام تک بٹھائے رکھا۔اُس کے ساتھ اُس کی ایک چیچیری بہن تھی۔آخر کار اُسنے اُسے شام کے پانچ بجے اندر بلا لیا۔وہ جب اندر گئی تو وہ پیانو پر کوئی دھن بجا رہا تھا۔وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خوش لباس نوجوان کو دیکھنے لگی جس نے نور جہاں اور شمشاد بیگم کو دریافت کیا تھا اور اُنہیں اتنی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔وہ جونہی بیٹھ گئی تو غلام حیدر نے اُسے گانا گانے کے لئے کہا تو اُسنے اُسی کی فلم ''ہمایوں'' کا ایک گانا گایا۔اُسنے اُسے ایک اور گانا گانے کے لئے کہا۔اس بار اُس نے نور جہاں کا ایک گانا گایا۔وہ اُسکی آواز کو ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔اُن دنوں ٹیپ پر نہیں بلکہ فلم کے نگیٹو پر گانے ریکارڈ کئے جاتے تھے۔اُس نے لتا سے پوچھا کہ اُس کا اُستاد کون ہے تو اُس نے کہا کہ ماسٹر امانت علی خان صاحب تو ماسٹر جی نے کہا کہ وہ اُسکا دوست ہے۔اُسنے اُسکی آواز کو ریکارڑ کیا۔وہ اُسے ریکارڈنگ روم میں بٹھا کر یہ فلم لے کر اُس زمانے کے سب سے بڑے فلمساز ششا دھر مکھر جی کے پاس گیا جو کہ اُن دنوں ''شہید'' بنا رہے تھے جس کے اداکار دلیپ کمار اور کامنی کوشل تھے اور ماسٹر غلام حیدر اُسکے موسیقار تھے۔ماسٹر غلام حیدر نے لتا کی آواز ششا دھر مکھر جی کو سنائی۔ششا دھر مکھر جی نے اس آواز کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ یہ آواز کافی پتلی ہے۔یہ آواز نہیں چلے گی۔اُسکا کہنا تھا کہ اُسکی ہیروئن کامنی کوشل کی آواز سے یہ آواز میل نہیں کھائے گی۔ماسٹر غلام حیدر ششا دھر مکھر جی کے جواب سے کافی ناراض ہوا۔اُسنے برہم ہو کے ششا دھر مکھر جی سے کہا ''مکھر جی صاحب یہ آواز چلے گی ہی نہیں بلکہ دوڑے گی اور ایسے دوڑے گی کہ آپ سب پر ڈیوسر اس کے پیچھے دوڑتے نظر آؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ غصے سے اپنے ریکارڈنگ روم میں واپس لوٹ آیا اور لتا منگیشکر سے کہا کہ وہ ابھی اُسکے ساتھ چلے۔وہ اُسے بمبئی ٹاکیز ملاڈ کے اسٹوڈیو میں لے کے گیا جہاں پر فلم ''مجبور'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔بمبئی ٹاکیز ایک بہت بڑا نام تھا۔وہ اس فلم کا سنگیت کار تھا۔وہ جب لوکل ٹرین میں بیٹھ کے جا رہے تھے تو ماسٹر غلام حیدر نے ٹرین میں بیٹھ کر ایک گانے کو کمپوز کیا جس کے بول تھے دل میرا توڑا، مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔اُسنے ششا دھر مکھر جی کے بارے میں اُسے کچھ نہیں بتایا۔لتا منگیشکر سمجھ گئی تھی کہ ششا دھر مکھر جی نے اُس کی آواز کو ٹھکرا دیا ہوگا۔وہ اس طرح کی زلتوں کو سہنے کی عادی ہو چکی تھی۔

غلام حیدر بمبئی ٹاکیز کے اُس وقت کے منتظمین کو اس بات کے لئے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ جس لڑکی کو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہے وہ کل کی ایک کامیاب گلوکارہ ہوگی۔پروڈکشن کی طرف سے ہری جھنڈی ملنے کے بعد اُسنے اُسکا پہلا گانا مکیش کے ساتھ ریکارڈ کیا جس کے بول تھے انگریزی چھورا چلا گیا۔یہ اُسکا پہلا بریک تھا جو غلام حیدر نے اُسے دیا تھا۔اُسنے جب اُسکے گانے ریکارڈ کئے تو اُسنے لتا سے کہا کہ میری ایک بات یاد رکھنا، جس دن تمہارے گانے لوگوں تک پہنچیں گے وہ سب گانے والوں کو بھول جائیں گے یہاں تک کہ نور جہاں کو بھی۔ماسٹر غلام حیدر کا ایک ایک لفظ وقت کے ساتھ سچ ثابت ہوا۔ششا دھر مکھر جی کو ایک دن اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا اور لتا سے معافی مانگنی پڑی

تب جا کر وہ فلم ''ناگن'' کے لئے گانے گانے کے لئے راضی ہوئی۔لتا منگیشکر نے اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ اُسکا مربی اور محسن غلام حیدر تھا جس نے اُسے فلم میں پہلا بریک دیا۔اُسے اُسکی آواز پر اتنا بھروسہ تھا کہ لاکھ مخالفت کے باوجود اُسنے مجھے اس انڈسٹری میں لا کھڑا کیا جو انڈسٹری مجھے رد کر چکی تھی۔

فلم ''شہید'' کے میوزک کے لئے غلام حیدر نے ایک لاکھ روپے کی ڈیمانڈ کی۔اُس زمانے میں ایک لاکھ کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔کوئی اسٹار بھی اتنی رقم کی مانگ نہیں کر سکتا تھا۔غلام حیدر کے سنگیت میں ایسا جادو تھا کہ ششادھر مکھر جی کو پچھتر ہزار روپے میں اُسے منانا پڑا۔اس فلم میں غلام حیدر نے ایک نئی آواز کو متعارف کیا جس کا نام سریندر کور تھا۔اس فلم میں اُس نے دو گانے گائے۔ایک تھا، بدنام نہ ہو جائے محبت کا ترانہ اور دوسرا تھا ایک دو گانا۔بچپن کی یاد دھیرے دھیرے۔یہ گانا اُسنے للتا ڈھولکر کے ساتھ ملکر گایا۔''شہید'' کے سنگیت نے دھوم مچا دی۔خاص کر محمد رفیع اور خان مستانہ کی آواز میں یہ دو گانا۔وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو، پکارتی ہے یہ زمین آسمان شہید ہو۔اس گانے نے آزادی کے متوالوں کے خون میں حرارت بھر دی۔نوجوانوں کے دلوں میں ایک نئی اُمنگ اور نیا ولولہ ہلورے مارنے لگا۔فلم نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ششادھر مکھر جی کے گھر میں ہن برسنے لگے۔

اسی سال اُسکی ایک اور فلم زبردست کامیاب رہی جس کا نام ''پدمنی'' تھا۔اس میں اشوک کمار اور ممتاز شانتی مرکزی کردار میں تھے۔اس فلم میں اُسنے راجستھانی لوک سنگیت پر اپنی دھنیں بنائیں جو کہ بیحد کامیاب رہیں۔ اس فلم کا ایک گانا جو کہ لتا منگیشکر نے گایا تھا، بے درد تیرے درد کو سینے سے لگا کے، لتا جی کا سب سے پسندیدہ گانا ہے۔

بٹوارے کے بعد وہ پاکستان چلا گیا۔وہ لاہور سے بمبئی اور بمبئی سے لاہور آتا جاتا رہتا تھا کیونکہ یہاں چند فلمیں تھیں جنہیں مکمل کرنا اُسکی ذمہ داری تھی۔یہ فلمیں تھیں ''کنیز'' ''شاہدہ'' جو کہ 1949 میں ریلیز ہوئیں اور ''پتلی'' جو کہ 1950 میں ریلیز ہوئی۔پاکستان میں اُسنے کئی فلموں کو اپنی مدھر سنگیت سے آراستہ کیا جن کے نام ہیں ''شاہدہ'' 1949 ''بیقرار'' 1950 ''اکیلی'' 1951 ''بھیگی پلکیں'' 1952 اور اپنی آخری فلم ''گلنار'' جو کہ 1953 میں ریلیز ہوئی۔ان فلموں کو اُسطرح کی کامیابی نہیں ملی جس طرح کی کامیابی غلام حیدر کی فلموں کو ہندوستان میں ملی تھی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے بھی قابل سازندے تھے وہ ہندوستان میں رہ گئے تھے۔اُن سازندوں کی کمی نے اُس کے گانوں پر برا اثر ڈالا۔دوم یہ کہ جس طرح کا مارکیٹ ہندوستان میں تھا اُس طرح کا بازار پاکستان میں نہیں تھا۔

وہ کینسر کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔جب لتا منگیشکر کو اس بات کی خبر ملی تو اُسنے اُسکے بیٹے سے رابطہ کیا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ ماسٹر جی کو بمبئی لے کر آجائیں تا کہ وہ اسکا یہاں پر بہترین علاج کروا سکے۔اُس نے اُسے بمبئی لے کر آنے میں اپنی مجبوری ظاہر کی تو لتا جی نے کچھ رقم اُسکے بیٹے کے نام بھجوا دی تا کہ وہ اچھے ڈھنگ سے اُسکا علاج کروا سکے۔وہ اتنی بڑی گلوکارہ بننے کے بعد بھی اپنے محسن کو نہیں بھولی تھی۔9 نومبر 1953 کو پینتالیس سال کی عمر میں اس عظیم موسیقار نے اس دنیا فانی کو الوداع کہہ دیا۔

ماسٹر غلام حیدر محض ایک موسیقار کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام تھا جس نے فلموں کے روایتی سنگیت کو ایک نئی رفعت اور عظمت بخشی۔ہندی فلموں کے مشہور موسیقار او پی نیر نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ ماسٹر غلام حیدر کو اپنا گورو مانتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی اُس سے ملا نہیں مگر اُسکے گانے سن کر اُسے سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ماسٹر غلام حیدر موسیقاروں کا موسیقار تھا۔اپنے زمانے کے جانے مانے سنگیت کار انل بسواس، آر سی بورل، پنکج ملک اور کھیم چند پرکاش غلام حیدر کی بہت عزت کرتے تھے۔اُسکے سنگیت نے ان جیسے مہارتھیوں کو بھی پریرنا دی۔انل بسواس کا یہ کہنا تھا کہ ماسٹر غلام حیدر سب سے منفرد ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ غلام حیدر نے ساؤتھ کے ایک میوزک ڈائرکٹر بی سدھر شنم کو اس حد تک متاثر کیا کہ اُسنے اپنی تامل فلم ''پراشکتی'' کا ایک گانا جسے اُس زمانے کے سب سے بڑے رائٹر اور ایکٹر ایم کرونا ندھی نے لکھا تھا، اس گانے کو غلام حیدر کے فلم ''اکیلا'' کے گانے آئے خوشی کے زمانے کی دھن پر تیار کیا۔ماسٹر غلام حیدر موسیقی کا سرخیل تھا جو فلمی سنگیت کو ارتقا کی طرف لے گیا۔گو کہ ماسٹر جھنڈے خان اور کئی سارے بنگالی سنگیت کاروں نے اس طرح کی پہل کی تھی مگر اس تحریک کو غلام حیدر نے استحکام بخشا۔اُسنے فلمی موسیقی کا جس طرح کا ایک ڈھانچہ کھڑا کیا وہ بعد ازاں فلمی سنگیت کا دستور بن گیا۔سچے معنوں میں ایک عظیم فن کار تھا۔غضب کا جوہر شناس تھا جس نے کئی سارے ہیرے کھوج کے نکالے جن میں شمشاد بیگم، نور جہاں اور لتا منگیشکر قابل ذکر ہیں۔وہ لتا منگیشکر کو پاکستان سے فون کر کے یاد دلاتا تھا کہ جو کچھ میں نے تمہارے بارے میں کہا تھا وہ سچ تھا نا۔پانچ سالوں کے اندر لتا منگیشکر کی آواز برصغیر پر چھا گئی تھی۔وہ نمبر ایک گلوکارہ بن چکی تھی اور جیسا غلام حیدر نے ششادھر مکھر جی سے سن سنتالیس میں کہا تھا کہ یہ لڑکی اتنا تیز دوڑے گی کہ آپ سب پر ڈیوسر اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے نظر آؤ گے۔ماسٹر غلام حیدر کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔جب تک یہ فلم انڈسٹری ہے، جب تک ہندی فلمی سنگیت ہے ماسٹر غلام حیدر کو ہمیشہ احترام سے یاد کیا جائے گا۔

''منی سفائر کل''

امریکی سائنسدانوں نے ''منی سفائر کل ہارٹ'' کے نام سے مصنوعی دل بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔اس مصنوعی دل کی مدد سے ماہرین کو دل کے امراض سمجھنے اور علاج دریافت کرنے میں آسانی ہوگی اور بیماریوں کے پیدا ہونے کے اسباب کا پتہ بھی آسانی سے لگایا جا سکے گا۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب کو دل سے مبارکباد۔

اچانک کوئی روشندان کھل گیا۔اور صبح کی سنہری دھوپ میرے آنگن میں چھنک گئی۔ در و دیوار روشن ہو گئے۔۔۔بس ایسے ہی۔۔ایسے ہی میسینجر پر ایک کال آیا۔۔میری ادبی زندگی کے پہلوؤں کو روشنی بخشنے کا کال اور جیسے چٹکیوں میں خواب تعبیر بن گئے۔ایک اَن دیکھا خواب! جس کو دیکھنے کی میں نے کبھی جرأت بھی نہیں کی۔اسے ایک سچے ادیب اور مفکر نے دیکھا اور سیدھے تعبیر میری جھولی میں آ گئی۔

میں حیرت میں ڈوبی ہوئی ہوں۔۔۔دورکعت شکرانے کے ادا کیے کہ ایسے نام وَر رسالے کا حصہ بنا دیا۔میں نے اپنے آپ کو کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ درحقیقت کسی ریس کا حصہ بننا بھی نہیں چاہتی۔اس لیے سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔جیسے میں اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے ہوئے کسی سے اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔۔ویسے ہی۔۔جی ویسے ہی۔۔بلکل اسی طرح اپنی عنایتوں کی خوشیوں کو کم کیوں کروں! پھر کیسے تصور کر سکتی تھی کہ گلزار جاوید جیسے ادیب کی نظر ادب کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں مجھ جیسی دور دراز کی لہر تک پہنچ جائے گی۔

ماشااللہ! مجھے اپنی تمناؤں سے زیادی میسر ہو گیا ہے۔میں نے ان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔۔میرے پاس الفاظ کہاں ہیں کہ ایسا کروں! بس ایک دعا ہے کہ لبوں پر نہیں آتی۔

بس ایک بات یو.کے. کے مشہور و معروف فکشن نگار ڈاکٹر مصطفےٰ کریم کی جگہ ارتضےٰ کریم ہو گیا۔آپ کی محنت اور لگن کو دیکھ کر مجھے یاد آ رہا ہے۔ مجروح سلطانپوری صاحب کی شاعری کی دو کتابیں ہندی میں لاتے وقت انھوں نے میری ڈائری پر یہ لکھ دیا تھا،

''تم یہ جو کام کر رہی ہو، وہ درویشی کا ہے، مالی کا نہیں ہے۔''

ہاں یہ جملہ 'چہارسُو' کے مدیر اور بہت اچھے ادیب گلزار جاوید پر بھی صادق آتا ہے۔

صادقہ نواب سحر

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

تازہ چہارسو کا صادقہ سحر نمبر نظر سے گزرا۔نہ صرف یہ کہ چہارسو کی اشاعت ایک عمدہ کاوش ہے ساتھ ساتھ یہ اشاعت ڈاکٹر صاحبہ کی علمی، ادبی اور تخلیقی جہات کا عمدگی سے احاطہ کر رہی ہے۔میری جانب سے ڈاکٹر صاحبہ اور مدیرِ چہارسو کی خدمت میں دلی مبارک باد۔

شافع قدوائی (علی گڑھ)

محبّ گرامی گلزار جاوید صاحب، تسلیمات

جس تواتر اور تسلسل سے آپ چہارسو کے قرطاسِ اعزاز کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں وہ بجائے خود ہمت و استقامت کی دلیل ہے مگر لائقِ تحسین بات یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلے کو جس طرح تمام اردو بستیوں تک پھیلا دیا ہے اُس سے ایک تاریخ رقم تو ہو رہی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اردو والوں کے درمیان جو تعلق منقطع ہو گئے تھے وہ پھر سے بحال ہو رہے ہیں۔

صادقہ نواب سحر ہمارے عہد کے قلمکاروں میں امتیازی مقام کی حامل ہیں۔اردو کے ساتھ انہیں ہندی پر بھی دسترس حاصل ہے۔نثر کے علاوہ انہیں شاعری سے بھی شغف ہے۔انہوں نے چند ڈرامے بھی لکھے ہیں۔اور استاد ہونے کے ناطے انہیں بچوں کے ادب سے بھی دلچسپی ہے۔معاصر خواتین لکھاریوں میں وہ اردو کی واحد ادیبہ ہیں جنہوں نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقات سے ادب کے ہر گوشے کو منور کیا ہے۔

چہارسو نے ان پر قرطاسِ اعزاز نکال کر ان کی صحیح قدر افزائی کی ہے۔مبارک باد اور نیک خواہشات۔

سلام بن رزاق (مہاراشٹر)

میرے گلزار، خوش رہو۔

تمہاری جواں ہمتی اور میری کہنہ سالی ایک مدت سے برسرِ پیکار ہیں۔نہ تم نئے کوہِ گراں سر کرنے سے باز آتے ہو نہ میں داد دینے سے چوکتا ہوں مگر کچھ دنوں سے حافظہ اور قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔چہارسو کے عباس تابش نمبر میں رینو بہل نے اپنے مرحوم والد کو جس محبت، عاجزی اور رقت سے یاد کیا ہے اُس کی بابت لکھنا تو دُور کی بات ہے پڑھنا بھی بھول گیا۔بھلا ہو اپنے سوہنے منڈے فیروز عالم کا، اُس نے دورانِ گفتگو ذکر کیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔آپا دھاپی میں تلاش کر کے پڑھا اور دل سے یہ رائے نکلی کہ بیٹیاں ایک عمر کو پہنچ کر ماں بن جاتی ہیں۔جیتی رہو رینو اور اسی تن دہی سے قلم کا قرض چکاتی رہو۔

زیرِ نظر چہارسو میں اوّل رائے گڑھ جیسے دور دراز علاقے تک رسائی بجائے خود کارنامہ ہے مگر صادقہ نواب سحر کی تلاش اور تراش خراش نے شمارے کو نئی زندگی بخش دی ہے۔کم عمری میں اس لڑکی نے جس قدر کارنامے انجام دے ڈالے اُس پر یقین کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا پڑتا ہے۔میری جانب سے صادقہ نواب سحر کو پُرخلوص دعائیں۔

اس بار فیروز عالم نے افسانوی میدان میں جو رونق لگائی ہے اُسے دیکھ کر دل پھر سے جوان ہو گیا۔''جوگن'' نہ صرف چہارسو بلکہ اس سال لکھے گئے افسانوں میں نمبرون افسانہ شمار ہونا چاہیے۔

ظفر قریشی، تابش خانزادہ اور دیپک کنول جس طور چہارسو کی

خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے ہیں اُس کے لیے اُنہیں مبارک باد۔ دل تو شاعری پڑھ کر بھی بہت مچلا ہے مگر ہمت جواب دے رہی ہے۔ لکھتے رہو دوستو، ہم نہ سہی تو کوئی ہم سا آپ کی ہمت ضرور بندھائے گا۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

میرے محترم بھائی، ہمیشہ گل وگلزار کی طرح مہکتے رہو۔

چہارسو کا تازہ ترین شمارہ بنام ''صادقہ نواب سحر'' برقی لہروں پر تیرتا کمپیوٹر کے پردہ سیمیں پر نظر نواز ہوا۔ جدّت یہ تھی کہ اس مرتبہ اپنے اندر قوسِ قزح کے رنگ لیے تھا۔ ادب کے ہم بہت پیاسے قاریوں کے نظری وذہنی تسکین کے لیے آپ کس قدر محنت کرتے ہیں اس کا صلہ ہم تو نہیں مگر رب العزت آپ کو صحت، توانائی اور طول العمری کی شکل میں ضرور عطا کرے گا۔

اب صادقہ نواب سحر، اس سے پہلے نواز دیوبندی اور اس سے پہلے عباس تابش نمبر دیکھ کر میں ذاتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہوتا رہا کہ اردو ادب کے بحرِ ذخائر میں کیسے کیسے شناور موجود ہیں۔ صادقہ سحر کی تفصیلات یہ دیکھ کر کہ انہوں نے ہندوستان کی مختلف ساہتیہ اکیڈمیوں سے چار مرتبہ، جی چار مرتبہ ''کل ہند'' ایوارڈ جیتے ہیں اور تین زبانوں میں ایم۔اے کیا ہے اور پھر اردو میں پی۔ایچ۔ڈی بھی کیا ہے۔ اردو اور ہندی ادب کی تقریباً ہر صنف میں اس معیار کی طبع آزمائی کی ہے وہ ''قادر الکلام'' کے درجے پر فائز ہوگئی ہیں۔ ان لکھے مضامین میں ان کے شریک حیات جناب نواب اسلم صاحب کا مضمون دل کو چھو گیا۔ اس میں اپنی جیون ساتھی کے لیے بے پناہ خلوص، محبت اور پیار جھلکتا ہے وہ خود کو ادبی شخصیت نہیں مگر جس طرح انہوں نے اپنی بیگم کا ساتھ دیا اور انہیں سراہا ہے ایسا میں نے کم کم دیکھا ہے۔ ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' یقیناً اردو میں ایک سنگ میل ہوگا۔ اگر اسے پاکستان میں شہزاد نے شائع کیا ہے تو میں اسے تلاش کروں گا۔ ان کے لیے نذیر فتح پوری کی نظم بھی اچھی لگی۔ براہِ راست میں آپ نے ادبی ونجی حالات کو حسبِ دستور خوب کھنگالا ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ان کی شاعری کا متاثر کن انتخاب نکالا ہے۔

دیگر تحریروں میں طاہرہ اقبال اور نعیمہ جعفری کے دونوں افسانے بہت پُرزور ہیں۔ عباس تابش نمبر میں رینو بہل کا مضمون جوان کے ''بابا'' کی یادنگاری پر تھا اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اتر گیا۔ میں رینو کی ہر تحریر بہت غور سے پڑھتا ہوں اور وہ مجھے یاد رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ناول ''گرد میں اَٹے چہرے''، 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' اور ''نجات دہندہ'' اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اب اردو ادب میں ایک بڑا نام بن چکی ہیں۔ ان کے والد کا حادثہ اور پھر ان کا افسوس ناک انتقال مجھے یاد ہے اس لیے کہ کئی سال پہلے انہوں نے اس پر مجھ سے کچھ بات بھی کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ رینو نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر ان کے والد کی روح عرش سے ان کو دیکھ کر فخر سے مسکراتی ہوگی۔

شاعری کے حصے میں ڈاکٹر ریاض، نسیم سحر، نوید سروش، مہندر پرتاپ چاند، جنید آزر اور پریم ناتھ بسمل کے کلام نے متاثر کیا۔

خاکسار کا افسانہ جوگن شامل کرنے کا شکریہ۔ حسبِ عادت میں نے ایک سچی کہانی کے گرد افسانہ بُن دیا ہے امید ہے قارئین کے دل پر اثر کرے گا۔ ڈاکٹر باری کا افسانہ ''اَنا کی صلیب'' یہ بھی ایک دل کو چھو لینے والی تحریر ہے۔ آپ نے ساغر صدیقی کی غزل اور اس کے پس منظر میں جگر مرادآبادی کا تاثر بیان کر کے میری یاد تازہ کر دی۔ یہ واقعہ میں نے پہلے بھی پڑھا ہے۔ ساغر صدیقی بہت ہی پایہ کے شاعر تھے بدقسمتی ہے، بہت تکلیف دہ زندگی گزاری۔ میرے پاس ان کا مجموعہ کلام ہے کا یہ شعر تو اردو شاعری کے چند اعلیٰ ترین اشعار میں چنا جاسکتا ہے۔

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے، فنا ہوتا نہیں

نصرت بخاری کا ''چندہ'' بھی قابلِ ذکر ہے۔ شمارے میں بہت سے نئے نام نظر آرہے ہیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کو اور نئی جگہوں بلکہ نئے ملکوں سے لکھنے والوں کو اپنے جریدے میں جگہ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ میرا نام بھی اجنبی تھا اور کئی سال پہلے آپ نے میری بھی حوصلہ افزائی کی تھی۔ طوالت کے خوف سے بہت سے نام رہ گئے ہیں ان سب سے معذرت چاہتا ہوں۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیمات۔

تازہ چہارسو صادقہ نواب سحر نمبر دیکھ کر جی خوش ہوا۔ آپ جس طور وسعتِ قلبی اور وسعتِ نظر کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔ اس بار چہارسو میں بہت کچھ پڑھنے اور سراہنے کے لیے موجود ہے مگر دامنِ دل صادقہ نواب سحر کی تخلیقات اور مکالمے پر مرکوز ہے۔ آج کل آپ کے سوالات میں جس طور مجبور ومظلوم لوگوں کی آواز میں آواز ملائی جارہی ہے وہ بھی آپ کی دردمندی کی دلیل ہے۔ ویسے بھی وقت نے لدگشت میں دھکیل دیا ہے، پابرہنہ بھٹکتا پھرنے کے لیے دل کی جگہ پہ کچھ خالی خالی سا ہے۔ معاشرہ ہسٹیریا کی جانب دھکیلا گیا تھا وطن عزیز سیکولر سے مذہبی جنونی ہوا، سرکار نے ادیب خرید رکھے ہیں۔ بلوچی، پشتو، براہوی اکیڈمیاں کروڑوں پاتی ہیں۔ ادیب چاکر روند کے گھوڑے کی دم سے لٹکے ہوئے ہیں۔ جانی کی ناکام محبت اور مستیں تو کلی کے عشق میں گھلے جاتے ہیں۔ کٹی ہوئی زباں اور پکے ہوئے قلم کے قافلے میں غزل کہوں بھی تو منسوب کس کے نام کروں۔ گذشتہ تیس برس سے ادیبوں کی بجائے صحافیوں کو توقیر دی جارہی ہے۔ خلعت اور پارچہ جات سے نوازہ جاتا ہے۔ آج کا ادیب جسارت خیالی کی طرح پہاڑ پور لیہ کے صحراؤں میں گواڑخ کی مانند کھل کر مرجھا جاتا ہے، یورپ کی طرح ہمارا غیر مارشل لائی مورخ اسے تاریک دور لکھے گا۔

وطن عزیز کا شعر وادب ایک تاریک دور سے گزر رہا ہے۔ اردو کے

نامور افسانہ نگار میرے دوست نسیم درانی بتلاتے کہ سیپ رسالہ تیار ہوتا تو وہ قانون کے مطابق فون کرتے کہ عالی جاہ رسالہ تیار ہے، ملاحظہ ہو۔ دو حوالدار خفیہ کے آتے اور رسالہ پڑھ کر فرماتے فلاں، فلاں فقرے حذف کردو، شعر نکال دو۔ لوگوں نے بے رنگ، بے ذائقہ، بے بُو ادب ہی پڑھنا چھوڑ دیا۔ گلی گلی، محلّہ محلّہ لائبریریاں دم توڑ گئیں۔ کہتے ہیں کہ جب مومنین کا لشکر دباؤ کے تحت پیچھے ہٹ رہا ہو مگر ایک مجاہد صفیں الٹتا آگے ہی بڑھتا چلا جائے تو وہی غازی ہے۔ شائد ہم آپ جیسے لوگ وہی غازی ہیں یا پھر Don Quixote ہیں۔

کند تلوار، کمزور نیزے اور مرگھلے گھوڑے پہ بیٹھ کر حملہ آور ہونے کو اچک رہے ہیں۔ یا شائد ٹائی ٹینک کے بے بس مسافر۔ ناول ماں کے ہیرو کی طرح ڈر رہے ہیں کانپ رہے ہیں مگر بھاگ نہیں رہے، وہیں کھڑے ہیں۔

آغا گل (کوئٹہ)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اور احترام۔

صادقہ سحر نواب صاحبہ کے نام یہ شمارہ پڑھا۔ آپ نے انٹرویو ایسے شروع کیا کہ فکشن کا سا لطف آیا اور کچھ ایسا ہی جوابوں میں بھی محسوس ہوا۔ اس بار کے شمارے میں انجم جاوید صاحب کا کلام پڑھنے کو ملا تو مزہ دوبالا ہو گیا۔ محسن نقوی کی نعت کیا خوب ہے، سبحان اللہ۔ غزلوں میں ساغر صدیقی، عبداللہ جاوید، محمود شام، مہندر پرتاب چاند، انجم جاوید کی غزلیں اور اسی طرح نوید سروش، سہیلہ انعام صدیقی، ذکی طارق بارہ بنکوی اور جنید آذر کے بعض اشعار اچھے تھے۔ پریم ناتھ بسمل کی غزل کی رنگینی اور تسلسل دلچسپ تھا۔ جہانگیر اشرف صاحب کی غزل محلِ نظر ہے۔ ''آم کا سہرا'' تو بہت میٹھا تھا مگر یہاں پیڑ گننا بھی ضروری ہے، سو شاعر کا نام بھی لکھا ہوتا تو اچھا ہوتا۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اردو زبان کی ادبی صحافت میں ان دنوں آپ کی ادارت میں پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے رسالے ''چہارسُو'' کے چرچے چہارسو ہیں کہ یہ ساری اردو دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ گو کہ یہ رسالہ میرے پاس آتا نہیں ہے لیکن اس کی ادبی مشمولات پر میرے ادبی دوستوں سے موبائیل پر گفتگو ہوتی رہی ہے اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں نے اس کی ورق گردانی بھی نہ کی ہو اس کے دو شمارے میری نظر سے گزر چکے معیاری تخلیقات، بہترین ترتیب و تزئین سے مزیّن یہ رسالہ اس کمپیوٹر یگ میں بھی پرنٹ مڈیا کی لاج رکھے ہوئے ہے۔ ایک تو اس کے اداریئے ادب دوستوں میں موضوع گفتگو بنتے ہے اور لکھنے پڑھنے والوں کو متحرک رکھتے ہے اور قرطاسِ اعزاز کا سلسلہ بہت خوب ہوتا ہے کہ مجھے ہمارے انڈیا کے منفرد ہمہ جہتی قلم تار غضنفر کا گوشہ بہت پسند آیا اور اب بہت ہی کم عرصے میں فکشن کی دنیا میں اپنا مخصوص مقام پانے والی ہمارے ہاں کی قلم کار اڈاکٹر صادقہ سحر کا گوشہ ''چہارسُو'' کی معیاری روایت کے مطابق خوب رہا ڈاکٹر صادقہ کے مختلف اصناف ادب کے معیاری نمونوں اور چند مضامین کے ساتھ مدیر گرامی گلزار جاوید کا لیا ہوا انٹرویو بھرپور ہے سوالات یا معمہ پیش کرتے ہوئے لگے یا پھرا کساتے ہوئے یا پھر شخصیت اور فن پر اگلوانے کی کوشش کرتے ہوئے! لیکن ڈاکٹر صادقہ کے جوابات پڑھ کر ایسا لگا کہ محترمہ نے نہایت ہی سنجیدگی سے ہر سوال کا جواب ایسا دیا کہ اس میں ان کی ادب شناسی کے کئی پہلو سامنے آئے اور خود ڈاکٹر صادقہ کی ادبی سوچ کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ اگر سوالات کے تیور ویسے نہیں ہوتے تو جوابات ایسے نہیں ہوتے!

''چہارسُو'' کے گوشوں کا سلسلہ بہت اچھا اس لئے لگا کہ یہ گوشے عام گوشے کی طرح رسمی یا کمرشیل نہیں۔ ''چہارسُو'' کے گوشوں میں فنکار کے اندرون اور بیرون کو ظاہر کرنے کے لئے طویل انٹرویو بھی ہوتے ہیں اور تخلیقات کا انتخاب بھی بہتر سے بہتر ہوتا ہے جس سے فنکار کے معیار مقام اور مرتبے کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

''چہارسُو'' کی ادبی خدمات سے ادبی تاریخ مرتب ہو رہی ہے جس کے لئے مدیر گرامی اور معاونیں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

رفیق جعفر (پونہ)

یارِ دلدار گلزار، سلام مسنون۔

آپ ہر موسم میں یاد رکھتے ہیں، کرونائی موسم میں بھی آپ کی خاص توجہ ہوتی ہے اور چہارسُو اگرچہ کاغذی صورت میں اسی وجہ سے نہیں آ رہا، مگر جب کبھی دیگر مصروفیات اور انٹرنیٹ سے نیم آگہی کے سبب تازہ شمارہ کی موصولی کا علم نہ ہو تو آپ ازراہِ تلطّف فون کر کے بتا دیتے ہیں۔ اس ماہ بھی یہی ہوا، ورنہ شاید میں بہت سی شاندار تحاریر سے محروم ہی رہتا۔ ۸/محرم کو جب آپ کا فون آیا اور چہارسُو کے بارے میں اطلاع ملی، تو فوراً انٹرنیٹ کھولا اور کافی کوشش کے بعد اس کے بیشتر صفحات پرنٹ کر لیے۔ اور یہی سمجھیں کہ ''موذّن مرحبا بروقت بولا''، کہ اِس کے فوراً بعد محرّم الحرام کی معمول کی پابندیوں کے سبب انٹرنیٹ، موبائل فون نمبر، واٹس ایپ سبھی کچھ بند ہو گیا اور کل ۱۰/محرم کی رات کو کوئی گیارہ بجے کے بعد حالات نارمل ہوئے۔ مگر صد شکر کہ مَیں نے بروقت ضروری صفحات پرنٹ کر لیے تھے چنانچہ دس محرم کا سارا دن 'چہارسُو' کے ساتھ گزرا۔ اور اب گیارہ محرم کو بہت سا وقت میڈیکل لیبز اور کلینک میں اپنے اور بیگم کے طبی مسائل سے نمٹنے کے بعد شمارے پر مختصر تبصرہ بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں جو ضروری نہیں کہ مختصر ہی ہو۔

اس مرتبہ ''قرطاسِ اعزاز'' جس شخصیت کے نام ہے وہ ہیں محترمہ صادقہ نواب سحر، جن کا نام قدرے اجنبی لگا، مگر جب ان کے بارے میں بہت سے مضامین پڑھے تو یاد آ گیا کہ وہ اتنی اجنبی بھی نہیں اور میں کئی سال قبل انہیں ہندوستانی جرائد بیسویں صدی اور شمع میں پڑھتا رہا ہوں جو سعودی عرب میں بآسانی دستیاب ہوتے تھے۔ ان کے ادبی نظریے اور کمالِ فن کے بارے میں البتہ اتنی تفصیل سے اور اس عمدہ انداز میں یکجا کم کم ہی پڑھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ سب کچھ تو آپ کے ''براہِ راست'' انٹرویو میں ہی مل جاتا ہے، اور جب مخاطب دیگر اصناف میں لکھنے کے علاوہ

افسانہ نگار بھی ہو تو تب تو یہ سلسلہ مزید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ یہ فرق محسوس ہوا کہ کچھ دیگر شخصیات کی طرح محترمہ نے کسی سوال کا جواب دینے سے گریز نہیں کیا اور آئیں بائیں شائیں تک بھی نوبت نہیں آنے دی۔ ان کی نثر کے ساتھ ساتھ ان کی سہلِ ممتنع اور مختصر بحور میں کہی ہوئی شاعری بھی اچھی لگی۔

محسن نقوی کی نعت نے عجب کیفیت طاری کر دی۔ بالخصوص دس محرم کو پڑھی تو اور اچھی لگی، اور موجودہ صورتِ حال میں ان کا یہ شعر تو حسبِ حال ہے:

اے گنبدِ خضراء کے مکیں، میری مدد کر
یا پھر یہ بتا کون مرا تیرے سِوا ہے؟

ڈاکٹر فیروز عالم اس مرتبہ ایک بہت سادہ رومانی افسانہ لے کر شامل ہوئے ہیں جسے ان کے مخصوص انداز سے ہٹ کر محسوس کیا ہے کہ وہ جب چاہیں جس انداز اور اسلوب میں چاہیں، اپنی نثر کا جادو جگا سکتے ہیں۔

اور اب آتا ہوں ''زہریلا انسان'' کی طرف۔ سچی بات ہے چہار سُو کے انتظار میں اس سلسلے کی اگلی قسط کا انتظار بھی شامل ہوتا ہے اور ہر بار ہی جناب تابش خانزادہ ہرگز مایوس نہیں کرتے۔ اس مرتبہ اس دلچسپ کہانی یا ناول کا جس مرحلے پر اختتام ہوا ہے اس نے اپنے اندر مسلمانوں کی تاریخ کے اہم واقعات سرنگاپٹم، ٹیپو سلطان اور بظاہر مغربی خاتون ڈالیا کے ساتھ ان کے خاندانی تعلق کی کڑیاں کمال خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے بالآخر ڈالیا کو اس کے انتہائی قیمتی شاہی خزانے تک پہنچانے کے بعد ناول کا کردار اب اس سارے معاملے سے خود کو الگ کر کے واپس اپنی اصل کی جانب جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس مرحلے پر ڈالیا کی خود سپردگی اور کافی حد تک جنسی تحریک کے باوجود وہ اس سے کوئی جنسی تعلق قائم نہیں کرتا اور اسے صاف صاف بتا دیتا ہے کہ اس کے اندر اتنا زہر ہے کہ جو عورت اس سے تعلق قائم کرتی ہے فوراً اپنی جان دے دیتی ہے، وہ یہ بھی صاف صاف بتا دیتا ہے کہ اس سے پہلے جن دو عورتوں کی جان اس وجہ سے گئی تھی، تب تک وہ خود بھی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا، مگر اب وہ جانتے بوجھتے ہرگز کسی کی جان نہیں لے سکتا۔ یہ انتہائی نازک مراحل تابش خانزادہ نے عمدہ اسلوب سے نبھائے اور پھر ناول کے مرکزی کردار کو واپس اپنی جگہ جاتے دکھایا ہے۔ بظاہر تو اس ناول کا یہاں اختتام بھی ہو سکتا تھا مگر اب یہ تو تابش خانزادہ ہی کو پتہ ہوگا کہ اب اس کردار کی اگلی مہم اور اگلا سفر کہاں کا ہوگا۔ چنانچہ ہم بھی انتظار کرتے ہیں اور دیگر قارئین بھی انتظار کریں کہ دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا۔

اس شمارے میں شامل ایک اور افسانہ ''ماس'' کا ذکر کرتا چلوں جو جناب ظفر قریشی نے ترجمہ کیا ہے اور اس کا موضوع بظاہر ناقابلِ یقین ہے کہ لوگ اپنا ہی گوشت کھانا شروع کر دیتے ہیں، اور جس تیزی سے دنیا تبدیل ہو رہی ہے کچھ عجب نہیں کہ اس وقت ایک سائنس فکشن دکھائی دینے والا افسانہ مستقبل بعید میں سچ بھی ثابت ہو جائے۔ ایک اور حیرت انگیز تحریر چشمِ تحیّر جناب فاری شا کے قلم سے ہے جو آئی ٹی سے تعلق رکھتی ہے اور ۵ جی کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے، مجھے یہ اس لیے بھی اچھی لگی کہ میں تو ایک جی یا دو جی کا آدمی ہوں اس لیے اس تحریر سے کچھ سیکھنے کی بھی کوشش کی۔

چند اشعار جو اتنے اچھے لگے کہ جی چاہتا ہے خط میں انہیں درج کر کے متعلقہ شعراء کو داد دوں:

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں
(ساغر صدیقی)

یہاں تو چاروں طرف برف کا سمندر ہے
اس ایک صبح کے سورج سے کام کیا ہوگا
(عبداللہ جاوید)

اک خزانی چمن پہ چھائی ہے
گل نہیں ہے تو گلبدن بھی نہیں
حرمتِ حرف کا ہے پاس کہاں
اہتمام فروغِ فن بھی نہیں
(محمود شام)

اور کچھ اب نظر نہیں آتا
ہر نظارے پہ چھا گئے ہو تم
(شاہد صدیقی)

جو گلے کا ہار تھی اب پاؤں کی زنجیر ہے
کیا سہانا خواب تھا، کیا دل شکن تعبیر ہے
(مشتاق اعظمی)

کب تک چلے گا باہمی رشتہ مفاد کا
دو مختلف دھڑے ہیں، ہوا بھی چراغ بھی
(اشرف جاوید)

زباں جو چیر دیتی ہے گھڑی بھر میں ہمارے دل
ضرورت ہی نہیں کوئی تصوّر ایک آرے کی
(تصوّر اقبال)

دیے کے حق میں جبھی تو گواہی میری ہے
کہ اس کے بجھنے میں ساری تباہی میری ہے
(جنید آزر)

تمہاری کامیابی کس طرح ممکن بھلا ہوگی
تمہیں میری طرح خونِ جگر کرنا نہیں آتا
(نوید سروش)

شب مصلّے پہ سر کو جھکائے ہوئے
اپنے رب سے بھی کی اپنی کچھ گفتگو

(سہیلہ انعام صدیقی)

مجھ پہ کچھ پڑھ کے پھونک اے جوگی
ایک ناگن نے ڈس لیا ہے مجھے

(انجم جاوید)

پریشاں نہ ہو طائرِ پر شکستہ
نکل آئیں گے بال و پَر ہولے ہولے

(ڈاکٹر سید قاسم جلال)

رات کے گیارہ بجنے والے ہیں، اور چونکہ آپ سے وعدہ تھا کہ آج ہی اپنا تبصرہ بھیجوں گا اس لیے شکر کیجیے کہ اب ختم کر رہا ہوں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۲۰ء دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی جب اس کے صفحات قوس وقزح کے رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آئے۔

صادقہ نواب سحر ہندو پاک کی ایک نامور ادیبہ ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مزین ہیں اور اس حوالہ سے وہ بیک وقت شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور مضمون نگاری میں شہرت رکھتی ہیں۔ قارئین چہارسو سے ان کا تفصیلی تعارف اور ادبی خدمات شیئر کرنے پر ان کے علاوہ آپ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارہ میں اچھے افسانے اور مضامین شامل ہیں۔ نصرت شمسی نے ''آشیانہ'' کے عنوان سے ایک بہترین کہانی رقم کی ہے جو دل کو اداس کر دیتی ہے اور غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ شہر میں ''بزرگ وِلا'' نام سے ایک مرکز قائم ہوا جہاں اُن بوڑھے مرد اور خواتین کے قیام اور خوراک کا انتظام کیا گیا جہاں ان کی اولاد انہیں بوجھ محسوس کرتے ہوئے چھوڑ آتی ہے۔ کہانی میں انٹرویو کے دوران ایک بوڑھی ماں وِلا کے دوسرے رخ کا ذکر کرتے ہوئے فریاد کرتی ہے کہ اس بزرگ وِلا نے مجھ سے میرا گھر اور اولاد چھین لی ہے اگر یہ قائم نہ ہوتا تو میرے بیٹے مجھے یہاں لاکر نہ چھوڑتے اور میں ان سے دوری اور تنہائی کا شکار نہ ہوتی۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا تحریر کردہ افسانہ ''جوگن'' شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب جہاں مختلف امراض کے بارے میں مفید اور معلوماتی مضامین قارئین کی نذر کرتے ہیں وہاں اردو ادب سے پیدائشی تعلق اور لگاؤ کے باعث اخلاقی اقدار میں رہتے ہوئے دلچسپ اور عموماً فکر انگیز افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جنسی ہیجان خیزی، تشدد یا بے راہ روی کا مبالغہ انگیز تذکرہ نہیں ہوتا۔ اور ہر کہانی پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے افسانوی مجموعے، ناول اور عالمی ادب کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں جو میں نے شوق سے پڑھے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے ایک افسانوی مجموعہ کا پیش لفظ میں نے تحریر کیا ہے۔ ''ناگن'' ایک ایسی وفا کی دیوی کی کہانی ہے جس نے اپنی پسند کا فیصلہ کرنے کے بعد مشکل ترین حالات میں بھی وفا نبھائی اور کبھی مڑ کر نہیں دیکھا حالانکہ وہ عیش وعشرت کی زندگی بھی گزار سکتی تھی مگر وفا کی قیمت پر۔۔۔

اس شمارہ میں طاہرہ اقبال صاحبہ کا تخلیق کردہ افسانہ ''پردہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں انہوں نے گاؤں کی ایک نوخیز لڑکی کا منظر نامہ پیش کیا ہے جو گاؤں کے نمبردار کے گھر جاتے ہوئے اپنے جسم کے مختلف اعضا کی نمائش کرتی ہوئی گلیوں سے گزرتی تھی اسے دیکھ کر مرد طرح طرح کی حرکات اور جملے کستے تھے اور غلیظ الفاظ بکتے تھے جو کہانی میں درج کر دیئے گئے ہیں پھر کیا ہوا وہ یہاں درج کرنے سے قاصر ہوں۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ جنسی ہیجان اور بد اخلاقی سے بھرپور یہ کہانی تخلیق کرنے اور شائع کرانے کا کیا مقصد تھا اور ایک ادبی رسالہ میں جسے گھر میں جملہ مرد اور خواتین پڑھ سکتے ہیں یہ کیسے شائع ہوئی۔ بہرکیف کہانی پڑھ کر نہ صرف افسوس ہوا بلکہ اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہوا۔

''چندہ'' کے عنوان سے نصرت بخاری کا افسانہ ایک غریب شخص کے سات بیمار بچوں کے علاج کے لیے ٹی وی کے نمائندوں کی طرف سے ایک شو کا اہتمام کرنے کی کہانی ہے جس میں اس حقیقت کا ادراک کیے بغیر کہ اُسے علاج کے لیے فوری رقم کی ضرورت ہے ناظرین نے اعلانات تو کیے مگر مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ کسی کھلاڑی نے اپنے بیٹ پر یا قمیض پر دستخط کر کے چندہ دیا اور فلمساز نے اپنی آئندہ بننے والی فلم کے پہلے تین دن کے شو کی آمدنی دینے کا اعلان کیا۔

شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''فلاور آئی لینڈ سے واپسی'' دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں کروز پر سیر وتفریح اور سالگرہ منانے کا یادگار واقعہ کچھ اس انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ قاری خود بھی اپنے آپ کو سیر میں شامل محسوس کرتا ہے۔

شاعری میں محسن نقوی، ڈاکٹر نزہت شاہ، مہندر پرتاپ چاند، تصور اقبال، نوید سروش، ساغر صدیقی کا کلام بہت خوب اور قابل تعریف ہے۔ اس کے علاوہ ایوب خاور نے مرحوم طارق عزیز کے بارے میں ایک انتہائی پُر اثر نظم لکھی ہے جسے پڑھ کر ان کے حوالہ سے ایک ذاتی اور یادگار واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ مرحوم ایک بہترین انسان تھے اور ٹی وی کی سکرین یا اسٹیج پر آتے ہی ''دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کو سلام پہنچے'' کے بعد تمام ناظرین کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں مرحوم ناظم جیوا نے مجھے میرے دو ساتھیوں سمیت کراچی ایک تقریب میں شرکت کے لیے مدعو کیا جس کے مہمان خصوصی صدرِ پاکستان تھے اور اس موقع پر خون کے ایک موروثی مرض تھیلاسیما کے ایک مرکز کا افتتاح کیا گیا جہاں اس مرض میں مبتلا بچوں کا بذریعہ انتقال خون (Blood Transfusion) علاج کیا جاتا تھا۔ ناظم جیوا جو کراچی سے تعلق رکھتے تھے اور ایک فلاحی تنظیم فاطمیہ فاؤنڈیشن کے روحِ رواں تھے نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا ہی ایک مرکز پشاور میں بھی قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے افتتاح کے

لیے انہوں نے بمبئی جا کر پشاور سے تعلق رکھنے والے معروف اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) اور سائرہ بانو کو دعوت دی ہے جو انہوں نے خوشی سے قبول کر لی ہے اور یہ کہ میں پشاور میڈیکل ایسوسی ایشن (PMA) کے جنرل سیکرٹری کے طور پر پشاور میں ان کے قیام اور تقریبات کا تسلی بخش انتظام کروں۔ واپسی پر ہم نے پریس اور دیگر تنظیموں کے ساتھ میٹنگز کیں اور تمام امور میں انہیں اعتماد میں لیا اور انہیں گورنر سرحد مرحوم فدا محمد خان کی نگرانی میں گورنر ہاؤس میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا۔ چند تقریبات اور ڈنرز کے علاوہ انہیں ان کے آبائی گھر بھی لے جایا گیا جہاں انہوں نے بچپن گزارا تھا۔ پرل کنٹیننٹل ہوٹل پشاور کے بڑے لان میں ایک بڑے عوامی شو کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے دیگر شہروں کے فنکاروں نے پرجوش شرکت فرمائی۔ اس موقع پر یہ مسئلہ درپیش تھا اسٹیج کے فرائض سنبھالنے کا دعوت کسے دی جائے اور ہم اس معاملہ پر بہت حساس تھے کہ کوئی ناپسندیدہ بات نہ ہو جائے۔ غور و خوض کے بعد طارق عزیز مرحوم کے نام پر اتفاق ہوا اور انہیں پشاور آنے کی دعوت دی گئی تاکہ وہ اس یادگار تقریب پر اسٹیج سنبھال سکیں۔ اتفاق سے پشاور اُن کے سسرال والوں کا بھی شہر ہے۔ چنانچہ وہ بخوشی تشریف لائے۔ تفصیل سے انتظامی امور پر بات ہوئی۔ دلیپ کمار اور سائرہ بانو کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تاکہ ناظرین انہیں مسلسل دیکھ سکیں۔ ایک موقع پر انہیں اچانک مجھے بمعہ میرے ایک اور ساتھی کے اسٹیج پر بلا لیا اور ناظرین کے بڑے ہجوم سے دلچسپ انداز میں تعارف کروایا۔ طارق عزیز اپنی شاندار آواز اور کمال فن میں یکتا تھے۔ عوامی شو انتہائی کامیاب رہا۔ اس سے پہلے جب یہ مہمان پشاور ایئرپورٹ سے کھلی کار میں بازاروں سے گزر کر اپنی قیام گاہ تک پہنچے تھے تو عوام کا ایک ہجوم ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ طارق عزیز مرحوم کے ساتھ ان دنوں کی ملاقاتوں اور لمبی گفتگو کی یادیں اب بھی ذہن میں موجود ہیں جو ایوب خاور صاحب نے ایک جذباتی اور پُراثر نظم لکھ کر تازہ کر دیں۔۔

''چشمِ تحیّر'' کے عنوان سے فاری شا نے انفارمیشن ٹیکنالوجی اور 5G کے حوالے سے ایک مفید اور معلوماتی مضمون لکھا ہے جو حیران کُن ہے۔ آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا لازم ٹھہرتا ہے کہ اس کٹھن ماحول میں آپ اپنے فرائض نبھانے میں پہلے سے بھی زیادہ مستعدی سے مگن ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

خداوند کریم آپ کو عمر خضر سے نوازے کہ چہارسو یونہی پھلتا پھولتا رہے (آمین)

صادقہ نواب سحر نمبر پڑھا اور خوب پڑھا۔ ان کی شخصیت اور کارہائے نمایاں اس قدر جاندار ہیں کہ حیرت زدہ رہ گیا۔ میں ان کی صلاحیتوں، جوش، ولولے اور ہمت پر انگشت بدنداں رہ گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کتنی صلاحیتوں سے نوازا اور انہوں نے کتنے بھرپور طریقے سے ان سے استفادہ کیا۔ نتیجتاً ان کے کارہائے نمایاں کا ایک عالم میں شہرہ ہے۔ بلاشبہ اردو ادب میں ان کا سورج ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ایسے لوگ یقیناً کمیاب ہیں جو نثر و نظم دونوں پر یکساں گرفت رکھتے ہوں۔

اکثر آپ کے مطالعے، ذہنی رسائی اور پہنچ پر ششدر رہ جاتا ہوں۔ آپ ہمیشہ ایک ماہر غوطہ خور کی طرح علم و ادب کے سمندر سے گوہر نایاب ڈھونڈ لاتے ہیں۔ آپ کے ترتیب کردہ ''براہِ راست'' میں تیکھے سوالات اور محترمہ صادقہ نواب سحر کے خوبصورت جوابات سے بے حد محظوظ ہوا۔ یہ خاصی عرق ریزی، نزاکت اور ہمت کا کام ہے اور آپ اس میں یکتا ہیں۔

افسانے کے حصے میں ''پردہ'' بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ چٹخارے دار زبان اور بیان کے ساتھ عمدہ افسانہ ہے۔ پر ''متاعِ چہارسوٗ'' میں ان کا نام طاہر اقبال اور افسانے کے شروع میں طاہرہ اقبال ہے۔ وہی ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا والی بات لگتی ہے۔ اب انہیں کیا سمجھا جائے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا افسانہ ''جوگن'' جذبات نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ میں کالج کے زمانے سے ہی ان کی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کا دلی طور پر معترف رہا ہوں۔ ویسے آپ کی عنایت ہے کہ میرے افسانے کو آپ کے موقر جریدے میں جگہ ملی ہے۔ فیروز میری ہمت بندھانے میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نصرت بخاری کا ''چندہ'' اور ارم نعیم کا افسانہ ''روحانی سکون'' بھی مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔

''شمع آبرو'' میں جناب ساغر صدیقی، عبداللہ جاوید، محمود شام اور مہندر پرتاپ چاند واقعتاً شمع کی آبرو ہیں۔ مزید شاہد صدیقی اور ڈاکٹر ریاض احمد کا کلام بھی خوب ہے۔ ''میزانِ عدل'' میں رئیس صدیقی اور نوید سروش کی غزلیات بھی دلپذیر ہیں۔

گو کہ ''رس رابطے'' کا دامن خاصا وسیع ہے پھر بھی طوالت کے خوف سے فرداً فرداً بہت سے نام نہیں گنوا سکا ہوں۔ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے اور انہیں یکجا کرنے میں آپ کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔

عبدالباری (کراچی)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

محترمہ صادقہ نواب سحر کی صلاحیت، ذہانت اور ''محنت'' حیران کن ہے۔ انہوں نے ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات تفصیلی پس منظر اور خوش دلی سے دیے ہیں۔ لطف آ گیا۔ اُن کی مختلف زبانوں میں تصانیف، اُن کا ناول ''کوئی کہانی سناؤ متاشا'' اور دیگر کتابوں کا ہندی، انگریزی زبان میں تراجم بڑی کامیابی ہے۔ اُن کی تحریریں اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی، مارواڑی، مراٹھی، تیلگو، کنڑ وغیرہ میں شائع ہو رہی ہیں۔ اگر ''چہارسوٗ'' کے ذریعے علم نہ ہوتا تو اس بات پر یقین بھی مشکل سے آتا۔ پھر شاعری کے میدان میں بھی خوب کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ آپ بھی کیا کیا جوہر نکال کر لاتے ہیں آپ کے لیے ہدیہ تحسین۔

محترمہ صادقہ نواب سحر کی تحریر کی خوبی سلاست، سادگی بیان اور

گہرائی ہے اُن کے لہجے میں اجنبیت نہیں ہے۔ محترمہ عطیہ سکندر علی نے اُن کا انتخابِ کلام بھی خوب کیا ہے۔ سادگی دیکھئے:

عشقِ نبوی ہے بسا اس جان میں
نعت کہتی ہوں نبی کی شان میں

جنونِ عشق کو کیوں رہ نما کی حاجت ہو
یہ بہتا پانی ہے خود راستہ بنا لے گا

اُن کی شخصیت، اسلوب اور فکر وفن پر پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر رضوانہ پروین، ایم مبین اور ارتضیٰ کریم کی تحریر اہم ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور شائستہ فاخری کی رائے بھی توجہ طلب ہے۔

طاہرہ اقبال ایک منفرد، معروف اور کامیاب ناول اور افسانہ نگار ہیں۔ ''چہارسو'' میں قرطاسِ اعزاز حاصل کر چکی ہیں اُن کا افسانہ ''پردہ'' اُن کے خاص اسلوب کا ترجمان ہے۔ فیروز عالم صاحب ایک صاحبِ مطالعہ قلم کار ہیں اُن کا افسانہ ''جوگن'' ماضی، انسانیت، دوستی اور عشق کی بہترین کہانی ہے۔ نصرت بخاری اور ڈاکٹر عبدالباری کے افسانے بھی متوجہ کرتے ہیں۔

محمود شام، نسیم سحر، اشرف جاوید، رئیس صدیقی، جنید آزر، سہیلہ انعام صدیقی، انجم جاوید کی غزلوں کے اشعار میں شائستگی، نیا پن اور پختگی ہے۔ شہناز قادری کی تحقیقی تحریر ''اردو میں لوک ادب'' معلوماتی اور دلچسپ ہے مگر لوگ شاعری کو مختصراً بیان کیا ہے۔

نظموں میں ''اے طارق عزیز'' ایوب خاور کی نظم تحسینی اور فکری نوعیت کی ہے۔ انجم جاوید اور سلیم انصاری کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ فاری شانے ''چشمِ تحیّر'' (تلخیص وترجمہ) کمال کا انتخاب کیا ہے۔ سب کے لیے مفید (آج کل ہر ہاتھ میں ہے) تحریر۔ بہت خوب۔ دیپک کنول نے اس شمارے میں دیوکارانی کی سوانحی تعارف، جستجو اور کامیابی کی داستان اپنے خاص رنگ میں پیش کی ہے۔ ''چہارسو'' میں اہلِ قلم احبا سے ملاقات (آدھی ہی سہی) کا ذریعہ ''رس رابطے'' ہے جیسے وجیہہ الوقار بڑی محنت اور محبت سے ترتیب دیتے ہیں۔ یوگیندر بہل تشنہ، فیصل عظیم اور مشتاق اعظمی کے خط تنقیدی بصیرت کے اشارے ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

اس بار تو چہارسو رنگوں بھرا تھا۔ نیا رنگ نئے انداز میں۔ نیا رنگ اچھا لگا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز صادقہ نواب سحر کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اردو ادب میں ایسا نام ہے جسے شاید ہی کوئی نہ جانتا ہو۔ خاص طور سے ہندوستان میں۔ ابھی حال ہی میں اُن کا نیا ناول ''راجدیو کی امرائی'' مکمل کیا ہے۔ ہر بار کی طرح براہِ راست میں آپ کے سوال بھی دلچسپ اور مختلف تھے اور صادقہ جی کے جواب بھی بہت معقول۔ اسلم نواب صاحب نے درست فرمایا کہ ''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں'' اللہ ان دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ صادقہ جی کے تخلیقی فن پر تبصروں کی ضخیم کتاب شائع ہوئی جو کافی چرچا میں رہی۔ ایک سنگ میل اور کامیابی کے ساتھ طے کرنے پر آپ کو بہت بہت مبارک۔

طاہرہ اقبال کا افسانہ ''پردہ'' ان کے خصوصی انداز میں نظر آیا۔ گاؤں کی زمین سے جڑا کردار، پس منظر اور ٹھیٹھ علاقائی زبان میں رنگا دلچسپ افسانہ۔ نعیمہ جعفری کا ''امربیل'' مختلف پھولوں کی آپس کی گفتگو پر مبنی اچھا افسانہ ہے۔ پہلی محبت کے شہر میں انسان تاعمر گرفتار رہتا ہے، اسی خیال کو لے کر فیروز عالم صاحب کی ''جوگن'' اور ڈاکٹر عبدالباری کی ''انا کی صلیب'' بھی پسند آئے۔ نصرت شمسی نے اولڈ ایج ہوم پر مختلف نظریہ پیش کیا ہے حالانکہ ذاتی طور پر میں ان سے متفق نہیں۔ ماں کی ممتا اپنی جگہ اور اُس کی خودداری یا سیلف ریسپکٹ اپنی جگہ۔ اگر اولڈ ایج ہوم نہ ہوتے تو کتنے بزرگ گھٹ گھٹ کر اپنی اولاد کے ہاتھوں ذلت سہہ کر مر جاتے۔ باقی افسانوں کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔

زہریلا انسان تو آخری مقام تک آ پہنچا۔ یہ پورا سفر دلچسپ اور تجسس بھرا رہا۔ سانپوں کی دنیا سے اچھا رابطہ رہا۔ تابش صاحب اس میں بھگوانوں کی جگہ بھگوان کر لیں۔ ترجمہ کی کہانی ''ماس'' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسان اپنا ہی گوشت کھا رہا ہے کتنی عجیب بات ہے۔ سنا ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے مگر یقین کرنا مشکل۔ چشمِ تحیّر میں فاری شانے 5G پر اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ عام لوگ اتنی تفصیل نہیں جانتے جو اس میں بتائی ہے۔

شاعری میں ابھی چند غزلیں اور نظموں کا ہی لطف لیا ہے باقی کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔ حالات دن بہ دن بہتر ہونے کی بجائے بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اللہ آپ کو صحت یاب رکھے اور مل کر سب دعا کرتے ہیں کہ پوری دنیا اس نامراد وبا سے چھٹکارا پالے۔ زندگی پھر معمول پر آجائے (آمین)

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نمبر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج کے ہولناک دور میں علم وادب سے جڑے رہنا اور اس قدر اعتبار کا حامل جریدہ نکالنا کارِ دشوار ہے جسے آپ نے عمدگی سے نبھایا ہے۔ بہت عمدہ بھرپور گوشہ ماشاءاللہ۔ مبارک ہو۔ نہایت معتبر لوگوں کا اعتراف حق پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اسلم نواب صاحب کے مضمون کا عنوان سب سے اچھا ہے۔

آخری تاثر یہی ہے حق بہ حقدار رسید۔

سلیم خان (ممبئی)

برادر مکرم گلزار جاوید، السلام علیکم!

میں آپ کا بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ چہارسو کے ہر شمارے کی pdf کاپی باقاعدہ کسوٹی جدید کے میل پر بھیج دیتے ہیں۔ ستمبر اکتوبر 2020 کا شمارہ بھی

لاجواب ہے۔بہت خوب شمارہ نکالا ہے بلکہ یوں کہیے صادقہ نواب سحر اور انکی تخلیقی کاوشوں کی افہام تفہیم کے لیے ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔۔بہت بہت مبارکباد۔

انور شمیم (بہار)

گلزار جاوید صاحب، السلام وعلیکم۔

چہارسو کا خصوصی شمارہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے نام دیکھا اور ساتھ میں کھپولی دیکھا تو ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ہم سب کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ چہارسو نے ڈاکٹر صاحبہ کے فن وشخصت پر شمارہ نکالا کیونکہ چہارسو پوری دنیا کا ایک بڑا جریدہ ہے جسے پورے یورپ میں لوگ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں آج تک ڈاکٹر صاحبہ سے نہیں ملا اب میں نے طے کرلیا ہے کہ جب بھی امریکہ سے پونا آؤنگا کھپولی جاکر ڈاکٹر صاحبہ کا دیدار ضرور کرونگا۔

اس رسالہ کی خوبیاں کوئی اشتہار نہیں، پڑھنا اور دوسرے کو بھیجنا آسان ، میں تو اکثر چہارسو کے شمارے اپنے ڈرائیو میں محفوظ رکھتا ہوں ۔سلمٰی صدیقی صاحبہ کے تاثرات پڑھے کیا وہ ابھی زندہ ہیں اللہ ان کو مزید حیات دے۔

زین العابدین خاں (کیلی فورنیا)

محترم ومکرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم!

آپ کی ادارت میں فضائے دنیا کو اردو زبان ادب کی رعنائی ودلکشی ،شیرینی وحلاوت، تاثیر وجاذبیت ،لطافت ونمکیت، شستگی وشائستگی، شوکت ومتانت اور تہذیب وتمدن سے آشنائی عطا کرنے والا مؤقر ادبی جریدہ 'چہارسُو' آپ کی عنایتِ خاص ومحبت سے بحمداللہ! باقاعدگی کے ساتھ ہمارے مشامِ جاں کو بھی معطر کرتے ہوئے علم ومعلومات میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔مقامِ مسرت یہ ہے کہ موجودہ وبائی صورتِ حال میں بھی آپ نے اِس کی اشاعت میں تعطل نہ آنے دیا اور جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے آن لائن ترسیل کا سلسلہ جاری رکھا جو اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے آپ کے مخلصانہ جذبے کا عکاس ہے۔آپ کی توجہ سے ہمارا کلام تو خیر سے 'چہارسُو' میں شائع ہوتا ہی رہتا ہے اور فون یا واٹس ایپ کے ذریعے ہم آپ کا فوری شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں جو بہ ہر طور آپ کی چاہتوں کا نعم البدل تو نہیں البتہ ہمارے لیے طمانیتِ قلبی کا باعث ضرور ہے۔اپنے کلام کی گاہے گاہے اشاعت کے لیے دل کی گہرائیوں سے بے حد شکریہ اور دنیا بھر کے نہایت قابلِ اِکرام معتبر ومستند ومقبول شعرا اور ادبا کے وقیع نثری وشعری سرمائے اور 'براہِ راست' کے عنوان سے اُن سے آپ کے دلچسپ مکالمے سے مزیّن 'چہارسُو' کی نفیس اشاعت پر آپ اور اِدارے سے منسلک تمام ارکان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک!

'براہِ راست' کے ذریعے ممتاز صاحبانِ قلم سے ملاقات اور اُن کی شخصیت وفن اور حالات وواقعات سے آگاہی یقیناً ایک تاریخی دستاویز ہے جو تحقیق کے شعبے میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے معاون ومددگار ہوگی۔

دعا ہے کہ اللہ کریم روئے زمین پر اپنی رحمتیں سایہ فگن فرمائے، ہم سب کو، پاکستان وتمام اہلِ پاکستان کو، عالمِ اسلام اور سارے انسانوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور جملہ معمولات ومعاملاتِ زندگی سمیت دینی وعلمی وادبی سرگرمیوں کو بھی بہ خیریت بحال کرے، امین!

اللہ کریم آپ کے حوصلے اور ہمت کو برقرار رکھے اور آپ صحت وعافیت وسلامتی کے ساتھ اِسی طرح اپنے افسانوں، تحریروں اور خوبصورت اردو زبان وادب کی جاں فزا مہک 'چہارسُو' بکھیرتے رہیں۔

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

تازہ چہارسو کا صادقہ نواب سحر نمبر دیکھ کر جی خوش ہوا۔چہارسو کی نمبر میں سنت ایکناتھ پر لکھا ڈاکٹر صادقہ سحر کا مضمون پڑھا۔ہندوستان میں سنتوں اور صوفیوں کی ایک عظیم روایت رہی ہے۔آگے چل کر اسی سرچشمہ سے گنگا جمنی تہذیب کے دھارے پھوٹے۔۔۔۔بھلا مہاراشٹر کی دھرتی اس اثر سے کیونکر محروم رہتی۔یہاں بھی بھکتی پریم اور روحانیت سے لبریز سنتوں کی بانی نے ایسا سماع باندھا کہ چاروں طرف لوگ بھکتی بھاؤ میں سرابور ہوکر گاتے بجاتے اپنے وٹھوبا کو یاد کرتے۔اور یہ سلسلہ آج تک یوں ہی رواں دواں ہے۔

سنت گیانیشور، تکارام، ایک ناتھ، گاڈگے مہاراج، جیسے سنتوں نے دھرم کو ذات پات جیسے تنگ دائروں سے آزاد کر معاشرہ میں بھائی چارہ اور ہم آہنگی کی الکھ جگائیں۔سنتوں کی بانی ہمارے لیے ایک بیش قیمتی اثاثہ ہے۔حاشیہ پر چھوٹ گئے ان سنتوں کو آپ نے یاد کیا ، اُنہیں اُردو والوں سے رو برو کروایا۔بس یوں سمجھئے ہم سب کی طرف سے آپ نے اپنی ماٹی کا قرض ادا کیا۔

بہت بہت مبارک باد۔

مختار خان (ممبئی)

محترم گلزار صاحب۔سلام عرض کرتا ہوں۔

صادقہ نواب سحر نمبر بڑے غور سے پڑھا۔آگے بڑھنے سے قبل مجھے یہ شکایت کر لینے دیجئے کہ انگلی پر تھوک لگا کر صفحہ پلٹنے کی نسلوں پرانی عادت کے تنگ کرنے کے باوجود محترمہ کی نگارشات نے مجھے جکڑے رکھا تھا۔یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ محترمہ زود نویس ہیں، نہ جانے کیوں کہتے ہیں۔لکھنے والے یا والی کی۔تحریر میں جان ہوگی تب ہی تو اسے قاری ملیں گے۔میرا خیال ہے کہ محترمہ کے اندر متعدد عینی آپائیں، عصمت آپائیں وغیرہ، وغیرہ چھپی بیٹھی ہیں۔وہ زیادہ لکھا رہی ہیں تو یہ ان کا حق ہے اور یہ اردو کی کامیابی ہے۔آپ، حضور والا بھی محترمہ جیسے ہیرے دریافت کرنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے تاکہ آپ اسی طرح اردو کی خدمت کرتے رہیں۔

ظفر قریشی (نیویارک)

..... مطالعاتِ حمد ونعت .....

''مطالعاتِ حمد ونعت'' کا مطالعہ اس ضمن میں واضح اشارہ کرتا ہے کہ نسیم سحر نے عقیدت میں کہی یا لکھی گئی کتب پر ناقدانہ رائے دیتے ہوئے تنقیص کی بجائے اچھے رویّوں، اچھے حوالوں اور اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ اچھی تراکیب کو سراہتے ہوئے اپنے قلم کے ذریعے دیباچوں، تبصروں اور مختصر حوالوں میں محفوظ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال اور تجزیہ ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام تر تبصرے، دیباچے، مضامین اور فلیپس روحانی اور ادبی ارتکاز کے سبب تحریر ہوئے ہیں اور پوری توانائی و رعنائی کی صورت میں اپنے قرینوں، سلیقوں اور فطری وجدان کے سبب صباحت اور حلاوت کے ساتھ شاعر، مصنف، قاری، تجزیہ نگار اور خود میر لیے بھی بخشش و عقیدت کا باعث بنتے ہوئے ادبِ عالیہ کا حصّہ بن چکے ہیں، کیونکہ نسیم سحر کی ان تجزیاتی تحریروں میں جداگانہ اسلوب کا ڈائقہ اور آنکھوں کے رستے دل میں اتر جانے کا روحانی کمال پوری طرح ضوفشاں ہے۔

ڈاکٹر فرحت عباس

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۴۰۰، دستیابی: فرید پبلی کیشنز، راولپنڈی۔

..... غزل کہانی .....

اس اہم مقدمہ کو رقم کرتے ہوئے اکرم کنجاہی کے جملے میں طویل مطالعے کی جان کاہی تو یقیناً آئی ہوگی لیکن دورانِ خواندگی اس ادبی دستاویز کے آخر تک کہیں کوئی لفظ تھکن کا ظہر اس لیے محسوس نہیں ہوا کہ شعر و ادب کے ساتھ مصنف کی ذوقی اور مزاجی ہم آہنگی مسلسل خضرِ راہ بنی رہی! یوں قاری کی دراک نگاہ گواہی دے گی کہ یہ مبسوط نگارش نصابی/ درسی نوع کی پیش کش ہونے سے عمداً گریزاں ہوتے ہوئے اپنے تخلیقی وصف کو برابر اُجاگر کرتی رہی ہے۔ خاص طور پر وہ روایتی مبحث جو غزل کی موضوعاتی تحدید پر منتج ہوا کرتا ہے وہاں اس ممتاز نقاد کا معروضی استدلال نئی فکری اطراف کا ہنرمندی سے ترجمان بنتا ہے۔ یہاں رک کر یہ عرض کرتا ہے کہ ''غزل اور تگنائے غزل'' میں مخفی تعریض نے بلاشبہ ایک اُپج کے لیے گنجائش پیدا کی تھی یوں استرداد کی فضا تشکیل پانے لگ لیکن پھر یکی مشاہدہ برہان بنا کہ کشادِ وسعت نے ممکنات سے معمور شعاعوں کو وقتوں وقفوں سے بہر حال نظارہ بنائے رکھا ہے۔ اس صورتِ حال میں دھیان کا واضح جھکاؤ خلّاقانہ خوبی کو اصولی تکریم دینے پر پابند ہوا ہے، یعنی امکان اپنی کرن کی توانائی کا مہبط قلب شاعر کو ٹھہراتی ہے، صنف کو نہیں۔۔۔ ہاں! جب یہ جوہر ظہور پذیری کے عنوان سے اس خاص صنف کو متمول کرتا ہے تو عام سوچ اسی کو اصل مخزن یقین کرنے لگتی ہے۔ اکرم کنجاہی نے ''غزل کہانی'' میں عملی تنقید کو تذکرہ نگاری کی کہنہ رسم سے بچایا ہے۔ انہوں نے عہد بہ عہد غزل کی مسافرت کو تجزیے کے سپرد کیا ہے۔ اس طرح Exaggeration نام شماری اور نمونہ کلام کے ''مقبول جادوں'' کو ترک کرتے ہوئے وہ ہر دور کے فکری و اسلوبیاتی رجحانات پر موکوز ہوئے ہیں۔ چودہ ابواب پر محیط اس وقیع کتاب نے ''ترتیل'' کی معنویت پہلی بار آشکار کی ہے کہ واقعتاً اب معلوم ہوا ہے ساری لذت تو جرعہ نوشی میں مضمر ہے! سو، قاری سے التماس ہے کہ ''غزل کہانی'' سے نظری خط کشید کرنا ہے تو اس سوقاً سبقاً پڑھیے گا!!

جمیل احمد عدیل

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۸۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔

..... فنون سہ ماہی .....

میرِ کارواں احمد ندیم قاسمی کے دستِ ہنر سے لگائی، ادبی شہر سہ ماہی فنون کا سالنامہ منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ حرفِ ثانی اور بین السطور کے عنوان سے نیّرِ حیات قاسمی کے نثری و نظمی رشحات قلم فکر انگیز بھی ہیں اور قلب آمیز بھی۔ حمدیہ کلام حیات نظامی، انیس انصاری اور امین راحت چغتائی کے علاوہ بہت اہم اور بلند قامت اہلِ قلم شاملِ اشاعت ہیں۔ احوالِ وطن میں کشمیر کے حوالے سے فیض صاحب، قاسمی صاحب اور فرح کامران کے علاوہ اعتبار کے حامل دیگر اہلِ قلم ہمرکاب ہیں۔ مضامین اور مقالات بھی وسعت کے حامل ہیں۔ یادداشیں، طویل اور مختصر نظمیں بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔ افسانے کے باب میں اہلِ قلم کی نامور کہکشاں ہارون الرشید، جلیل عالی اور ان گنت بلند قامت شعراء و شاعرات قلم کا جادو منوا رہے ہیں۔ فن اور فنکار، فنونِ لطیفہ، تراجم، انشائیے، اختلافات و تاثرات کی محفل سے اس خاص اشاعت کو بہت خاص بنا دیا ہے۔ پانچ سو چھپن صفحات پر مشتمل فنون کی یہ خاص اشاعت مبلغ -/650 روپے کے عوض 251۔ بلاک F-2، واپڈا ٹاؤن، لاہور سے بہ آسانی دستیاب ہے۔

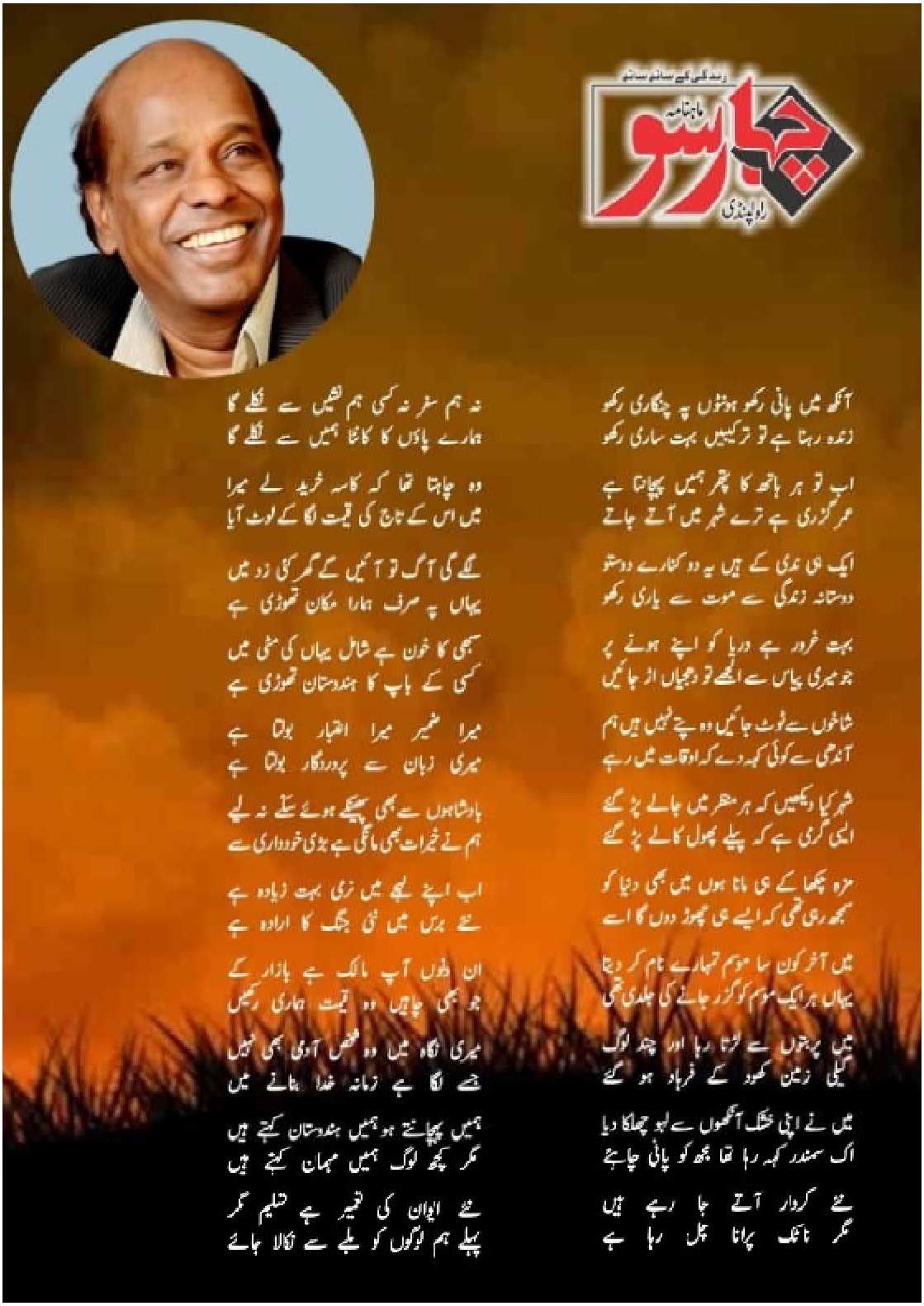

آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو

بہت غرور ہے دریا کو اپنے ہونے پر
جو میری پیاس سے الجھے تو دھجیاں اڑ جائیں

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

شہر کیا دیکھیں کہ ہر منظر میں جالے پڑ گئے
ایسی گرمی ہے کہ پیلے پھول کالے پڑ گئے

مزہ چکھا کے ہی مانا ہوں میں بھی دنیا کو
سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا اسے

میں آخر کون سا موسم تمہارے نام کر دیتا
یہاں ہر ایک موسم کو گزر جانے کی جلدی تھی

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

میں نے اپنی خشک آنکھوں سے لہو چھلکا دیا
اک سمندر کہہ رہا تھا مجھ کو پانی چاہیے

نئے کردار آتے جا رہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

میرا ضمیر میرا اعتبار ہوتا ہے
میری زبان سے پروردگار بولتا ہے

بادشاہوں سے بھی پھینکے ہوئے سکے نہ لیے
ہم نے خیرات بھی مانگی ہے بڑی خودداری سے

اب اپنے لہجے میں نرمی بہت زیادہ ہے
نئے برس میں نئی جنگ کا ارادہ ہے

ان دنوں آپ مالک ہے بازار کے
جو بھی چاہیں وہ قیمت ہماری رکھیں

میری نگاہ میں وہ شخص آدمی بھی نہیں
جسے لگا ہے زمانہ خدا بنانے میں

ہمیں پہچانتے ہو ہمیں ہندوستان کہتے ہیں
مگر کچھ لوگ ہمیں مہمان کہتے ہیں

نئے ایوان کی تعمیر ہے تسلیم مگر
پہلے ہم لوگوں کو ملبے سے نکالا جائے